معراجِ مصطفیٰ

علیہ التحیۃ والثناء

مصنف

امام محمد بن یوسف الصالحی الشامی رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر ذوالفقار علی ساقی

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف

زاویہ پبلشرز

زاویہ پبلشرز

دربار مارکیٹ، لاہور

معراجِ مصطفیٰ ﷺ

علیہ التحیۃ والثناء

مصنف:
حضرت امام محمد بن یوسف الصالحی الشامی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ: پروفیسر ذوالفقار علی ساقی
دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف

زاویہ پبلشرز
8-C دربار مارکیٹ - لاہور
voice: 042-37300642 - 042-37112954
Email:zaviapublishers@gmail.com
Website: www.zaviapublishers.com

2016ء

بار اول.................. 1000

ہدیہ.................. 300

ناشر.................. نجابت علی تارڑ

{لیگل ایڈوائزرز}

محمد کامران حسن بھٹہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ (لاہور) 0300-8800339

{ملنے کے پتے}

زاویہ پبلشرز
شوروم
ظہور ہوٹل دکان نمبر 2
دربار مارکیٹ - لاہور
voice: 042-37300642 - 042-37112954
Email:zaviapublishers@gmail.com
Website: www.zaviapublishers.com

صبحِ نور پبلی کیشنز غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور	0423-7350476
مکتبہ غوثیہ ہول سیل، پرانی سبزی منڈی، کراچی	021-34926110
مکتبہ برکات المدینہ، کراچی	021-34219324
مکتبہ دار القرآن، النساء روڈ، چشتیاں	0300-7548819
احمد بک کارپوریشن، کمیٹی چوک، راولپنڈی	051-5558320
اسلامک بک کارپوریشن، کمیٹی چوک، راولپنڈی	051-5536111
مکتبہ قاسمیہ برکاتیہ، حیدرآباد	022-2780547
مکتبہ مہتینویہ، پرانی سبزی منڈی روڈ، بہاول پور	0301-7728754
نورانی ورائٹی ہاؤس، بلاک نمبر 4، ڈیرہ غازی خان	0321-7387299
مکتبہ بابا فرید چوک چٹی قبر پاکپتن شریف	0301-7241723
مکتبہ غوثیہ عطاریہ اوکاڑہ	0321-7083119
مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد	041-2631204
مکتبہ العطاریہ لنک روڈ صادق آباد	0333-7413467
مکتبہ باب الاسلام، فیضانِ مدینہ، حیدرآباد	0313-4812626
مکتبہ حسان اینڈ پرفیومرز پرانی سبزی منڈی کراچی	0331-2476512
رضا بک شاپ، میلاد فوارہ چوک، گجرات	0300-6203667
مکتبہ فریدیہ، ھائی سٹریٹ ساہیوال	040-4226812

انتساب

سید المرسلین، امام النبیین، رحمۃ للعالمین، حضور اکرم
شفیع معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ بیت عظام رضی اللہ عنہم

اور

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کے نام

شاہاں راچہ عجب اگر نوازند بگدارا

ذوالفقار علی ساقی

فہرست

❁❁❁

مؤلف کے حالاتِ زندگی

حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کا لقب شمس الدین، کنیت ابوعبداللہ اور اسم گرامی محمد بن یوسف الصالحی الشامی ہے۔ امام شعرانی نے اپنی تصنیف لطیف ''الطبقات'' میں لکھا ہے:

''وہ ایک متقی اور پاکباز عالم دین تھے۔ وہ علوم کے بحر ذخار تھے۔ انہوں نے ''السیرۃ النبویۃ'' کتاب کو ایک ہزار کتب سے تالیف کیا۔ لوگوں نے اس کی کتابت کی طرف خصوصی توجہ کی۔ انہوں نے اس کتاب میں ایسا طریقہ اختیار کیا جو پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔ انہوں نے شادی نہ کی تھی۔ اگر کوئی مہمان آجاتا تو وہ خود ہی اس کی خدمت پر کمربستہ ہو جاتے تھے۔ انتہائی شیریں گفتار تھے۔ بہت زیادہ روزے رکھتے تھے۔ رات بھر قیام فرماتے۔ میں نے ان کے ہاں کئی راتیں گزاریں۔ میں نے دیکھا کہ وہ رات کے وقت بہت ہی کم سوتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی عالم دین وصال کر جاتا۔ جس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے تو یہ قاضی کے پاس جاتے۔ اپنے وظائف میں سے اس کے یتیم بچوں کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر کرتے حتیٰ کہ وہ بچے جوان ہو جاتے۔ وہ حکومتی ملازمین سے کچھ بھی قبول نہ کرتے تھے اور نہ ہی ان کا کھانا کھاتے تھے۔''

حضرت العلام بہت بڑے محدث اور تاریخ کے جید عالم تھے۔ دمشق کے ایک قصبہ ''صالحیہ'' میں ولادت ہوئی اور تادم وصال قاہرہ کے صحرا ''برقوقیہ'' میں رہے۔ انہوں نے درج ذیل کتب رقم فرمائیں:

1. الآیات الباھرۃ فی معراج سید اھل الدنیا والآخرۃ
2. الاتحاف بتمیز ما تبع فیہ البیضاوی صاحب الکشاف

- ۳ اتحاف الراغب الولی فی ترجمۃ الاوزاعی
- ۴ اتحاف الاریب بخلاصۃ الاعاریب
- ۵ تفضیل الاستفادۃ من بیان حکمتی الشھادۃ
- ۶ الجامع الوجیز الخادم للغات القرآن العزیز
- ۷ الجواھر النفائس فی تجیر کتاب العرائس
- ۸ رفع القدر و مجمع الفتوۃ فی شرح الصدر و خاتم النبوۃ
- ۹ سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد
- ۱۰ شرح الاجرومیۃ
- ۱۱ عقود الجمان فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان
- ۱۲ عین الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ
- ۱۳ الفتح الرحمانی فی شرح ابیات الجرجانی فی الکلام
- ۱۴ کشف اللبس فی رد الشمس
- ۱۵ مختصر المسمّٰی بالآیات البینات
- ۱۶ مرشد السالک الی الفیۃ ابن مالک
- ۱۷ النکت علی الالفیۃ
- ۱۸ النکت المھمات من الکلام علی الابناء والبنین والبنات
- ۱۹ وجوب فتح ھمزۃ "اِن" و کسرھا و جواز الامرین

حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے ۹۴۲ھ میں وصال فرمایا۔ رب تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے۔ آمین ثم آمین

ذوالفقار علی ساقی

بھیرہ شریف

معراجِ مصطفیٰ

علیہ التحیۃ والثناء

اس موضوع پر میں نے ایک عظیم تصنیف رقم کی ہے۔ میں نے اس کا نام "الآیات البینات فی معراج سید اھل الارض والسماوات" رکھا۔ پھر میں ایسے امور پر آگاہ ہوا جن کا تذکرہ میں نے اس کتاب میں نہیں کیا تھا۔ پھر میں نے اس موضوع پر دوسری کتاب لکھ دی۔ میں نے اس کا نام "الفضل الفائق فی معراج خیر الخلائق" رکھا۔ میں نے ان کتب میں ایسے فوائد اور نفائس لکھے ہیں جو صرف ان کا ہی حصہ ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا خلاصہ ذکر کر دوں۔

❀❀❀❀

رب تعالیٰ کے اس فرمان عالی شان کے بعض فوائد

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ① (الاسراء:۱)

ترجمہ: ’’ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک بابرکت بنا دیا ہم نے جس کے گرد و نواح کو تا کہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں بیشک وہی ہے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا۔‘‘

اس آیت طیبہ پر کئی اعتبار سے بحث

1-اس کا شانِ نزول

امام، عالم حضرت ابو حیان علیہ الرحمۃ نے اپنی تفسیر ’’البحر‘‘ میں تحریر کیا ہے کہ اس آیتِ طیبہ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے معراج کا تذکرہ فرمایا تو کفار مکہ نے آپ ﷺ کی تکذیب کی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل کی۔

ما قبل کے ساتھ تعلق

امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ اور امام برہان النسفی نے لکھا ہے ’’ما قبل کلام کے ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ اس سورت میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا ذکر خیر ہے۔ ان کے مبارک اوصاف، اور حریم ناز میں ان کے مقام کا تذکرہ ہے۔ ملتِ حنفیہ کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عقائد دینیہ میں ان کی اقتداء کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سورت مبارکہ میں

ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے سچے دل کے ساتھ ان کی ملت کی اقتداء کی۔حق پر ان کی سنت کو قائم کیا۔اس سورت مبارکہ کے اختتام پر ہمارے نبی کریم ﷺ کو یہ حکم دیا گیا۔

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ۔ (النحل:۱۲۵)

ترجمہ:''(اے محبوب!) بلائیے لوگوں کو اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے۔''

بعد میں آپ ﷺ کو صبر کرنے کا حکم دیا گیا۔ارشاد فرمایا:

وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِیۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ۝۱۲۷ (النحل:۱۲۷)

ترجمہ:''اور آپ صبر فرمائیے اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور رنجیدہ نہ ہوا کریں ان کی (ہٹ دھرمی) پر اور نہ غمزدہ ہوا کریں ان کی فریب کاریوں سے۔''

صبر ناپسندیدہ امور کو برداشت کرنا ہی ہے۔یہ تحمل، تجمل (خوبصورتی) کی طرف لے جاتا ہے۔
"البحر" میں ہے۔''جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صبر کا حکم دیا اور کفار پر غمزدہ ہونے سے منع فرمایا نیز منع فرمایا کہ آپ ﷺ ان کے مکروفریب سے تنگدل نہ ہوں۔ان کا مکر یہ تھا کہ انہوں نے جھوٹ، سحر اور شعر وغیرہ کو آپ ﷺ کی طرف منسوب کیا تھا۔اس کے بعد رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کا شرف، فضل اور آپ ﷺ کا بلند مقام بیان فرمایا جو آپ ﷺ کو رب تعالیٰ کے ہاں حاصل ہے۔''

شیخ نے''مناسبات'' میں ذکر کیا ہے''یہ سورت مبارکہ اور اس کے بعد کی چار سورتوں کا نزول قدیم ہے۔امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔انہوں نے فرمایا:''سورت بنواسرائیل، الکہف، مریم، طٰہٰ اور الانبیاء کا نزول پہلے ہے۔ اور انہیں ابتدائے اسلام میں یاد کرلیا گیا تھا۔'' یہی ان کی ترتیب کی وجہ ہے۔یہ سورت بھی ان کے قدیمی نزول میں مشترک ہے۔یہ سورتیں مکی ہیں۔یہ ساری قصص پر مشتمل ہیں۔
میرے لیے اس کا سورت النحل کے ساتھ اتصال میں ایک اور سبب بھی ظاہر ہوا۔وہ یہ

ہے کہ رب تعالیٰ نے اس سورت کے اختتام میں فرمایا:

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ؕ (النحل: ۱۲۴)

ترجمہ: ''صرف ان لوگوں پر سنیچر کی پابندی تھی جنہوں نے اختلاف کیا تھا۔''

اس سورت مبارکہ میں اہلِ سبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس تورات کا ذکر جمیل ہے جو انہیں دی گئی۔ جیسے کہ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''تورات ساری کی ساری سورت بنواسرائیل کی پندرہ آیات پر مشتمل تھی۔'' رب تعالیٰ نے ان کی نافرمانیاں، فساد، مساجد کو برباد کرنے کا ذکر کیا۔ پھر رب تعالیٰ نے ذکر کیا کہ انہوں نے کس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے باہر نکالنے کی سعی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روح کے بارے سوال کیا۔ پھر اس سورت کا اختتام حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے نو معجزات پر کیا۔ فرعون کو ان کے خطاب سے آگاہ کیا۔ بتایا کہ فرعون نے حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو نقصان دینے کی کوشش کی تو اسے برباد کر دیا گیا۔ اس کے بعد بنواسرائیل کو ان کی زمین کا وارث بنا دیا گیا۔ اس میں مدینہ طیبہ کے یہودیوں کی طرف اشارہ تھا کہ جس طرح انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ عنقریب خود ہی یہاں سے جلاوطن ہو جائیں گے۔ آپ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس شہر خوباں کے مالک بن جائیں گے۔ یہ اس طرح ہے جس طرح فرعون برباد ہوا تھا جب اس نے بنواسرائیل کو نقصان دینے کی کوشش کی تھی۔ اس سورت میں مسجد اقصیٰ کے گرنے کا تذکرہ ہے۔ اس کا آغاز سیدنا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراجِ پاک سے کیا گیا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں تشریف لے گئے تھے۔''

تسبیح سے آغاز کرنے میں حکمت

ابن جوزی نے زاد المسیر میں لکھا ہے ''اس جگہ تسبیح سے آغاز کرنے میں دو حکمتیں ہیں۔

1. اہلِ عرب کا معمول تھا کہ وہ عجیب امر کے وقت تسبیح کیا کرتے تھے۔ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج کرا کے مخلوق کو تعجب میں ڈال دیا۔

◆ گویا کہ اسے ان کے رد کے قائم مقام رکھا۔ کیونکہ جب حضور ﷺ نے اپنی معراج کا ذکر فرمایا تو کفار مکہ نے آپ ﷺ کی تکذیب کی۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ اس امر سے منزہ اور پاک ہے کہ وہ جھوٹے کو اپنا رسول بنائے۔

قاضی تاج الدین سبکی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں لکھا ہے کہ امام سے سوال کیا گیا کہ اس سورت پاک کا آغاز تسبیح سے کیوں کیا گیا ہے جبکہ سورۃ الکہف کا آغاز تحمید سے کیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''جہاں کہیں بھی ان دونوں کا تذکرہ ہوا ہے تسبیح کو تحمید سے مقدم کیا گیا ہے۔ مثلاً

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ۔ (النصر: ۳)

ترجمہ: ''تو اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کیجیے۔''

سبحان اللہ والحمد للہ۔

ابن زملکانی نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ سورت معراج پاک پر مشتمل ہے۔ مشرکین نے آپ ﷺ کی تکذیب کی۔ آپ ﷺ کی تکذیب گویا کہ رب تعالیٰ کی تکذیب ہے۔ اس کا آغاز سبحان سے کیا گیا کہ رب تعالیٰ اس امر سے پاک اور مطہر ہے کہ جھوٹ کو اس کی طرف منسوب کیا جائے۔ جبکہ سورۃ الکہف مشرکین کے اصحاب کہف کے بارے سوال کے بعد میں نازل ہوئی۔ وحی میں بھی تاخیر ہوئی۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ رب تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ اور اہلِ ایمان پر اپنی نعمتوں کو منقطع نہیں فرمائے گا۔ بلکہ کتاب حکیم کو نازل کر کے ان پر اپنی نعمت کو مکمل کرے گا۔ لہٰذا اس نعمت پر شکر ادا کرنے کے لیے اس کا آغاز حمد سے کیا گیا۔

سبحان اللہ کے بارے گفتگو

حضرت محمود الکرمانی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب ''برہان'' میں لکھا ہے۔ ''اس کلمہ کو اللہ رب العزت نے اپنی ذاتِ والا کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ سورت بنی اسرائیل کی ابتداء اس کے مصدر، سورۃ الصف کی ابتداء اور سورۃ الحشر کی ابتداء اس کی ماضی اور سورۃ الجمعۃ اور سورۃ التغابن کی ابتداء اس کے مضارع سے کی۔ سورۃ الاعلیٰ کی ابتداء اس کے امر سے کی تاکہ

اس مبارک کلمہ کی ساری صورتیں استعمال ہو سکیں۔ امام حاکم نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے "سبحان اللہ" کے معنی کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہر برائی سے رب تعالیٰ کی تنزیہ"

ابن ابی حاتم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: "سبحان اللہ اسم ہے جس کے ساتھ رب تعالیٰ اپنی تعظیم بیان فرماتا ہے۔ اس کلمہ سے ہر برائی سے کنارہ کش ہوتا ہے۔" امام ماوردی نے لکھا ہے "یہ ایسا ذکر ہے جس کے ساتھ رب تعالیٰ اپنی تعظیم بیان فرماتا ہے۔ یہ کلمہ صرف اسی کے لیے موزوں ہے۔" صاحب النظم نے لکھا ہے کہ لغت میں السبح تباعد کو کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (المزمل: ۷)

ترجمہ: "یقیناً آپ کو دن میں بڑی مصروفیتیں ہیں۔"

سبحان اللہ کا معنی ہے کہ رب تعالیٰ ہر اس امر سے پاک ہے جو اس کے مناسب نہیں ہے۔ التسبیح کے اور معانی بھی ہیں جنہیں میں نے "القول الجامع الوجیز لخادم للقرآن العزیز" میں بیان کیا ہے۔

امام موفق الدین نے شرح المفصل میں لکھا ہے "جان لو کہ علماء کرام نے اعلام کو معانی پر معلق کیا ہے۔ انہوں نے ان کا اطلاقِ اعیان پر کیا ہے۔ اس میں سے اہلِ عرب کا قول "سبحان" بھی ہے۔ یہ ہمارے نزدیک علَم ہے جو تسبیح کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ مصدر ہے۔ اس کا معنی برأت اور تنزیہ ہے۔ اس سے فعل نہیں ہے۔ یہ اس تسبیح پر دلالت کرتا ہے جو حقیقت میں مصدر ہے۔ اس معنی پر اسے علَم بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس کی معرفت ہے۔ یہ معرفہ اور الف نون کی زیادتی کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ شاعر کے اس قول "سبحانه ثم سبحاناً يعود له" میں تنوین کی دو وجوہات لکھی گئی ہیں:

1. یہ ضرورت کے لیے ہے۔
2. اس نے تصور کا ارادہ کیا ہے۔

ضیاء بن العلج نے البسیط میں لکھا ہے کہ یہ سبّح کا مصدر ہے۔ جب انسان سبحان اللہ کہتا

ہے یہ سبحان التنزیہ کا مدلول ہے لفظ کا نہیں۔ ہم کہتے ہیں "تسبیح تنزیہ کے معنی میں بھی ہے کیونکہ سَبَّحْتُ کا معنی ہے میں نے رب تعالیٰ کی تنزیہ بیان کی۔ اس وقت تنزیہ کے معنی پر ان کی مطابقت قائم ہوگئی۔ سبحان کو تسبیح پر معلق کرنا درست ہوگیا۔ بطور علم اس کا استعمال بہت قلیل ہے۔

یہ اکثر اپنے فاعل یا مفعول کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ مضاف ہوتا ہے تو یہ علَم نہیں ہوتا کیونکہ اعلام مضاف نہیں ہوتے۔ شعر میں "سبحان" کے مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جس کے لیے وہ علم ہے۔ وہ خود علم نہیں ہے۔

ابن عمرو بن حاجب نے لکھا ہے کہ شاعر کا یہ شعر اس بات کی دلیل ہے کہ سبحان تسبیح کا علم ہے۔

قد قلت لمّا جاءنی فخرہ

سبحان من علقمة الفاخر

اگر یہ علَم نہ ہوتا تو اسے منصرف کرنا ضروری ہوتا۔ کیونکہ الف اور نون علمیت کے ساتھ غیر منصرف ہوتا ہے۔ الشہاب السمین نے اپنی کتاب الاعراب میں لکھا ہے "ایک قول یہ ہے کہ یہ مصدر ہے کیونکہ اس کا ثلاثی فعل سنا گیا ہے۔ یہ ایسے اسماء میں سے ہے جو مضاف ہو سکتے ہیں۔ یہ مفرد بھی ہو سکتا ہے۔ جب یہ مفرد ہو تو یہ معرفہ ہونے اور الف نون کی وجہ سے غیر منصرف ہوتا ہے۔ جیسے کہ سابقہ شعر سے عیاں ہے۔ جیسے شاعر کا شعر ہے:

سبحانه ثم سبحانا يعود له

و قبلنا سبّح الجودی والجمد

ایک قول یہ ہے کہ ضرورت کی وجہ سے اس طرح کیا گیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبل اور بعد کے قائم مقام ہے۔ اگر اس کے معرفہ ہونے کی نیت کی جائے تو یہ اپنی حالت پر برقرار رہے گا۔ اگر اسے نکرہ سمجھا جائے تو اسے منصرف کا اعراب دیا جائے گا۔ یہ شعر اس امر کی مدد کرتا ہے کہ وہ مصدر ہو، مصدر کا اسم نہ ہو۔ کیونکہ یہ منصرف وارد ہوا ہے۔ پہلے قول کو اپنانے والے سے کہا جائے گا کہ اس کی طرف سے جواب دیا جائے گا کہ یہ نکرہ ہے معرفہ نہیں ہے۔ یہ ان اسماء میں سے ہے جو مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہوتے ہیں۔ یہ غیر منصرف ہے۔ یہ اس مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کا اظہار جائز نہیں۔"

حضرت ابوشامہ نے لکھا ہے" جب یہ منصوب ہو تو اس مفعول مطلق کی وجہ سے منصوب ہوگا جس کے فعل کا اضمار لازم ہوتا ہے۔ اس کا فعل یا تو فعل امر ہے یا خبر ہے اس سورت میں یہ لفظ دو امور کا احتمال رکھتا ہے یعنی یا تو سبحّوا الذی اسریٰ یا سبح الذی اسری کے معنی میں ہے۔ یعنی رب تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے آپ کی تعریف کی جیسے رب تعالیٰ نے فرمایا:"الحمد للہ رب العالمین"

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ سیبویہ کے مذہب کے مطابق اس میں عامل وہ فعل ہے جو اس کے معنی میں ہے لفظ میں نہیں۔ کیونکہ اس کے لفظ سے فعل نہیں آتا۔ یہ "قعدا القرفصاء و استمل الصماء" کی مثل ہے یہ عبارت یوں ہے۔ "انزہ اللہ تعالیٰ تنزیھا" تیسرے قول کے مطابق یہ "تنزیھا" کے قائم مقام ہوگیا۔

علامہ زمخشری نے لکھا ہے "سبحان" تسبیح کے لیے عَلَم ہے۔ جیسے عثمان انسان کا نام ہوتا ہے۔ یہ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے جو مقدر ہوتا ہے۔ اسے ظاہر کرنا متروک ہے۔ یہ عبارت دراصل یوں تھی:"اسبح اللہ سبحان۔" پھر اسے فعل کے قائم مقام کر دیا گیا۔ یہ اس تنزیہ پر دلالت کرتا ہے جو ان تمام قبائح سے پاکیزگی بیان کرے جنہیں رب تعالیٰ کے دشمن اللہ رب العزت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

امام طیبی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے" اس ترکیب سے یہ مصدر لانے کا مقصد تاکید ہے۔ یہ عبارت دراصل یوں تھی اسبح تسبیحا و اسبّح سبحان۔ پھر عامل کو حذف کر دیا گیا اور اس کو اس کے مقام پر رکھ دیا گیا تا کہ اس امر پر دلالت ہو کہ ذات سے مقصود مصدر ہے اور فعل تابع ہے۔ یہ تنزیہ کے وجود کی سرعت کے بارے خبر دینے کے بارے بتانے کا فائدہ دیتا ہے۔

امام کسائی نے لکھا ہے کہ یہ دراصل منادی ہے۔ اصل عبارت یوں تھی:"یا سبحانک" مگر جمہور نے ان کے اس قول کا انکار کیا ہے۔ اسفاقسی اور السمین نے لکھا ہے کہ کسائی کا یہ قول مردود ہے۔ کیونکہ اس پر حرف نداء کے دخول کے بارے نہیں سنا گیا۔ بعض علماء نے گمان کیا ہے کہ اس کا لفظ تثنیہ کا لفظ ہے اور اس کا معنی بھی اسی طرح ہے۔ جیسے لبیک مگر یہ

مؤقف غریب ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ اس کا مفرد سُبْحًا ہو اور یہ منصوب نہ ہو بلکہ مرفوع ہو۔ اس کی نون اضافت سے ساقط نہ ہو اور اس پر فتح لازم ہوتا ہے۔

عجیب وغریب بات وہ ہے جسے امام ماوردی نے لکھا ہے کہ ابان بن تغلب نے لکھا ہے کہ سبحان کلمہ دراصل حبشی زبان کا کلمہ ہے۔ یعنی اس کی اصل شبہانك۔ اس کو معرب بنا کر سبحانك بنا دیا گیا۔ جسے سبحان کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔ وہ اس کا مفعول بہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی تسبیح بیان کی جاتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فاعل ہو۔ اس کا یہ معنی ہو کہ وہ ذات پاکیزگی بیان کرتی ہے جس نے اپنے بندۂ خاص (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو سیر کرائی۔

اسریٰ پر بحث

نسفی کی البرہان میں ہے کہ اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ اسریٰ اور سریٰ دو لغتیں ہیں۔ بعض نے اسے رات کے وقت چلنے کو اس کے ساتھ مختص کیا ہے۔ السمین نے لکھا ہے کہ سَریٰ اور اَسریٰ سقی اور اسقی کی طرح ہے۔ اس جگہ ہمزہ تعدیہ کے لیے نہیں ہے۔ لیکن ابن عطیہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ یہ بعبدہٖ کی باء سے متعدی ہے۔ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے کہ جمہور کے نزدیک یہ فاعل کے مفعول کے ساتھ مصاحبت کا تقاضا نہیں کرتا۔ لیکن المبرد کا اس سے اختلاف ہے۔

اسفاقسی نے لکھا ہے کہ باء تعدیہ کے لیے ہے۔ جمہور کے نزدیک ہمزہ اس کے مترادف ہے۔ لیکن مبرد اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ امام سہیلی نے لکھا ہے کہ باء کے ساتھ تعدیہ فاعل کی مفعول کے ساتھ مصاحبت کا تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً تم یہ کہو: قعدت بہٖ۔ تو اس کے ساتھ مشارکت ضروری ہے۔ خواہ وہ مشارکت ہاتھ کے ساتھ ہی ہو۔ مگر اس آیت طیبہ سے ان کا رد کر دیا گیا ہے۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ۔ (البقرہ:۱۷)

ترجمہ: "لے گیا اللہ ان کا نور"

کیونکہ رب تعالیٰ کا یہ وصف بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نور کے ساتھ چلا گیا۔ لیکن شاعر کا یہ شعر

ان دونوں کا رد کرتا ہے:

دیار التی کانت و نحن علی منی
تحل بنا لو لا نجاء الرکائب

تحل بنا، تحلنا کے معنی میں ہے۔ اس جگہ باء تعدیہ کے لیے ہے۔ مگر یہ مشارکت کا تقاضا نہیں کرتی۔ کیونکہ دیار حرام نہیں تھے کہ وہ حلال ہو گئے ہیں۔ کیونکہ باء ہمزہ کے معنی میں ہے۔ ان دونوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ یوں نہیں کہا جا سکتا: اذھبت بزید۔

ابن دحیہ اور ابن منیر نے مبرد کے قول کی تائید کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اسری بعبدہٖ سے وہ امور حاصل ہوتے ہیں جو اس طرح کہنے سے حاصل نہیں ہوتے بعث الی عبدہٖ کیونکہ باء مصاحبت کا فائدہ دیتی ہے۔ یعنی ذات خداوی الطاف کریمانہ، عنایت ربانیہ اور مدد کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ تھی۔ ابن دحیہ نے لکھا ہے "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا بھی اس امر کی گواہی دیتی ہے۔ "اللھم انت الصاحب فی السفر" مولا! سفر میں تو ہی ساتھی ہے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ جس نے کہا "مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لیے لازم ہے کہ میں فلاں کے ساتھ حج کروں گا تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس کے ساتھ حج کرے۔ لیکن اگر اس نے کہا "للہ علی ان احج فلانا" تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ اپنے مال سے اس کے سفر حج کی مدد کرے۔ اس میں فرق یہ ہے کہ باء مصاحبت کا فائدہ دیتی ہے۔ اس کا رد پہلے گزر چکا ہے۔

حافظ نے لکھا ہے کہ اسریٰ السُّری سے ماخوذ ہے۔ اس سے مراد رات کے وقت چلنا ہے۔ اہلِ عرب رات کے وقت چلنے کو اسریٰ اور سریٰ کہتے ہیں۔ یہ اکثر اہلِ عرب کا قول ہے لیکن الحوفی نے لکھا ہے کہ اسریٰ رات کے وقت چلنے کو جبکہ سریٰ دن کے وقت چلنے کو کہا جاتا ہے۔"

حافظ نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ اسریٰ رات کے اول حصہ میں اور سریٰ رات کے آخری حصہ میں چلنے کو کہتے ہیں۔

یہ معنی اقرب ہے قراء نے اسریٰ میں اختلاف نہیں کیا جبکہ رب تعالیٰ نے اس فرمان:
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ۔ (ھود: ۸۱)

ترجمہ: ''پس آپ لے کر نکل جائیے اپنے اہل وعیال کو۔''

اسے ہمزہ وصلی اور قطعی کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اس میں اس شخص کی گرفت ہے جو یہ کہتا ہے کہ اسریٰ اور سریٰ ایک ہی معنی میں ہیں۔ امام سہیلی نے لکھا ہے کہ السُّریٰ سریت سے مشتق ہے۔ جب میں رات کے وقت چلوں۔ یہ لازم ہے۔ جبکہ الاسراء معنی میں متعدی ہے لیکن اس کے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ گمان کرنے والے نے گمان کیا کہ یہ ایک ہی معنی میں ہے۔ اسری بعبدہٖ کا معنی ہے۔ کہ اس ذات نے براق بھیجا جو آپ کو سیر کے لیے لایا۔ جیسے کہ تم کہو امضیتُ یہ جعلته یمضی کے معنی میں ہے۔ مفعول کو حذف کر دیا گیا کیونکہ اس پر دلالت قوی ہے۔ یہ ذکر کرنے سے مستغنی ہے۔ کیونکہ ذکر سے مقصود حضور ﷺ کی ذات ہے۔ وہ سواری نہیں جو آپ ﷺ کو لے کر گئی تھی۔ جبکہ حضرت لوط علیہ السلام کی داستان کا معنی ہے کہ یہ جس بھی سواری پر سوار ہوں۔ انہیں اسی پر اپنے ساتھ لے چلیں۔ یہ معنی اس وقت ہوگا جب ہمزہ قطعی پڑھا جائے۔ جب ہمزہ وصلی ہو تو اس کا معنی ہے کہ رات کے وقت انہیں لے کر چلیں۔ اسراء میں تو اس طرح نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس طرح کہنا کسی اعتبار سے بھی درست نہیں۔ ''سریٰ بعبدہٖ''

حافظ اور نسفی نے لکھا ہے کہ جو بات یقین سے کہی جا سکتی ہے وہ اس حیثیت سے ہے جس میں اشارہ عاجز آجاتا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے رات کے وقت سفر براق پر کیا تھا۔ اگر آج کوئی یوں کہے ''سرت بزید'' اور وہ مصاحبت کا معنی لے تو اس کا یہ معنی صحیح ہوگا۔

العبد پر کلام

مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ اس جگہ ''عبد'' سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی ذات والاصفات ہے۔ لغت میں اس سے ذوالعقول کی نوع میں سے مملوک مراد ہے۔ المحکم میں ہے ''العبد سے مراد انسان ہے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام ہو کیونکہ وہ اپنے خالق کا مملوک ہوتا

ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ تعبد سے مشتق ہے۔ اس کا معنی تذلل ہے۔" ابن الانباری نے لکھا ہے کہ عبد سے مراد رب تعالیٰ کے لیے خشوع وخضوع کرنے والا ہے۔ طریق معبد وہ راستہ ہوتا ہے جسے لوگوں نے خوب روندھا ہو۔ امام جمال الدین بن مالک نے عبد کی جمع کے بارے دو اشعار لکھے تھے۔ الشیخ نے دو اشعار کے ساتھ اس کا تتمہ لکھا ہے۔ ان سے قبل بھی ایک شعر کا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"ابن مالک نے عبد کی جمع کے بارے اشعار لکھے ہیں۔ میں نے ان پر ان کی مثل اضافہ کیا ہے۔ فائدہ اٹھاؤ خوب کوشش کرو۔

عبد کی جمع عباد، عبید اور اعبد آتی ہے۔ اسی طرح اس کی جمع اعابد اور عبد آتی ہے۔ اسی طرح اس کی جمع عُبدان اور عِبدان، عبدی آتی ہے۔ اگر چاہو تو ان میں توسیع کرلو۔ اعباد، عبود، عبدۃ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ فتحہ کے ساتھ تخفیف کرلو اسی طرح عبدًّان بھی ہے اسی طرح یہ جمع اعبدۃ، عبدون اور عبیدون آتی ہے۔ یہ سیکھ جاؤ۔ تمہیں صحیح رستہ پر چلنا نصیب ہوگا۔"

اسنوی نے لکھا ہے کہ سیبویہ نے لکھا ہے کہ العبد دراصل صفت ہے لیکن اب اسے اسماء کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ شیخ زکریا رحمہ اللہ نے فتح الرحمان میں لکھا ہے کہ رب تعالیٰ نے بعبدہٖ فرمایا ہے۔ نبیہ یا حبیبہ نہیں فرمایا تاکہ آپ ﷺ کی امت گمراہ نہ ہو جائے، یا رب تعالیٰ کی طرف مضاف کر کے عبودیت کا وصف بیان کرنا اشرف مقامات میں سے ہے۔

استاذ، ابو علی دقاق علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ مومن کے لیے مقامِ عبودیت سے افضل، اعلیٰ اور اشرف کوئی مقام نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اشرف مقامات پر اسی نام سے یاد فرمایا ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ۔ (الاسراء:۱)

ترجمہ: "ہر (عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو۔"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ۔ (الکہف:۱)

ترجمہ: "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے نازل فرمائی اپنے بندے پر یہ کتاب۔"

فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ﴿۱۰﴾ (النجم:۱۰)

ترجمہ: ''پس وحی کی اللہ نے اپنے (محبوب) بندے کی طرف جو وحی کی۔''

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ۔ (الفرقان:۱)

ترجمہ: ''بڑی خیر و برکت والا ہے وہ جس نے اتارا ہے الفرقان اپنے (محبوب) بندے پر۔''

شیخ عبدالباسط البلقینی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے ''اسی سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے آپ کو اس وصف سے کیوں یاد فرمایا جبکہ اپنے اس فرمان سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے سیادت کا وصف بیان فرمایا۔

وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا۔ (آلِ عمران:۳۹)

ترجمہ: ''سردار ہوگا اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہوگا۔''

امام ابوالقاسم القشیری نے فرمایا ہے: ''اسی مفہوم میں یہ اشعار پڑھو:

یا قومِ قلبی عند زهراء
یعرفه السامع والرائی
لا تدعنی الا بیا عبدها
فانّه اشرف اسمائی

ترجمہ: ''اے میری قوم! میرا دل زہراء (محبوب) کے پاس ہے۔ ہر سننے والا اور دیکھنے والا اسے جانتا ہے۔ تم مجھے ''یا عبدھا'' کے لقب سے ہی یاد کرو۔ یہ نام میرے سارے اسماء میں سے افضل ہے۔''

عوفی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ الٰہیت، سیادت اور ربوبیت درحقیقت اللہ رب العزت کے لیے ہیں۔ کسی اور کے لیے نہیں۔ اس کے علاوہ ہر مخلوق کے لیے عبودیت کا وصف حقیقی ہے۔ جب وہ مقام عبودیت میں ہوگا وہ درحقیقت اپنے اصلی مقام پر ہوگا۔ حقیقی مرتبہ اشرف مراتب میں سے ہوتا ہے، کیونکہ حقیقت کے بعد مجاز ہوتا ہے۔ حق کے بعد گمراہی ہی ہے۔''

البرہان النسفی نے لکھا ہے ''جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شب معراج بلند درجات اور رفیع مراتب تک پہنچے رب تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی: ''محمد عربی! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس نام سے پکاروں؟

آپ ﷺ نے عرض کی: ''مولا! اپنی ذات کی طرف عبودیت کی نسبت کو فراموش نہ کرنا۔ اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ۔ (الاسرا:۱)

ترجمہ: ''ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات سیر کرائی جس نے اپنے محبوب بندے کو۔''

عبد اور عبودیت کے بارے علماء کے بہت سے اقوال ہیں۔ الفاظ کے معانی مختلف ہیں۔ ہر ایک نے اپنے مقام و منصب کے مطابق گفتگو کی ہے۔ ابوحفص نیسا پوری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''عبد وہ ہوتا ہے جو اپنے آقا کے اوامر پر خوشی خوشی عمل کرتا ہے۔ وہ اسے جو بھی حکم کرتا ہے۔'' ابن عطاء رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''عبد وہ ہوتا ہے جس کی ملکیت میں کچھ بھی نہ ہو۔'' جریری نے لکھا ہے ''عبد کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کے اخلاق کو اپنا لے'' حضرت رویم رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''عبد کی عبودیت اس وقت متحقق ہوتی ہے جب وہ مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دے۔ اپنی قوت و طاقت سے برأت کا اظہار کرے۔ وہ جان لے کہ سب کچھ اس کے لیے اور اس کے ساتھ ہے۔'' حضرت عبداللہ بن محمد رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''تم اس وقت وصفِ عبودیت سے متصف ہو گے جب تم اپنے آپ کے لیے کچھ بھی ملکیت نہ دیکھو۔ تم یہ سمجھو کہ تم کسی نقصان یا فائدہ کے مالک نہیں ہو۔'' رب تعالیٰ اس پر رحم کرے جس نے یہ اشعار لکھے ہیں:

و کنت قدیما اطلب الوصل منهم
فلمّا اتانی العلم و ارتفع الجهل
تیقنت ان العبد لا مطلب له
فان قربوا فضل و ان ابعدوا عدل
ان اظهروا لم یظهروا غیر و صفهم
و ان ستروا والستر من اجلهم یحلو

ترجمہ: ''میں پہلے ان سے وصال کا متمنی تھا۔ جب میرے پاس علم آیا تو جہالت ختم ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ عبد کا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ قرب بخش دیں تو یہ

فضل ہے۔ اگر وہ دور کر دیں تو یہ عدل ہے۔ اگر وہ ظاہر کریں تو اپنے وصف کے علاوہ کسی کا اظہار نہیں کرتے اگر حجاب کریں تو ان کی وجہ سے حجاب بھی شیریں ہوتا ہے۔"

امام رازی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے: "عبد کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جسم اور روح سمیت معراج کرائی کیونکہ ارشادِ ربانی ہے:

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ﴿٩﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ﴿١٠﴾ (العلق:۹،۱۰)

ترجمہ: "(اے حبیب!) آپ نے دیکھا اسے جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔"

لیلاً پر گفتگو:

حافظ رحمہ اللہ نے لکھا ہے "لیلاً" الاسراء کے لیے ظرف ہے۔ یہ تاکید کے لیے ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مجاز کا وہم ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کبھی اس کا اطلاق دن کے وقت چلنے پر بھی ہوتا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سیر رات کے کچھ حصہ میں ہوئی۔ ساری رات میں نہیں ہوئی۔ کیونکہ اہلِ عرب کہتے ہیں سرٰی فلان لیلاً۔ جب وہ رات کا کچھ حصہ ہی چلے۔ "سرٰی فی لیلۃ" اس وقت کہتے ہیں جب وہ ساری رات چلے۔ جب یہ چلنا رات کے وقت ہو تو اسرٰی لیلاً نہیں کہا جاتا۔" رات کے ابتدائی حصہ میں چلنے کو ادلج کہا جاتا ہے۔ اسی لیے رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے بارے فرمایا:

فَاَسْرِ بِعِبَادِىْ لَيْلًا۔ (الدخان:۲۳)

ترجمہ: "لے چلو میرے بندوں کو راتوں رات۔"

ابو شامہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے "اسری کو رات کی طرف منسوب کیا گیا ہے کیونکہ سفر رات کے وقت ہی ہوتا ہے۔ جیسے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ (یونس:٦٧)

ترجمہ: ''اور روشن دن بنایا۔''

یعنی اس میں دیکھا جاتا ہے۔ یہ لیل نائم وساھر کے باب سے ہے۔ یعنی اس میں نیند اور بیداری حاصل ہوتی ہے۔ یہ مجاز کے ابواب میں سے مشہور باب ہے۔

بہت سے لوگوں نے اسے مشکل سمجھا ہے کہ "لیلا" الاسراء کی ظرف ہو۔ اس اشکال کی وجہ یہ ہے کہ پہلے گزر چکا ہے کہ الاسراء سے مراد رات کو چلنا ہے۔ الاسراء کو جب مطلق رکھا جاتا ہے تو یہ بات سمجھ آجاتی ہے کہ یہ رات کے وقت واقع ہوا تھا۔ یہ الصبوح فی شرب الصباح کی طرح ہے۔ یہ اس قول کا محتاج نہیں ہے۔ میں نے وقتِ صبح، صبح کا مشروب پیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ حقیقت اسی طرح ہے لیکن اہلِ عرب بعض اوقات یوں کر لیتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ تاکید کا ارادہ کریں۔ تاکید ان کے کلام کی انواع میں سے ایک نوع اور ان کا اسلوب ہے۔ عرب کہتے ہیں اخذ بیدیہ و قال بلسانہ۔ قرآن عزیز میں ہے:

وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ۔ (الانعام:۳۸)

ترجمہ: ''اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے۔''

يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ۔ (آلِ عمران:۱۶۷)

ترجمہ: ''وہ کہتے ہیں اپنے مونہوں سے۔''

فَخَرَّ عَلَيۡهِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ۔ (النحل:۲۶)

ترجمہ: ''پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے۔''

جریر نے کہا ہے:

سری نحوها لیلاً کان نجومه

قنادیل فیهن الذبال المنقل

ترجمہ: ''وہ رات کے وقت اس کی طرف گیا گویا کہ اس کے ستارے قندیل ہیں جن میں بتیوں کے دھاگے ہیں۔''

ذبال، ذبالۃ کی جمع ہے۔ اس سے مراد فتیلہ ہے۔

جوہری نے لکھا ہے ''لیلاً'' اس لیے فرمایا ہے اگرچہ سریٰ کا معنی رات کو سفر کرنا ہی

ہوتا ہے تاکہ تاکید حاصل ہو جائے۔ یہ اس طرح ہے: "سرت امس نہارا۔ والبارحۃ لیلاً"۔

علامہ زمخشری نے لکھا ہے "اگر تم کہو کہ الاسراء کا معنی رات کو چلنا ہوتا ہے تو پھر اللیل کا تذکرہ کیوں کیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ رب تعالیٰ نے لیلاً جونکرہ فرمایا جو اسراء کی مدت کی قلت پر دلالت کرتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے لے کر شام تک کا فاصلہ رات کے مختصر حصہ میں طے ہوا۔ حالانکہ یہ چالیس راتوں کی مسافت ہے۔ اس میں تنکیر بعضیت کے معنی پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن حذیفہ رضی اللہ عنہ کی قرأت "من اللیل" بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء: ۷۹)

ترجمہ: "اور رات کے بعض حصہ میں اٹھو اور نماز تہجد ادا کرو یہ نماز زائد ہے آپ کے لیے۔"

اس آیت طیبہ میں بعض رات قیام کرنے کا حکم ہے۔

ابوشامۃ علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے: "اس وجہ میں کوئی حرج نہیں۔ امام سخاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: "رب تعالیٰ نے فرمایا: "لیلاً" الاسراء رات کے وقت ہی سفر کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جو مسافت اس رات کے حصہ میں طے کی گئی وہ چالیس راتوں سے کم مدت میں بھی طے نہیں ہو سکتی تھی۔ معنی یہ ہوگا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے رات کے ایک حصہ میں اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس مقام سے اس مقام تک سیر کرائی۔ یہ تعجب کا مقام ہے۔ لیلۃ کی جگہ لیل کا تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ جب کہا جائے سرٰی لیلۃً تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے ساری رات سفر کیا۔ اگر لَیۡل کا لفظ ذکر کیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ رات کے کچھ حصہ میں سفر کیا گیا۔

صاحب الفواد نے علامہ زمخشری کے قول کا تعاقب کیا ہے۔ اس میں طیبی نے ان کا تعاقب کیا ہے۔ پھر انہوں نے لکھا ہے: "یہ بھی امکان ہے کہ تنکیر سے مراد تعظیم و تفخیم ہو۔ مقام اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ سورت کا آغاز ایسے کلمہ سے کیا گیا ہے جو اس تعظیم کی خبر دے رہا ہے۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ وصف عبدیت سے کیا۔ پھر مسجد حرام اور مسجد

اقصیٰ کا تذکرہ کیا۔ پھر مسجد اقصیٰ کے اردگرد برکت کا تذکرہ کیا۔ زمانہ کی تعظیم کی گئی۔ پھر ان آیات اور نشانیوں کی تعظیم کی گئی جو اس کی طرف منسوب ہیں۔ آیات کو جمع ذکر کیا۔ تاکہ یہ آیات کی ساری انواع کو شامل ہو جائے۔ یہ سب کچھ اس امر کی تصدیق کر رہے ہیں جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس ہستی پاک کی کیا شان ہے جس کو سیر کرائی گئی جس کے لیے مقام عبدیت متحقق ہے۔ آپ ﷺ نے رات کے مختصر حصہ میں عنایات سرمدیہ حاصل کیں۔ اس رات کی شان کتنی عظیم ہے۔

ابن المنیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''رات کے وقت معراج اس لیے ہوئی کیونکہ یہ خلوت کا وقت ہوتا ہے۔ خصوصیت کا وقت ہوتا ہے۔ یہ اس نماز کا وقت ہے جو صرف آپ ﷺ پر فرض تھی۔

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (المزمل:۲)

ترجمہ: ''(نماز کے لیے) قیام فرمایا کیجئے مگر تھوڑا۔''

اور تاکہ اہلِ ایمان کے ایمان بالغیب میں اضافہ ہو اور کافر کے لیے فتنہ بنے۔

ابن دحیہ نے لکھا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے رات کے وقت ہمارے نبی کریم ﷺ پر کئی کرم نوازیاں کیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

1. چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا۔ جنات کا آپ ﷺ پر ایمان لانا۔ آپ ﷺ کے صحابہ کرام کا ان کی آگ دیکھنا۔ (صحیح مسلم)

رات کے وقت آپ ﷺ کا غار کی طرف تشریف لے جانا۔ رات اصل ہے۔ مہینہ کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے۔ اس کی سیاہی بصارت کی روشنی کے ساتھ ملتی ہے۔ اس میں داستان گوئی سے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ آپ ﷺ اکثر سفر رات کے وقت ہی کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم رات کا سفر کیا کرو۔ رات کے وقت زمین کو سمیٹ دیا جاتا ہے۔ رات عبادت کے لیے کوشش کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ آپ ﷺ رات کے وقت اتنا زیادہ قیام فرماتے تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے قدمین شریفین سوجھ جاتے تھے۔ رات کے وقت قیام کرنا آپ ﷺ پر واجب تھا۔ آپ ﷺ کی عبادت رات کے وقت زیادہ ہوتی تھی۔ اسی لیے آپ ﷺ کو رات کے وقت ہی معراج کرائی گئی۔ تاکہ آپ ﷺ کی تصدیق کرنے والے کا اجر

زیادہ ہو سکے۔تاکہ وہ ایمان بالغیب والوں کی صف میں شامل ہو سکے۔رب تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم میں رات کو دن سے مقدم ذکر کیا ہے۔ارشاد فرمایا:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ۔ (الاسراء:١٢)

ترجمہ:''اور ہم نے بنایا ہے رات اور دن کو قدرت کی دو نشانیاں۔''

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾ (الفرقان:٦٢)

ترجمہ:''اور وہ وہی ہے جس نے بنایا ہے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا اس کے لیے جو چاہتا ہے کہ نصیحت قبول کرے یا چاہتا ہے کہ شکرگزار بنے۔''

صحیح روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:''ہمارا رب تبارک وتعالیٰ رات کو جب رات کا آخری ثلث باقی رہ جاتا ہے تو آسمان دنیا پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔وہ کہتا ہے ''ہے کوئی جو مجھ سے دعا کرے میں اس کی دعا کو قبول کروں؟ ہے کوئی جو مجھ سے مانگے میں اسے عطا کروں؟ ہے کوئی جو مجھ سے مغفرت طلب کرے میں اسے معاف کروں۔''

یہ خصوصیت دن کو عطا نہیں کی گئی۔حضور ﷺ نے اس رحمت، دوگنا اجر اور دعا کی اجابت کی جلدی کا تذکرہ کیا جو اس وقت حاصل ہوتی ہے۔نیز اس میں فلسفیوں کے اس قول کا بھی ابطال ہے کہ رات کی شان میں سے اہانت اور شر ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رات کے وقت کئی اقوام کو سرفرازیاں عطا کیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں فرمایا:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ۔ (الانعام:٧٦)

ترجمہ:''پھر جب چھا گئی ان پر رات۔''

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ۔ (الحجر:٦٥)

ترجمہ:''آپ لے کر نکل جائیے اپنے اہل وعیال کو جب رات کا کچھ حصہ گزر جائے۔''

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً۔ (الاعراف:١٤٢)

ترجمہ:''اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس راتوں کا۔''

ہم نے ان کے ساتھ مناجات کیں۔رات کے وقت انہیں اپنے اہلِ خانہ کو لے جانے

کا حکم دیا۔ بعض اہلِ اشارات نے لکھا ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے رات کی نشانی کو مٹایا:

وَجَعَلْنَآ اٰیَۃَ النَّھَارِ مُبْصِرَۃً۔ (الاسراء:۱۲)

ترجمہ: ''اور بنادیا دن کی نشانی کو روشن۔''

رات کا دل ٹوٹ گیا۔ اس میں حضور اکرم ﷺ کو معراج کرائی گئی۔

ابوامامۃ بن نقاش علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے: ''حضور اکرم ﷺ کے حق میں شب معراج لیلۃ القدر سے افضل ہے۔ جبکہ آپ کی امت کے حق میں لیلۃ القدر افضل ہے۔ کیونکہ امت کو ایک رات عبادت کرنے کا ثواب اسی سال سے زائد ملتا ہے۔ جبکہ شب معراج میں عمل کرنے کے ثواب کا تذکرہ نہ صحیح روایت میں ہے نہ ضعیف ہیں۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اسے معین نہیں فرمایا۔ امام بلقینی علیہ الرحمۃ کے اس شعر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے شب معراج لیلۃ القدر سے افضل ہے۔

اولاك رؤيتهٗ فى ليلة فضلت

ليالى القدر فيها الرب ارضاك

ترجمہ: ''اس نے اس رات کو آپ کو اپنا دیدار کرایا جو شب قدر سے فضیلت پاگئی اس میں آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کو راضی کر دیا۔''

''الاصطفاء'' میں ہے: ''شاید اس میں یہ حکمت ہے کہ اس میں آپ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا جو ہر چیز سے افضل ہے۔ اس لیے اسے کسی عمل کا مطلق ثواب نہیں بنایا۔ بلکہ وہ اسے روزِ قیامت اپنے بندوں پر بطور احسان فرمائے گا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا دن افضل ہے یا رات؟ کسی نے دن کو اور کسی نے رات کو ترجیح دی۔ امام ابوالحسین بن فارس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں ہر ایک کے افضل ہونے کی علیحدہ علیحدہ وجوہات بیان کیں ہیں۔

مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ پر گفتگو

اس جگہ مِنْ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ علامہ زرکشی نے اپنی کتاب ''اعلام

الساجد باحکام المساجد" میں لکھا ہے کہ المَسجِد المَفعِل کے وزن پر ہے۔
یہ سجدہ کرنے کی جگہ کا نام ہے۔ یہ فتح کے ساتھ اسم مصدر ہے۔ ابوزکریا الفراء نے لکھا ہے: "ہر وہ فعل جو فَعَلَ یَفعُلُ کے وزن پر ہو۔ جیسے دَخَلَ یَدْخُلُ تو اس میں مفعل کا صیغہ فتح کے ساتھ آتا ہے۔ خواہ وہ اسم ہو یا مصدر۔ ان میں فرق نہیں ہوتا جیسے دَخَلَ مَدْخَلاً۔ وہ اسماء جن کے عین کلمہ کو کسرہ دیتے ہیں۔ وہ یہ ہیں المسجد، المطلع، المغربی، المشرق وغیرھا۔ انہوں نے کسرہ کو اسم کی علامت قرار دیا ہے۔ بعض اہلِ عرب نے اسے فتح دیا ہے۔ المسجد کو المسجَد اور المطلِع کو المطلَع بھی پڑھا گیا ہے۔ فتح ان سب میں جائز ہے۔ اگرچہ ہم نے اس کے بارے نہیں سنا۔

"الصحاح" میں ہے: "المسجَد انسان کی پیشانی کی وہ جگہ ہے جس پر سجدہ کیا جاتا ہے۔" ابوحفص الصقلی نے اپنی کتاب تثقیب اللسان میں لکھا ہے: "اسے مَسجد پڑھا گیا ہے۔ کئی علماء نے اسی طرح لکھا ہے۔ مسجد چھوٹی چٹائی کو کہا جاتا ہے۔ عرف میں زمین کی ہر جگہ کو مسجد کہا جا سکتا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے لیے زمین کو مسجد اور پاکیزگی بنا دیا گیا ہے۔"

سجدہ نماز کے افضل افعال میں سے ہے کیونکہ اس میں بندہ اپنے رب کے قریب ہوتا ہے۔ جگہ کا نام اسی سے مشتق کر لیا گیا ہے۔ اسے مسجد کا نام دیا گیا مَربع نہ کہا گیا۔ عرف میں اس جگہ کو اس نام سے مختص کیا گیا جو پانچ نمازوں کے لیے مختص کی گئی ہو۔ حتیٰ کہ عید گاہ کو مسجد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح مدارس کو بھی مسجد نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ انہیں اس مقصد کے لیے نہیں بنایا گیا۔

"الحَرَامِ" پر گفتگو

ابوشامہ علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے "الحرام کی اصل المنع ہے۔ اسی سے بیت الحرام ہے۔ فلان حرام کہا جاتا ہے یعنی فلاں محرم ہے۔ یہ حلال کی ضد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے محرم کو ان امور سے روک دیا جاتا ہے۔ جو دوسروں کے لیے جائز ہوتے ہیں۔ اسی طرح حرم میں ان امور سے روک دیا گیا ہے جو دوسرے شہروں میں حلال ہیں۔ علامہ ماوردی نے

کتاب الجزیہ میں لکھا ہے "ہر وہ جگہ جہاں رب تعالیٰ نے المسجد الحرام کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد حرام ہے۔ مگر رب تعالیٰ کا یہ فرمان اس سے مستثنیٰ ہے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ (البقرۃ:۱۴۴)

ترجمہ: "(لو) پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔"

اس سے مراد خانہ کعبہ معظمہ ہے۔ حافظ رحمۃ اللہ نے لکھا ہے: "مسجد حرام کا لفظ دراصل خانہ کعبہ کی حقیقت ہے۔"

رب تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ (آلِ عمران:۹۶)

ترجمہ: "بیشک پہلا عبادت خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لیے وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ بڑا برکت والا ہے ہدایت کا سرچشمہ سب جہانوں کے لیے۔"

جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اس اول مسجد کے بارے عرض کی جو روئے زمین پر سب سے پہلے بنائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" بعد میں یہ لفظ اس مسجد کے لیے استعمال فرمایا جو خانہ کعبہ معظمہ کے ارد گرد تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مسجد حرام میں ادا کی گئی ایک نماز کا ثواب اتنی اتنی نمازوں کے برابر ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ استعمال تغلیب مجازی کے طور پر کیا۔ اسی طرح اس شخص نے بھی اسے تغلیب مجازی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ رب تعالیٰ کے اس فرمان میں مسجد حرام سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ (الاسراء:۱)

ترجمہ: "ہر (عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے۔"

کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر جلوہ افروز تھے۔ یہ گھر مکہ مکرمہ کے گھروں میں سے ایک تھا۔ حرم پاک ان کے ارد گرد تھا۔ ارشادِ ربانی ہے:

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

ترجمہ: "یہ رعایت اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔"

یہ سب کچھ باب تغلیب سے ہے جو مجاز کے لیے جائز ہے۔ اس میں وسعت ہے ورنہ مسجد حرام کے لفظ کی جگہ میں اشتراک لازم آتا۔ حجاز اس سے اولیٰ ہے۔ اشتراک کے بارے کیسے کہا جا سکتا ہے حالانکہ اسے بولتے ہی اس کا اطلاق خانہ کعبہ پر ہوتا ہے۔ یا اس مسجد پر ہوتا ہے جو اس کے ارد گرد ہے؟ کسی قرینہ کی وجہ سے ہی اس سے پورا مکہ مکرمہ مراد ہو سکتا ہے۔

اقصیٰ پر گفتگو

علامہ برھان الدین النسفی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے۔ "اس بات پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے۔ اس کو مسجد اقصیٰ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس کے اور مسجد حرام کے مابین بہت زیادہ مسافت ہے۔" علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ اسے مسجد اقصیٰ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس سے پرے کوئی مسجد نہ تھی۔ الکفیل نے لکھا ہے کہ اس مسجد کے لیے یہ وصف ثابت ہو گیا ہے اگرچہ اس سے پرے اور بھی مساجد ہوں۔ جو اس سے بھی دور ہوں کیونکہ جب ایک نام کسی سبب کی وجہ سے معروف ہو جاتا ہے تو سبب کے زائل ہونے سے وہ ختم نہیں ہوتا۔

ابن دحیۃ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: "حضرت خلیل اللہ علیہ السلام سے لے کر بعد کے سارے انبیاء کرام علیہم السلام اسی جگہ سے تشریف لائے۔ اسی لیے سارے انبیاء کرام علیہم السلام اسی جگہ جمع ہوئے۔ کیونکہ یہ ان کا گھر تھا۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ آپ رئیس مقدم اور امام اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔"

حضرت ابوشامۃ علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے: "اس سے مراد وہ بیت المقدس ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آباد کیا ہے۔ یہ ہمیشہ محترم و مکرم رہا۔ یہ ان تین مساجد سے ایک ہے جن کی تعظیم اور زیارت کے لیے سفر کیا جاتا ہے۔ یہ مسجد اہلِ مکہ یا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت دور تھی۔ اس لیے اسے الاقصیٰ کہا گیا۔ اقصیٰ القصی سے افعل کے وزن پر ہے۔ القاصی سے مراد بعید ہے۔

ابن ابی جمرہ نے لکھا ہے "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے مسجد اقصیٰ کی طرف سیر کرائی گئی۔ اس میں

یہ حکمت کارفرما تھی کہ سرکش پر حق کا اظہار ہو سکے۔ اگر مکہ مکرمہ سے آسمان کی طرف سیر کرائی جاتی تو سرکش اور دشمن کے لیے تفصیل و بیان کا راستہ نہ رہتا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ آپ ﷺ کو بیت المقدس کی سیر کرائی گئی تو انہوں نے آپ ﷺ سے بیت المقدس کی اشیاء کے بارے سوالات کیے۔ کیونکہ انہوں نے اسے دیکھا تھا، اسے جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ پہلے وہاں تشریف نہیں لے گئے۔ جب آپ ﷺ نے انہیں اس کے بارے بتایا تو آپ ﷺ کی صداقت عیاں ہوگئی کہ آپ ﷺ نے رات کے قلیل حصہ میں مسجد اقصیٰ کی سیر کی۔ جب اتنے سفر کی صداقت ثابت ہوگئی تو بقیہ واقعات کی صداقت خود بخود عیاں ہو جائے گی۔

ایک قول یہ ہے تاکہ آپ ﷺ کی معراج بالکل سیدھی ہو۔ کیونکہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آسمان کا ایک دروازہ جسے مصعد الملائکۃ کہا جاتا ہے وہ بیت المقدس کے مقابلہ میں ہے۔ آسمان اس سرزمین سے اٹھارہ میل قریب ہے۔

حافظ علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے: ''اس میں اعتراض کی گنجائش ہے'' ایک قول یہ ہے تاکہ آپ ﷺ دونوں قبلوں کو جمع کریں کیونکہ اکثر انبیائے کرام نے بیت المقدس کی طرف ہجرت کی تھی۔ آپ ﷺ کو بھی اس کی طرف جانے کا سفر حاصل ہو جائے تاکہ فضائل کے سارے اسباب جمع ہو جائیں۔ ایک قول کے مطابق یہ حشر کی جگہ ہے۔ رب تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ آپ ﷺ کے قدمین شریفین وہاں بھی لگ جائیں۔ تاکہ ان قدمین شریفین کی برکت سے آپ ﷺ کی امت پر روزِ حشر آسان ہو جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ آپ ﷺ کو وہ قبلہ دکھادے جس کی طرف مدت تک آپ ﷺ رخ انور کر کے نماز ادا فرماتے رہے۔ جس طرح کہ آپ ﷺ اس خانہ کعبہ کو جانتے تھے جس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ارواحِ انبیاء علیہم السلام کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ رب تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ انہیں آپ ﷺ کی زیارت سے مشرف فرمائے۔ ایک قول یہ ہے تاکہ اسے حسّاً اور معنًی برکت حاصل ہو جائے۔

ابن دحیۃ نے لکھا ہے ''یہ احتمال بھی ہے کہ رب تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہو کہ اس سرزمین کو آپ کے قدمین شریفین کی برکت سے مشرف فرمادے۔ تاکہ حضور اکرم ﷺ کی نماز کی

برکت سے اس کی تقدیس مکمل ہو جائے۔ جب اس کی تقدیس مکمل ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''زیارت اور تعظیم کے لیے صرف تین مساجد کی طرف منہ کرنا شرعاً روا ہے۔''

١. مسجد حرام۔ کیونکہ یہ آپ ﷺ کی ولادت گاہ ہے۔ اسی جگہ سے آپ ﷺ کے سرِ اقدس پر نبوت کا تاج سجایا گیا ہے۔
٢. مسجد نبوی۔ یہ آپ ﷺ کی ہجرت گاہ ہے۔ آپ ﷺ کا روضہ انور اسی جگہ ہے۔
٣. مسجد اقصیٰ۔ کیونکہ یہ آپ ﷺ کی معراج کی جگہ ہے۔

رموز الکنوز میں ہے: ''اگر کوئی یوں کہے کہ اسراء اور معراج ایک ہی رات میں تھیں۔ رب تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو آسمان کی طرف جانے کے بارے کیوں نہ بتا دیا؟ میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں تاکہ وہ ایمان کی سمت استدراجاً (آہستہ آہستہ) بڑھیں۔ پہلے اسراء کا تذکرہ کیا۔ جب آپ ﷺ کی صداقت کی علامات عیاں ہو گئیں۔ آپ ﷺ کی رسالت کے دلائل سچ ثابت ہو گئے۔ وہ اس معجزہ سے مانوس ہو گئے تو انہیں اس معجزہ سے آگاہ فرمایا جو اس معجزہ سے بڑا تھا۔ یعنی آپ کی معراج۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے بارے بتایا۔ اللہ رب العزت نے سورۃ النجم نازل کی۔

امام رازی اور برہان نے لکھا ہے ''الیٰ'' کا کلمہ غایت کی انتہاء کے لیے ہے۔ رب تعالیٰ کے اس فرمان ''اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا'' کا مدلول یہ ہے کہ آپ ﷺ مسجد اقصیٰ تک تشریف لے گئے تھے۔ اس میں یہ مدلول نہیں کہ آپ ﷺ اس کے اندر بھی تشریف لے گئے تھے۔''

میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ محققین نے لکھا ہے جب ''الیٰ'' انتہائے غایت کے لیے ہو اور قرینہ تقاضا کرے کہ مابعد میں داخل ہو گیا ہوگا تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ جیسے کوئی کہے ''قرأت القرآن من اوله الیٰ آخرہ'' آخر کا ذکر اس جگہ قرینہ ہے کیونکہ اسے غایت بنایا گیا ہے۔ ایک قول کے مطابق قرینہ یہ ہے کہ سارے قرآن پاک کے حفظ کی وجہ سے کلام مسبوق ہے۔ یہ امر غایت کے خروج کے منافی ہے۔ لہٰذا دخول کا تعین ہو گیا۔ یا قرینہ مابعد کے خروج پر دلالت کرے گا تو اس پر بھی عمل کیا جائے گا۔ جیسے

اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ (البقرہ:١٨١)

ترجمہ: "پھر پورا کرو روزہ کو رات تک۔"

اسراء کی آیت میں قرینہ یہ علم ہے کہ شاید آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف سیر نہ کرائی گئی ہو۔ شاید آپ ﷺ اس کے اندر تشریف نہ لے گئے ہوں۔ لیکن صحیح احادیث میں صراحت ہے کہ آپ ﷺ بیت المقدس میں تشریف لے گئے تھے۔

بارکنا حولہ پر بحث

امام راغب علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ برکت سے مراد کسی چیز میں خیر الٰہی کا ثبوت ہے اور مبارک وہ ہوتا ہے جس میں خیر ہو۔" المصباح میں ہے البرکۃ سے مراد نمو اور زیادتی ہے۔ مبارک دراصل مبارک فیہ ہے۔" النموذج میں ہے "اگر کہا جائے کہ رب تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "بارکنا حولہ" لیکن "بارکنا علیہ یافیہ" نہیں فرمایا۔ جبکہ مسجد کے اندر برکت اس کے اردگرد کی برکت سے زیادہ ہوتی ہے۔ خصوصاً مسجد اقصیٰ میں" ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس سے مراد دنیاوی برکات جیسے رواں نہریں اور ثمرآور درخت۔ یہ برکات مسجد کے اردگرد ہیں۔ اس کے اندر نہیں ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد دینی برکات ہیں۔ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کا مقر تھا۔ یہ ان کی عبادت گاہ اور وحی اور ملائکہ کے نزول کی جگہ ہے۔ رب تعالیٰ نے بارکنا حولہ فرمایا تاکہ اس کی برکت عام ہو جائے۔ اس سے مراد مسجد اقصیٰ کے اردگرد وہ امور ہیں جو سرزمین شام اور اس کے اردگرد ہیں۔ یہ بیت المقدس کے رقبہ سے زیادہ ہیں یا گویا کہ بیت المقدس اصل ہے۔ رب تعالیٰ نے جب اس کے اردگرد برکات رکھ دیں ہیں تو اس کے اندر بدرجہ اولیٰ برکات ہوں گی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد دینی اور دنیوی برکات ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ برکات ہیں جو اس سے پھوٹتی ہیں پھر ساری روئے زمین میں پھیل جاتی ہیں۔ کیونکہ زمین کی ساری نہروں کا منبع بیت المقدس کی چٹان کے نیچے ہے۔

التفصیل میں ہے "اگر کہا جائے کہ مسجد اقصیٰ کے اردگرد برکت ہے تو پھر مسجد حرام اس سے ممتاز کیسے ہوگی؟ میں کہتا ہوں "مسجد اقصیٰ کے اردگرد برکات دنیا، شادابی اور سبزہ کے

اعتبار سے ہیں۔ جبکہ مسجد حرام کے ارد گرد برکات دین، فضل، اس میں طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور اس کی زیارت کرنے والوں کی نیکیوں کو کئی گنا بڑھا دینے کے اعتبار سے ہیں۔ کیونکہ اجر تھکاوٹ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یہ بے آب وگیاہ وادی ہے۔ رب تعالیٰ نے اسے دنیاوی شادابی اور وسعت سے منزہ فرمایا ہے۔ تاکہ اس کی طرف قصد دنیا کے قصد کے ساتھ نہ ملا ہو۔ یہ دینی برکت ان دنیاوی برکات سے افضل ہے۔"

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ

سمین اور ابن عادل نے لکھا ہے کہ عام قراء نے اسے نریۂ پڑھا ہے۔ انہوں نے بارکنا کا اعتبار کیا ہے۔ اس میں غائب سے التفات ہے۔ یعنی اسریٰ بعبدہٖ (غائب) سے بارکنا، نریہ (متکلم) کی طرف التفات ہے۔ حسن نے اسے لیریۂ پڑھا ہے۔ اس قرأت کے اعتبار سے اس میں چار التفات ہوں گے۔ پہلا التفات غائب سے متکلم کی طرف پھر متکلم سے غائب کی طرف پھر متکلم کی طرف اور پھر غائب کی طرف التفات ہے۔ علامہ زمخشری نے لکھا ہے "التفات بلاغت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔"

طیبی نے لکھا ہے کہ رب تعالیٰ کا فرمان "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ" یہ آپ ﷺ کی عالم شہادت سے عالم غیب کی سیر پر دلالت کرتا ہے۔ یہ غائب کے ہی مناسب ہے "الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ" برکات کے انزال منزل کی عظیم شان پر دلالت کرتا ہے۔ یہ تفخیم کے زیادہ مناسب ہے۔ لنریہ یہ مقام سر اور اس عالم سے غائب ہونے کا اعادہ ہے۔ اس لیے یہاں غائب ذکر کرنا ہی مناسب ہے۔ من آیاتنا یہ گزشتہ امور کی تعظیم پر دلالت کرتا ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ آپ ﷺ کے رفیع مقام، قریب اور رب تعالیٰ کے مشاہدہ میں مستغرق ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وہ مجھ سے سنتا ہے وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔" غائب کی طرف التفات اس جگہ بہت مناسب ہے۔

رؤیت سے مراد وہ عجائب اور نشانیاں ہیں جو اس رات آپ ﷺ کو دکھائی گئیں۔ جو رب تعالیٰ کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ جن میں سے بعض کا تذکرہ آپ ﷺ نے کیا۔

ابو شامۃ علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے "اس جگہ مِن تبعیض کے لیے ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی نشانیوں کی تعظیم کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ نشانیاں حضور امام الانبیاء ﷺ نے ملاحظہ فرمائی تھیں۔ لیکن وہ علامات اور نشانیاں رب تعالیٰ کی ساری علامات، قدرتوں اور نشانیوں کے اعتبار سے بعض ہی تھیں۔ کسی چیز کی ظاہری علامت کو آیت کہا جاتا ہے۔ پھر اس کا غالب استعمال اس امر پر ہونے لگا جو رسلانِ عظام علیہم السلام کی صداقت، معبودِ برحق اور کرامات اولیاء پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

البرھان میں ہے "اگر کہا جائے کہ یہ آیت طیبہ دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بعض آیات ہی دکھائی تھیں۔ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے بارے فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (الانعام:۷۵)

ترجمہ: "اور اسی طرح ہم نے دکھادی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی۔"

یہ فرمان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ساری نشانیاں دکھائی تھیں۔ تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معراج حضور نبی کریم ﷺ کی معراج سے افضل ہو۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں "آسمانوں اور زمینوں کی ملکوت بھی بعض نشانیاں ہی ہیں۔ یہ بھی مخصوص نشانیاں ہیں۔ بعض مطلق بعض مخصوص سے افضل ہے۔ کیونکہ مطلق کو کامل کی طرف پھیرا جا سکتا ہے۔ اس کا مشہور جواب یہ بھی ہے کہ بعض آیاتِ الٰہیہ آسمانوں اور زمین کے ملکوت سے افضل ہیں۔"

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ

سمین نے لکھا ہے کہ صحیح نظریہ یہ ہے کہ انہ میں ضمیر اللہ رب العزت کے لیے ہے۔ طیبی نے لکھا ہے "یہ بھی بعید نہیں ہے کہ یہ ضمیر العبد کی طرف لوٹ رہی ہو۔ جیسے ابو البقاء نے بعض علماء سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: "وہ ذات بابرکات ہماری گفتگو سماعت کرنے والی ہے۔ ہماری ذات کو دیکھنے والی ہے۔ فعل کی ضمیر کو درمیان میں لانا یہ اس احساس کے لیے ہے کہ یہ عزت صرف اسی ذات والا کے ساتھ مختص ہے، شاید اس ضمیر میں جو جواز ہے وہ دونوں

امور کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ رب العزت کو دیکھا بھی اور اس کا کلام بھی سنا۔"
علامہ ماوردی نے لکھا ہے "اس جگہ السمیع اور البصیر کو دو وجوہات کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے۔

- ❶ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی ذاتِ والا کا وصف بیان کیا۔ اگرچہ یہ ایسی صفات ہیں جو سارے احوال میں رب تعالیٰ کی ذات کو لازم ہیں کیونکہ اسراء کی شب، رات کی تاریکی میں اپنے محبوب کریم ﷺ کی حفاظت اسی ذات نے کی تھی۔ آپ ﷺ کا اس میں نہ دیکھنا آپ ﷺ کو نقصان نہیں دیتا۔ اس ذاتِ والا نے اپنے عبد کریم ﷺ کی دعائیں سنیں اور ہر التجاء کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔
- ❷ جب آپ ﷺ کی قوم نے آپ ﷺ کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "السمیع" وہ تصدیق یا تکذیب کو سن رہا ہے۔ البصیر جو کچھ آپ ﷺ نے معراج کی رات کو کیا تھا۔ وہ رب تعالیٰ دیکھ رہا تھا۔ علامہ زمخشری نے لکھا ہے "وہ ذاتِ بابرکات حضور اکرم ﷺ کے فرامین کو سنتی ہے۔ البصیر وہ آپ ﷺ کے افعال مبارکہ کو دیکھتی ہے۔ وہ ان کے خلوص اور تہذیب سے آگاہ ہے۔ اسی کے مطابق وہ آپ ﷺ کو اپنا قرب عطا فرماتا ہے۔" علامہ طیبی اور سکونی نے گرفت نہیں کی۔

صاحب الکفیل نے لکھا ہے "اس جگہ رب تعالیٰ نے دو اوصاف السمع اور البصر کا تذکرہ کیا ہے یہ اس امر پر تنبیہ ہے کہ وہ ذات بابرکات خوب جانتی ہے کہ وہ اپنی رسالت اور کرامات کو کہاں رکھے۔ وہ اپنی نشانیوں کو دیکھ رہا ہے جیسے وہ ذات اعلم ہے اسی طرح وہ اسمع اور ابصر بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سن رہا ہے اسراء کی تصدیق کون کر رہا ہے؟ اور تکذیب کرنے والے کو دیکھ رہا ہے۔" انہوں نے علامہ زمخشری کا سابقہ کلام ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے "اس کلام میں جزاء کے وجوب اور اس عقیدہ کی طرف اشارہ ہے کہ نبوت کے فضائل مکتسبہ ہیں۔" اس عقیدہ سے اجتناب کرو۔

امام غزالی نے لکھا ہے: "سمیع وہ ہوتا ہے جس کے ادراک سے کوئی مسموع نہ چھپ سکے خواہ وہ کتنا ہی مخفی ہو۔ وہ راز داری اور سرگوشی سن لیتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی ادق اور مخفی چیز کو سن لیتا ہے۔ وہ رات کی تاریکی میں سخت چٹان پر چلنے والی کالی چیونٹی کے چلنے کی آواز

سن سکتا ہے۔وہ کانوں اور سوراخوں کے بغیر سن لیتا ہے۔اس کا سننا اس بات سے پاک ہے کہ واقعات اس کی طرف راہ پائیں۔تم مسموعات کے تغیر سے سمع کی جتنی بھی پاکی بیان کرلو کہ وہ کانوں اور آلہ سے سنتا ہے۔تم یہ جان لوگے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں سمع ایسے وصف سے عبارت ہے جس سے مسموعات کی صفات کے کمال منکشف ہوتے ہیں۔جو اس مسئلہ میں دقتِ نظر سے غور وفکر نہیں کرتا وہ لازماً تشبیہ کے سمندر میں گر جاتا ہے۔ہوشیار رہو۔اسے دقیق نظر سے دیکھو۔"

انہوں نے فرمایا ہے" اسی طرح بصیر وہ ذات ہوتی ہے جو دیکھتی ہے مشاہدہ کرتی ہے۔ زیر زمین بھی کوئی چیز اس سے نہیں چھپ سکتی۔اس کا دیکھنا اس بات سے منزہ ہے کہ وہ پلکوں یا حلقہ سے ہو۔وہ اس امر سے پاک ہے کہ صورتیں اور رنگ اس کی ذات میں منعکس ہوں جس طرح انسان کے آنکھ کے حلقہ میں اشیاء اور رنگ منعکس ہوتے ہیں۔یہ تغیرات اور تاثیر حدوث کا تقاضا کرتے ہیں۔وہ ذات پاک اس سے منزہ ہے۔اس ذات کے حق میں بصر اس وصف سے عبارت ہوگا جس سے مصنوعات کی صفات کا کمال عیاں ہوتا ہے۔"

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

سورۃ النجم کی تفسیر

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ﴿١﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴿٢﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿٤﴾ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ﴿٥﴾ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ﴿٦﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ﴿٧﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿٨﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴿٩﴾ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴿١٠﴾ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿١١﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿١٥﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾ (النجم:۱ تا ۱۸)

ترجمہ: ”قسم ہے اس تابندہ ستارے کی جب وہ نیچے اترا تمہارا (زندگی بھر کا) ساتھی نہ راہِ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا۔ اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔ انہیں سکھایا ہے زبردست قوتوں والے نے بڑے دانا نے۔ پھر اس نے بلندیوں کا قصد کیا اور وہ سب سے اونچے کنارہ پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور قریب ہوا یہاں تک کہ صرف دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پس وحی کی اللہ نے اپنے (محبوب) بندے کی طرف جو وحی کی۔ نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفیٰ نے)۔ کیا تم جھگڑتے ہو ان سے اس پر جو انہوں نے دیکھا۔ اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔ نہ درماندہ ہوئی چشم مصطفیٰ اور نہ (حدِ ادب) سے آگے بڑھی۔ یقیناً انہوں

نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

اس کے نزول کا سبب

اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ مشرکین نے بکواس کیا حضور نبی کریم ﷺ قرآن پاک خود گھڑ لیتے ہیں۔

ماقبل سے مناسبت

امام رازی اور برہان النسفی نے فرمایا ہے: "کہا گیا ہے کہ اس سے سابقہ سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسماء کی قسمیں اٹھائیں ہیں۔ حروف کی قسمیں نہیں۔ جیسے کہ سورۃ الصافات، سورۃ الذاریات اور سورۃ الطور اور یہ سورت مبارکہ۔ پہلی سورت میں قسم وحدانیت کے اثبات کے لیے ہے۔ جیسے فرمایا:

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴿۴﴾ (الصافات:۴)

ترجمہ: "تمہارا معبود ایک ہی ہے۔"

دوسری سورت میں وقوعِ حشر اور جزاء کے لیے قسم اٹھائی۔ جیسے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾ (الذاریات:۵،۶)

ترجمہ: "بیشک جو وعدہ تم سے کیا گیا وہ سچا ہے اور یقیناً سزا کا دن ضرور آئے گا۔

تیسری آیت طیبہ میں حشر کے وقوع کے بعد عذاب کی ہمیشگی کے لیے قسم اٹھائی۔ فرمایا:

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾ (الطور:۷،۸)

ترجمہ: "یقیناً آپ کے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔ اسے کوئی ٹالنے والا نہیں۔"

اس سورت مبارکہ میں بیانِ نبوت کے لیے قسم اٹھائی۔ فرمایا: وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ﴿۱﴾ (النجم:۱)

تاکہ وحدانیت، حشر اور نبوت کے تینوں اصول مکمل ہو سکیں۔ اس کی ماقبل کے ساتھ مناسبت کا ایک اور سبب بھی بیان کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کفار نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ سرکشی اور بغاوت کی حد کر دی۔ اور آپ کے کلام مبارک پر طعن کیا جیسے کہ اس سورت میں گزر

چکا ہے۔اس سورت میں وہ چیز بیان کی جو آپ کے دعویٰ کی صداقت پر دلالت کرتی ہے۔ آپ کے کلام مبارک کی صداقت پر دلالت کرتی ہے۔اسے قسم کے ساتھ مؤکد کر کے بیان کیا۔

اس سے مابعد سورتوں کے ساتھ اس کی مناسبت کئی اعتبار سے ہے:

۱- اس سورت کا اختتام اور اس سورت کا آغاز النجم سے کیا۔

۲- اس سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو صبر کا حکم دیا۔فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ۔ (الطور:۴۸)

ترجمہ:''اور آپ صبر فرمائیے اپنے رب کے حکم سے۔''

صبر ایک مشکل کام ہے۔اس سورت کی ابتداء میں وہ امر ذکر کر دیا جو آپ ﷺ کی عظمت شان اور رفیع منزلت پر دلالت کرتا ہے۔تاکہ صبر کرنا آپ ﷺ کے لیے آسان ہو جائے۔

۳- جب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ (الطور:۴۹)

ترجمہ:''اور رات کے کسی حصہ میں بھی اس کی تسبیح کیجئے اور اس وقت بھی جب ستارے ڈوب رہے ہوں۔''

تو آپ ﷺ کے لیے عیاں ہو گیا کہ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عمدہ جزاء دی ہے۔ پھر فرمایا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴿۲﴾ (النجم:۲)

ترجمہ:''تمہارے (زندگی بھر کا) ساتھی نہ راہِ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا۔''

شیخ نے اس کی مناسبت کی ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔وہ یہ کہ سورۃ الطور میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی ذریت کا تذکرہ کیا کہ وہ اپنے آباء کے ہمراہ ہوں گے۔جبکہ اس سورت میں یہودیوں کی اولاد کا ذکر کیا۔فرمایا:

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ (النجم:۳۲)

ترجمہ:''اس وقت سے تمہیں خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور

جب کہ تم حمل تھے اپنی ماؤں کے شکموں میں۔"

ابن المنذر اور ابن حبان نے حضرت ثابت بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہودیوں کا چھوٹا بچہ مرجاتا تو وہ اسے صدیق کہا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یہودی جھوٹ بولتے ہیں۔ جو بچہ بھی رب تعالیٰ ماں کے پیٹ میں پیدا کرتا ہے وہ شقی یا سعید ہوتا ہے۔" اس وقت مذکورہ بالا آیت طیبہ نازل ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے حق میں فرمایا:

اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ (الطور:۲۱)

ترجمہ: "اور ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو۔ اور ہم کمی نہیں کریں ان کے عملوں کی جزاء میں ذرہ بھر۔"

یعنی ہم جو کچھ اولاد کو دیں گے اس کی وجہ سے ان کے آباء کے اعمال میں کمی نہیں کریں گے۔ اس وقت کفار یا کبیرہ گناہ کرنے والوں کے بارے کہا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ (النجم:۳۹)

ترجمہ: "اور نہیں ملتا انسان کو مگر وہی کچھ جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"

یہ اس امر کے برعکس ہے جو چھوٹے اہلِ ایمان کے بارے فرمایا:

ابوحیان نے لکھا ہے یہ سورت مبارکہ مکی ہے۔ ماقبل کے ساتھ اس کی مناسبت ظاہر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ (الطور:۳۳)

ترجمہ: "کیا وہ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے خود ہی گھڑ لیا ہے۔"

انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر کہا، کاہن کہا، مجنون کہا۔ رب تعالیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گمراہ نہیں۔ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتا ہے وہ وحی الٰہی ہے۔ یہ پہلی سورت مبارکہ ہے۔ جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرم پاک میں تلاوت کیا تھا۔ مشرکین نے اسے سنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ کیا تو ایمان والوں، مشرکین اور جن وانس سب نے سجدہ کیا تھا۔ مگر ابولہب نے سجدہ نہیں کیا تھا۔ اس نے مٹھی بھر مٹی لی اور اپنی پیشانی کی طرف لے گیا۔ اس نے

کہا: ''یہ کافی ہے'' میں کہتا ہوں ''اس جگہ ابولہب کا ذکر عجیب ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم وغیرہما نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ پہلی سورت جس میں سجدہ تھا وہ النجم تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ کیا۔ سارے لوگوں نے سجدہ کیا۔ مگر ایک شخص نے سجدہ نہ کیا۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس نے مٹھی بھر مٹی لی اس پر سجدہ کیا۔ میں نے اسے دیکھا کہ اسی حالت کفر میں مارا گیا۔ وہ امیہ بن خلف تھا۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۃ النجم میں سجدہ کیا۔ اس وقت جن وانس اور درختوں نے سجدہ کیا۔ ابن ابی شیبہ نے لکھا ہے ''مگر دو افراد نے سجدہ نہ کیا۔ ان میں سے ایک امیہ بن خلف اور دوسرا ولید بن مغیرہ تھا۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مسلمانوں، مشرکین اور جن و انس نے سجدہ کیا۔

قسم پر بحث

حضرت شیخ نے الاتقان میں فرمایا ہے: ''کہا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کا قسم اٹھانے کا مفہوم کیا ہے؟ اگر وہ اہلِ ایمان کے لیے ہو تو وہ تو قسم کے بغیر خبروں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر وہ کافر کے لیے ہو تو اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ قرآن پاک لغت عرب کے مطابق نازل ہوا۔ جب وہ تاکید کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو وہ قسمیں اٹھاتے تھے۔'' حضرت ابوالقاسم القشیری نے اس کا جواب یہ دیا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے کمالِ حجت اور تاکید کے لیے قسمیں اٹھائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو افراد کے مابین فیصلہ یا تو گواہی سے ہوتا ہے یا قسم سے۔ رب تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم میں دو امور کا تذکرہ کیا تا کہ کفار کے لیے حجت باقی نہ رہے۔ فرمایا:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ۔ (آل عمران:۱۸)

ترجمہ: ''شہادت دی اُس نے کہ بے شک کوئی خدا نہیں سوائے اس کے اور (یہ گواہی دی) فرشتوں اور اہلِ علم نے۔''

قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ (یونس:۵۳)

ترجمہ:"آپ فرمایئے ہاں! بخدا یہ سچ ہے۔"

ایک اعرابی نے جب رب تعالیٰ کا یہ فرمان سنا:

وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ۔ (الذاریات:۲۲،۲۳)

ترجمہ:"اور آسماں میں ہے تمہارا رزق اور ہر وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی یہ حق ہے۔"

وہ چیخ اٹھا۔ اس نے کہا:"اس جلیل کو کس نے ناراض کر دیا حتیٰ کہ اس نے قسم اٹھا دی۔" قسم معظم نام کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ کبھی رب تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم اٹھائی۔ قرآن پاک میں ایسے سات مقامات ہیں۔

قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ۔ (یونس:۵۳)

ترجمہ:"آپ فرمایئے ہاں قسم بخدا۔"

قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ۔ (التغابن:۷)

ترجمہ:"فرمایئے کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم! تمہیں ضرور زندہ کیا جائے گا۔"

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ۔ (مریم:۶۸)

ترجمہ:"اے محبوب! تیرے رب کی قسم! ہم جمع کریں گے انہیں بھی اور شیطانوں کو بھی۔"

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ (الحجر:۹۲)

ترجمہ:"پس آپ کے رب کی قسم! ہم پوچھیں گے ان سب سے۔"

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (النساء:۶۵)

ترجمہ:"(اے مصطفیٰ) تیرے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے۔"

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ۔ (المعارج:۴۰)

ترجمہ:"پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی۔"

باقی ساری قسمیں مخلوقات کی ہیں۔ مگر کہا جائے کہ رب تعالیٰ نے مخلوق کی کیسے قسم کھائی

حالانکہ مخلوق کی قسم اٹھانے سے منع کیا گیا ہے؟ ہم اس کا جواب کئی اعتبار سے دیتے ہیں:

1. اس کا مضاف حذف ہے۔ یہ دراصل و رَبِّ النجم تھا۔
2. اہلِ عرب ان اشیاء کی تعظیم کرتے تھے۔ ان کی قسمیں اٹھاتے تھے۔ قرآن پاک اسی پر نازل ہوا جسے وہ جانتے تھے۔
3. قسم ان اشیاء کی اٹھائی جاتی ہے جنہیں قسم اٹھانے والا عظیم سمجھتا ہے۔ رب تعالیٰ سے تو عظیم کوئی چیز نہیں۔ اس لیے اس نے کبھی اپنی ذات کی قسم اٹھائی اور کبھی اپنی پیدہ کردہ اشیاء کی۔ کیونکہ یہ اسی کی قدرت پر دلالت کرتی تھیں۔"

ابن ابی الاصبع نے اپنی کتاب "اسرار الفواتح" میں لکھا ہے "مصنوعات کی قسم صانع کی قسم کو متلزم ہے۔ کیونکہ مفعول کا ذکر فاعل کے ذکر کو متلزم ہے۔ کیونکہ مفعول کا وجود فاعل کے بغیر محال ہوتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حسن سے روایت کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے جس کے ساتھ چاہا قسم اٹھادی۔ لیکن کسی اور کے لیے روا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم اٹھائے۔ قسم یا ظاہری ہوتی ہے یا مضمر۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

1. جس قسم پر لام دلالت کرتی ہے جیسے:

لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ۔ (آلِ عمران:۱۸۶)

ترجمہ: "یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے۔"

2. قسم جس پر معنی دلالت کرتا ہے جیسے:

وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ (مریم:۷۱)

ترجمہ: "اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا۔"

یہاں واللہ مقدر ہے۔

قرآن پاک میں اکثر قسموں کا فعل محذوف ہے۔ ایسی قسمیں واؤ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اگر یہ باء کے ساتھ ہوں تو فعل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جیسے:

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ۔ (الانعام:۱۰۹)

ترجمہ: ''اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی۔''

يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ۔ (النساء:٦٢)

ترجمہ: ''وہ قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی۔''

تم باء کے ساتھ قسم فعل کے حذف کے ساتھ نہیں دیکھو گے۔جس نے باللہ کو قسم کہا اس نے خطاء کی ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾ (لقمان:١٣)

ترجمہ: ''یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔''

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ (الاعراف:١٣٤)

ترجمہ: ''اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے۔''

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ (المائدہ:١١٦)

ترجمہ: ''وہ عرض کریں گے پاک ہے تو ہر شریک سے کیا مجال تھی میری کہ میں کہوں ایسی بات جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔اور اگر میں نے کہی ہوتی ایسی بات تو تُو ضرور جانتا اس کو۔''

ابن قیم نے لکھا ہے: ''اللہ رب العزت کچھ امور پر کچھ امور کے ساتھ قسم اٹھاتا ہے۔وہ اپنے ذات کریمانہ کی صفات کے ساتھ اور ان آیات کی قسم اٹھاتا ہے جو اس کی ذات اور صفات کو متلزم ہیں۔اس کی اپنی بعض مخلوق کی قسم اٹھانا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ چیز اس کی عظیم نشانی ہے۔قسم یا تو جملہ خبریہ پر ہوگی۔یہ قسم کثیر ہے جیسے رب تعالیٰ کا یہ فرمان:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ۔ (الذاریات:٢٣)

ترجمہ: ''پس قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی یہ حق ہے۔''

یا قسم جملہ طلبیہ پر ہوگی۔جیسے رب تعالیٰ کا یہ فرمان:

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾ (الحجر:٩٢،٩٣)

ترجمہ: ''پس آپ کے رب کی قسم ہم پوچھیں گے ان سب سے اعمال کے متعلق جو وہ

کیا کرتے تھے۔"

اس قسم سے کبھی مقسم علیہ (جس پر قسم اٹھائی جائے) کی تحقیق کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کا تعلق خبر کے ساتھ ہوگا۔ کبھی قسم کی تحقیق مراد ہوتی ہے۔ قسم سے مراد مقسم علیہ (جس پر قسم اٹھائی جائے) کی تاکید اور تحقیق مراد ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا تعلق ایسے امور سے ہو جو عمدہ ہوں۔ جیسے غائب اور خفیہ امور جبکہ ان کے ثبوت پر قسم اٹھائی جائے۔ یا وہ امور مشہور اور ظاہر ہوں جیسے سورج، چاند، رات، دن، آسمان اور زمین۔ اس لیے ان کے ذریعہ قسم اٹھائی جاتی ہے۔ ان پر قسم نہیں اٹھائی جاتی۔ جس چیز کی رب تعالیٰ قسم اٹھاتا ہے وہ اس کی نشانیوں میں سے ہوتی ہے۔ روا ہے کہ وہ مقسم بہ ہو لیکن اس کے برعکس نہیں ہوسکتا۔

امام رازی نے لکھا ہے: "بعض سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے جمع سے قسم اٹھائی ہے۔ جیسے والذاریات۔ بعض میں واحد کے ساتھ قسم اٹھائی ہے جیسے والطور۔ اس نے "والاطوار والبحار" نہیں فرمایا۔ اس میں بحث یہ ہے کہ وہ اکثر جمع جن کی قسم رب تعالیٰ نے اٹھائی ہے متحرکات ہیں۔ واحد اور ایک جگہ قائم اور ثابت نہیں ہوتیں کہ اس پر قسم واقع ہوسکے۔ بلکہ اس کی کئی اقسام ہیں۔ یہ اپنی انواع سے بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا مقصود ہی تغیر وتبدل سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس نے والذاریات فرمایا۔ یہ ایک مستقل نوع کی طرف اشارہ ہے۔ غیر مستقل فرد کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ جبکہ پہاڑ ثابت ہوتا ہے اس میں تغیر نہیں ہوتا۔ ایک پہاڑ طویل عرصہ تک ایک جگہ برقرار رہتا ہے۔ اس لیے اس کی قسم اٹھائی۔ اس طرح ایک ستارے کی قسم اٹھائی۔ اگر وہ "والریح" کہتا تو مقسم بہ کا علم نہ ہوسکتا۔ جبکہ پہاڑ کا علم ہوتا ہے۔ وہ سورتیں جن کا آغاز حروف کو چھوڑ کر اسماء کی قسمیں اٹھا کر کیا گیا ہے تو اس میں قسم اصول ثلاثہ میں سے کسی ایک کے اثبات کے لیے ہے۔ وہ اصول (۱) وحدانیت، (۲) رسالت، (۳) حشر ہیں۔ ایمان انہیں کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں سے صرف ایک سورت میں وحدانیت کے اثبات کے لیے قسم اٹھائی ہے۔ وہ سورۃ الصافات ہے۔ اس میں فرمایا:

اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝ (الصافات:۴)

ترجمہ: "کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔"

کیونکہ کفار اگرچہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ نے مختلف معبودان کو ایک خدا بنا دیا ہے۔ وہ شرک میں مبالغہ کرتے تھے لیکن وہ مختلف حالات اور واقعات میں توحید کی صراحت بھی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ (الزمر:۳)

ترجمہ: "ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لیے کہ یہ ہمیں اُس کا مقرب بنا دیں۔"

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ (العنکبوت:۶۱)

ترجمہ: "اور اے حبیب اگر آپ پوچھیں ان سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنا دیا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔"

وہ حقیقت میں مبالغہ نہیں کرتے تھے۔ انکار مطلوب اول تھا۔ لہٰذا صرف دلیل پر اکتفاء کیا۔ لہٰذا ان دونوں سورتوں میں زیادہ قسمیں نہیں اٹھائیں۔ بلکہ حضور ﷺ کی صداقت کے اثبات کے لیے قسم اٹھائی۔ آپ ﷺ کے رسول ہونے پر ایک سورت میں ایک قسم اٹھائی۔ فرمایا:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ ① مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ ② (النجم:۱،۲)

ترجمہ: "قسم ہے اس ستارے کی جب وہ نیچے اترا۔ تمہارا ساتھی نہ راہِ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا۔"

دوسری سورت میں دو قسمیں اٹھائیں۔ فرمایا:

وَالضُّحٰى ۙ ① وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ ② مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ ③ (الضحیٰ:۱تا۳)

ترجمہ: "قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی۔ جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے۔ نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہوا۔"

آپ ﷺ کی رسالت کے اثبات کے لیے اللہ تعالیٰ نے حروف اور قرآنِ کریم کی بہت سی قسمیں اٹھائیں ہیں۔ ارشاد فرمایا:

يٰسٓ ۚ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ ② اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ ③ (یٰسین:۱،۳)

ترجمہ: ''اے سید! قسم ہے قرآن حکیم کی۔ بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں۔''

ہم نے اس کی تفسیر میں یہ تذکرہ کیا ہے کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ قرآن مجید حضور ﷺ کے معجزات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم اٹھائی تاکہ قسم میں دلیل کی طرف اشارہ ہو جائے۔ جبکہ بقیہ سورتوں میں مقسم علیہ حشر اور جزاء ہیں تاکہ کفار کا انکار حد سے خارج ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ سورتوں میں جمع مؤنث سالم کی قسمیں اٹھائیں۔ جمع مذکر سالم کی قسم کسی سورت میں نہیں کھائی۔ ارشاد فرمایا: والصّٰفّٰت۔ (الصافات:۱) والذاریات۔ (الذاریات:۱) رب تعالیٰ یوں نہیں فرمایا: "والصالحین من عبادی" نہ ہی مقربین کی قسم اٹھائی حالانکہ مذکر مؤنث سے افضل ہوتا ہے۔ کیونکہ واؤ اور نون کے ساتھ جمع غالباً ذوالعقول کی ہوتی ہے۔

ہم نے یہ بھی تذکرہ کر دیا ہے کہ ان اشیاء کی قسمیں اٹھانا صرف ایک صورت میں ہوتا ہے جس میں امر ظاہر ہو۔ اور کفار کی طرف سے اعتراف (توحید) بھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن رسالت کے لیے معاملہ یوں نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس سورت میں اس کا حصول ہوتا ہے جس میں حروف اور قرآن پاک کی قسمیں اٹھائی جاتی ہیں۔ حشر اور جزاء کے اثبات کا حصول باقی رہا۔ لیکن حشر کا اثبات اس لیے ہے تاکہ صالح کو ثواب اور سرکش کو عذاب دیا جائے۔ اس کا فائدہ ذوالعقول کو ہوتا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ قسم ان کے علاوہ کسی اور چیز کی اٹھائی جائے۔ وہ سورتیں جن میں وحدانیت کے اثبات کے لیے قسمیں اٹھائی جاتی ہیں تو ان میں پہلے ساکنات کی قسمیں اٹھائیں۔ فرمایا: "والصافات" جبکہ بقیہ چار سورتوں میں متحرکات کی قسمیں اٹھائیں۔ فرمایا: "والذاریات، والمرسلات، والنازعات والنادیات" کیونکہ حشر میں جمع ہونا اور منتشر ہونا ہے۔ یہ حرکت کے زیادہ مناسب ہے۔ چار سورتوں میں ہواؤں کی قسمیں اٹھائیں جو کہ واضح ہے۔ یہ جمع ہوتی اور منتشر ہوتی ہیں۔ وہ ذاتِ والا صفات جو مختلف ہواؤں کے ذریعے بکھرے بادل کو اکٹھا کرنے پر قادر ہے وہ ان طریقوں میں سے کسی طریقہ سے متفرق اجزاء کو بھی جمع کرنے پر قادر ہے۔ جسے اس کی مشیت پسند کرے۔''

امام رازی نے ایک اور جگہ میں لکھا ہے: ''رب تعالیٰ نے نہ تو وحدانیت پر اور نہ ہی

نبوت پر زیادہ قسمیں اٹھائی ہیں۔سورۃ الصافات میں رب تعالیٰ نے وحدانیت پر قسم اٹھائی۔ نبوت پر اس سورت میں صرف ایک امر کے ساتھ قسم اٹھائی۔والضحیٰ میں دو امر کے ساتھ قسمیں اٹھائیں۔اللہ تعالیٰ کے یہ فرامین حشر کے بارے میں ہیں۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ﴿١﴾ (اللیل:۱)

ترجمہ:"قسم ہے رات کی جب وہ ہر چیز پر چھا جائے۔"

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ﴿١﴾ (الشمس:۱)

ترجمہ:"قسم ہے آفتاب کی اور اس کی دھوپ کی۔"

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿١﴾ (البروج:۱)

ترجمہ:"قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے۔"

یہ ساری قسمیں حشر کے بارے ہیں۔کیونکہ توحید کے دلائل کثیر ہیں۔یہ سارے عقلی ہیں۔ جیسے کہا گیا ہے:

و فی کل شی له آیة
تدل علی انه واحد

ترجمہ:"ہر چیز میں اس کے لیے ایک نشانی ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وہ واحد ہے۔"

اسی طرح نبوت کے بھی بہت سے دلائل ہیں۔یہ متواتر مشہور معجزات ہیں جبکہ حشر کا امکان عقل سے ثابت ہوتا ہے یہ ظاہر ہے۔لیکن اس کے وقوع کے امکان صرف سماعت سے ثابت ہوتا ہے۔اس کے بارے رب تعالیٰ نے بہت سی قسمیں اٹھائیں تا کہ انسان کو اس پر پورا یقین ہو سکے۔

النجم پر بحث

صاحب القاموس نے لکھا ہے:"المطلع میں ہے کہ طلوع ہونے والے ستارے کو النجم کہا جاتا ہے۔اس کی جمع انجم، انجام، نجوم اور نجم ہوتی ہے۔الثریا کہکشاں کو بھی النجم کہا جاتا ہے۔ایسی جڑی بوٹی کو بھی نجم کہا جاتا ہے جو تنے کے بغیر ہو۔اسی طرح مقررہ وقت کو بھی نجم کہا جاتا ہے۔

ابن عادل نے اللباب میں لکھا ہے "ستارے کو اس کے طلوع کی وجہ سے النجم کہا جاتا ہے۔ طلوع ہونے والے ہر ستارے کو نجم کہا جاتا ہے اسی طرح "نجم السن والقرن والنبت" کہا جاتا ہے۔ امام قرطبی نے یہ اضافہ کیا ہے۔ نجم فلان ببلد فلاں نے سلطان کے خلاف بغاوت کی ہے۔

ابن القیم نے لکھا ہے "لوگوں میں اختلاف ہے کہ نجم سے کیا مراد ہے؟ حلبی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد قرآن پاک کی قسم اٹھانا ہے کیونکہ وہ تھوڑا تھوڑا حضور ﷺ پر اترا تھا۔ کبھی تین آیات اور کبھی چار آیات اور کبھی ایک سورت اترتی تھی۔ اس طرح بیس سال میں مکمل نازل ہوا۔ یہ عطاء، مقاتل، ضحاک، مجاہد اور فراء کا قول ہے۔ اس قول کے مطابق ھُوِیّ سے مراد بلندی سے نیچے نزول ہوگا۔ اس اعتبار سے قرآن پاک کو اس لیے نجم کہا جاتا ہے کیونکہ یہ متفرق طور پر نازل ہوا۔ اہلِ عرب تفرق کو تنجم اور متفرق کو منتجم کہا کرتے ہیں۔ نجوم الکتابت سے مراد اس کی اقساط ہیں۔ کہا جاتا ہے "جعلت مالی علی فلان نجوما منجّمة کل نجم کذا و کذا" اس سے مراد قرض کی اقساط ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اہلِ عرب نے چاند کی منازل کے مطالع مقرر کیے ہوئے تھے۔ پھر قرض کے لیے اپنی اقساط کو ان کے مطابق مقرر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے "جب ثریا ستارہ طلوع ہوگیا تو تم پر یہ حلال ہے۔" پھر ہر ہر قسط کو متفرق کر دیا جاتا۔ خواہ اسے طلوعِ نجم کے ساتھ مختص نہ بھی کیا جائے۔"

امام رازی نے لکھا ہے "اس قسم میں حضور ﷺ کے معجزات کے بارے استدلال ہے آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے۔ یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے۔

یٰسٓ ۝۱ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ۝۲ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝۳ (یٰسین: ۱ تا ۳)

ترجمہ: "اے سید! قسم ہے قرآن حکیم کی بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں یقیناً آپ راہِ راست پر ہیں۔"

علی بن ابی طلحہ اور عطیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد ثریا ستارہ ہے۔ جب وہ گرے اور غائب ہو جائے۔ اس صورت میں ھَوٰیٰ کا معنی اس کا غائب ہونا ہوگا۔ یہ مجاہد سے دوسری

روایت ہے۔ اہلِ عرب نجم بول کر ثریا مراد لیتے تھے۔ شاعر نے کہا:

اذا طلع النجم عشاء

ابتغی الراعی کساء

ترجمہ: "جب عشاء کے وقت ثریا ستارہ طلوع ہوا تو نگران نے چادر کا تقاضا کیا۔"

حدیث پاک ہے: "جب بھی نجم (ثریا) طلوع ہو اور زمین میں کوئی وباء ہو تو اسے اٹھا لیا جاتا ہے۔" (امام احمد)

اس قول کو ابنِ جریر اور زمخشری نے پسند کیا ہے۔ سمین نے کہا ہے "یہ صحیح مؤقف ہے کیونکہ یہ غلبہ کی وجہ سے علَم بن گیا ہے۔ عمر بن ابی ربیعہ کا شعر ہے:

احسن النجم فی السماء الثریا

والثریا فی الارض زین النساء

ترجمہ: "آسمان کا سب سے خوبصورت ستارہ ثریا ہے۔ اور زمین میں ثریا عورتوں کے لیے زینت ہے۔"

امام رازی نے لکھا ہے "اس قول کی مناسبت یہ ہے کہ دیکھنے والے کو ثریا ستارہ سب سے واضح نظر آتا ہے کیونکہ اس کی علامت ہوتی ہے۔ یہ کسی اور ستارے کے ساتھ ملتبس نہیں ہوتا۔ ہر ایک کے لیے عیاں ہوتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کی ذاتِ والا بھی واضح معجزات کی وجہ سے ہر ایک سے ممتاز ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم اٹھائی۔ جب ثریا ستارہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو پھل چننے کا موسم قریب آجاتا ہے۔ جب یہ سردی یا گرمی میں طلوع ہوتا ہے تو امراض ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب آپ ﷺ کا ظہور ہوا تو شک اور امراضِ قلبیہ کم ہو گئیں۔ حکمت کے پھل چنے جانے لگے۔

ابو حمزہ اور ثمالی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد ستارے ہیں جو روزِ حشر بکھر جائیں گے۔ یا اس سے مراد الشعراء ستارہ ہے۔ یا اس سے مراد "الزہرہ" ستارہ ہے۔ الاخفش نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ جڑی بوٹی ہے جس کا تنا نہیں ہوتا جیسے کہ ارشادِ پاک ہے:

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ﴿٦﴾ (الرحمٰن:٦)

ترجمہ: ''اور آسمان کے تارے اور (زمین) کے درخت اسی کو سجدہ کناں ہیں۔''

اس صورت میں ھویٰ سے مراد اس کا گرنا ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے: ''اس سے مراد قوی جسمانیہ کی نشوونما اور ان کی اصلاح ہے۔ قوت عقلیہ اصلاح کی زیادہ مستحق ہے۔ یہ اصلاح رسلانِ عظام سے ہی ممکن ہے۔ اس سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ پسندیدہ موقف یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ستارہ ہے جو آسمان پر ہوتا ہے کیونکہ سامع کے لیے یہ امر عیاں ہے۔ "اذا ھوی" اسی پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اس سے مراد قرآن پاک اور پھر ثریا مراد ہے۔'' حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ والا صفات ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شبِ معراج کو واپس تشریف لائے۔ ھویٰ سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واپس تشریف لانا ہے۔''

صاحب السراج رقم طراز ہیں۔ ''اس تفسیر نے مجھے تعجب میں ڈالا۔ کیونکہ یہ تفسیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کئی وجوھات کی بناء پر مطابقت رکھتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نجم ہدایت ہیں۔ اس رات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز فرض ہوئی۔ دین میں نماز کے ارفع مقام سے تم آگاہ ہو۔ آپ رات کے وقت آسمان اور زمین میں تاباں ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہائی سرعت کے ساتھ تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے وقت تشریف لے گئے۔ یہ تارے کے طلوع ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ صاحبِ بصارت پر یہ امور مخفی نہیں ہیں۔ لیکن اربابِ بصیرت ان میں شک نہیں کرتے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ''

مجاہد سے روایت ہے کہ اس سے آسمان کے سارے ستارے مراد ہیں۔ ابوعبیدہ نے اس قول کو یقین کے ساتھ کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ واحد بول کر جمع مراد لیا گیا ہے۔ جیسے شاعر کہتا ہے:

فبانت تعد النجم فی مستحیرۃٍ۔ اس مصرعہ میں النجم بمعنی النجوم ہے۔ ایک وجہ یہ ہے لیکن میں اہلِ تاویل میں سے کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ قول کیا ہو''۔ لیکن میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ حضرت مجاہد سے منقول یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ اسے علامہ ماوردی نے حسن سے بھی نقل کیا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں۔ ان کے مابین مناسبت یہ ہے کہ تاروں

سے راہ نمائی حاصل کی جاتی ہے۔ اسی مناسبت اور مشابہت کی وجہ سے ان کی قسم اٹھائی گئی۔ حضرت عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے "ان سے مراد وہ ستارے ہیں جو شیاطین کو اس وقت مارے جاتے ہیں جب وہ چوری چھپے خبریں سننے جاتے ہیں۔ یہ علامہ ماوردی کا قول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ رب العزت نے اپنے نبی کریم ﷺ کو رسول بنا کر مبعوث کرنا چاہا تو آپ ﷺ کی ولادت سے قبل بہت سے ستارے ٹوٹنے لگے۔ ان کی وجہ سے اکثر اہلِ عرب گھبرا گئے۔ وہ کاہن کے پاس گئے۔ وہ انہیں حوادثات کے بارے بتاتا تھا۔ انہوں نے اس سے ان کے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا: "ذرا بارہ برجوں کو دیکھو۔ اگر ان میں ستارے ٹوٹ رہے ہیں تو دنیا کی تباہی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اگر ان میں سے نہیں ٹوٹ رہے تو عنقریب ایک عظیم امر رونما ہوگا۔ اس کو تلاش کرو۔ جب حضور اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو یہی وہ امر عظیم تھا اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝۱

ترجمہ: "قسم ہے اس تابندہ ستارے کی جب وہ نیچے اترا۔"

امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ شہاب باری شیاطین کو اہلِ آسمان سے دور کرتے ہیں۔ جبکہ انبیائے کرام علیہم السلام اہلِ زمین سے شیاطین کو دور کرتے ہیں۔"

ابن قیم نے لکھا ہے "حضرت ابن عباس سے منقول روایت سارے اقوال سے اظہر ہے۔ رب تعالیٰ نے اس ظاہری اور واضح نشانی کی قسم اٹھائی جسے بطور علامت مقرر فرمایا۔ اس کے ذریعہ اپنی وحی کی حفاظت کی تاکہ شیاطین اسے چوری چھپے نہ سن سکیں۔ یہ اس امر پر دلیل ہے کہ حضور اکرم ﷺ جو کچھ لے کر تشریف لائے ہیں وہ حق ہے۔ وہ سچ ہے۔ شیاطین کو اس کی طرف کوئی راہ نہیں۔ بلکہ ستاروں کے ذریعے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اس موقف کے مطابق مقسم بہ اور مقسم علیہ میں بہت زیادہ ربط پایا جاتا ہے۔ مقسم بہ میں مقسم علیہ کے لیے دلیل ہے۔ وہ ستارے جو شیاطین کو مارے جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔ جس سے وہ اپنے دین اور وحی کی حفاظت کرتا ہے۔ ان آیات کی حفاظت کرتا ہے جو وہ اپنے رسلانِ عظام پر نازل کرتا ہے اس سے اس کا دین حق، شریعتِ مطہرہ،

اسماء مبارکہ اور صفاتِ مطہرہ کا اظہار ہوتا ہے۔ ان ستاروں کو جو نظر آتے ہیں انہیں ہدایت دینے والے ستاروں کے لیے نگران اور خدمت گزار بنایا گیا۔ نزولِ قرآن کے وقت اسے نجم کہنا واضح نہیں۔ نہ ہی اس کے نزول کو ھویٰ کہنا درست ہے۔ نہ ہی قرآن پاک میں ایسا کچھ تذکرہ ہے کہ اس لفظ کو اس معنی پر محمول کیا جائے۔ نہ ہی یہ معنی واضح ہے کہ اس قسم کو ثریا کے ساتھ مختص کیا جائے جب وہ غائب ہو جائے۔ نہ ہی یہ معنی واضح ہے کہ اس سے مراد روزِ حشر ستارے کا ٹوٹ جانا ہے۔ بلکہ یہ ایسا امر ہے جس پر اللہ تعالیٰ قسم اٹھاتا ہے۔ اپنی نشانیوں سے ان کی طرف راہ نمائی کرتا ہے وہ اس چیز کے عدمِ ظہور کی وجہ سے مخاطبین کے لیے دلیل نہیں بناتا۔ خصوصاً جبکہ مخاطبین روزِ قیامت کے منکر ہوں۔ رب تعالیٰ ایسی چیز سے استدلال فرماتا ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی مخالفت ممکن ہو۔ اس لیے ابن کثیر اور حسن کا موقف ظاہر ہے۔

ھَوٰی کی وضاحت

سمین نے لکھا ہے: "اذا میں عامل یا تو محذوف فعل قسم ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی۔ اقسم بالنجم وقت ھویہٖ" لیکن ابو البقاء وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ مشکل ہے۔ فعل قسم انشاء ہے۔ انشاء حال ہے۔ جبکہ "اذا" مستقبل پر دلالت کرتا ہے۔ یہ باہم کیسے مل سکتے ہیں؟ طیبی نے المقبس سے نقل کیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب "اذا" سے مستقبل کا معنی لیا جائے تو صرف وقت کے لیے رہ جاتا ہے۔ جسے آتیك اذا احمرّ البسر "یعنی میں تمہارے پاس اس وقت آؤں گا جب کھجوریں سرخ ہو جائیں گی۔ اس سے استقبال کا معنی لے لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اس سے غیب ہونے کا وقت ہے" شیخ عبدالقاہر نے لکھا ہے، جب رب تعالیٰ نے کسی متوقع امر کی خبر دی ہو تو وہ خبر واقع کی مانند ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں تکلف نہیں ہوتا۔ مستقبل محقق ماضی کی طرح ہوتا ہے۔ سمین نے لکھا ہے "یا یہ مقدر ہوگا۔ یہ نجم سے حال ہوگا کیونکہ اس کی اس حالت کی قسم اٹھائی گئی ہے۔ جب وہ گر رہا ہو۔ لیکن اس میں دو اعتبار سے مشکل ہے۔

◆ نجم ایک جسم ہے۔ زمانہ اس سے حال نہیں بن سکتا۔ جیسے کہ اس کی خبر نہیں بن سکتا۔
◆ اذا مستقبل کے لیے ہوتا ہے وہ حال کیسے ہو سکتا ہے؟

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نجم سے مراد قرآن پاک کا ایک حصہ ہے۔ قرآن پاک بیس سال میں نازل ہوا۔ یہ حضرت ابن عباس وغیرہ کی تفسیر ہے۔ دوسرے کا جواب یہ ہے کہ یہ مقدرہ حال ہے۔ اس کا عامل نجم کا وہ وجود ہے جو قرآن پاک کی مراد ہے۔ یہ ابوالبقاء کا نظریہ ہے۔ لیکن اس میں اعتراض کی گنجائش ہے۔ کیونکہ قرآن پاک ظرف میں عمل نہیں کرتا۔ جب اس سے مراد یہ ہو کہ یہ اس مخصوص کتاب کا علم ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ نجم منجم کے معنی میں ہے۔ گویا کہ یوں کہا گیا: "القرآن المنجّم فی هذا الوقت"

المصباح میں ہے "هَوَی یَهوِی باب ضرب یضرب سے ہے۔ هُوَیًا اس کا مصدر ہے ابن القوطیہ نے هوائٍ مصدر کا اضافہ کیا ہے۔ اس کا معنی ہے بلندی سے نیچے آنا۔ شاعر نے کہا ہے:

فشبح بها الا ما عز وهو تهوی
هُوِی الدلو اسلمها الرشاء

هُوِیّ کو فتحہ اور ضمہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔

امام راغب نے لکھا ہے: "الهوی کا معنی ہے بلندی سے گرنا۔" پھر لکھا ہے الهُوِیّ کا معنی ہے نیچے گرنا جبکہ الهَوِیّ کا معنی ہے بلندی کی طرف جانا۔ ایک قول یہ ہے لغت میں هوی کا مقصد ہمیشہ نیچے کی طرف ہوتا ہے اگر وہ قصد نہ کرے۔ اہلِ لغت نے لکھا ہے هَوی یهوِی هویًّا کا معنی ہے بلندی سے گرنا۔ جبکہ هوی یهْوِی هویً کا معنی ہے بلند ہونا۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس میں هوی اور انهوی دو لغتیں ہیں ان کا معنی ایک ہی ہے۔ شاعر نے ان دونوں کو اس شعر میں جمع کیا ہے۔

ولم منزل لو لای طحت کما هوی
باجرامه من فلة النیق منهوی

امام رازی نے لکھا ہے کہ اس قسم میں ستارے کو اس کیفیت سے مقید اس لیے کیا ہے کیونکہ وہ جب وسطِ آسمان میں ہوتا ہے۔ وہ زمین سے دور ہوتا ہے۔ سفر کرنے والا اس

سے راہ نمائی نہیں حاصل کرسکتا کیونکہ وہ اس سے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کا علم نہیں حاصل کرسکتا۔ جب یہ نیچے آتا ہے تو جوانب کا تعین ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ بھی اسی وصف سے متصف ہیں۔ آپ ﷺ نے اہلِ ایمان کے لیے رحمت کے پر نیچے کیے۔ آپ ﷺ خلق عظیم پر فائز ہیں۔ پھر ستارہ کو ھویٰ کے ساتھ مختص کیا طلوع کے ساتھ مختص نہ کیا کیونکہ اس سے دینوی اور دنیاوی ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ دینوی راہ نمائی کا تو تذکرہ ہو چکا ہے جہاں تک دینی راہ نمائی کا تعلق ہے تو جیسے کہ حضرت خلیل علیہ السلام نے فرمایا تھا:

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ (الانعام:۷۶)

ترجمہ: ''میں پسند نہیں کرتا ڈوب جانے والوں کو۔''

اس میں ایک لطیف نکتہ بھی ہے وہ یہ ہے کہ نجم کی قسم اٹھانا اس کی تعظیم کا تقاضا کرتا ہے۔ بعض مشرکین ستاروں کی پوجا بھی کرتے تھے۔ رب تعالیٰ نے اس کے رو بہ زوال ہونے کے بارے آگاہ کر دیا کہ یہ الٰہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۞ (النجم:۲)

سمین نے لکھا ہے کہ یہ جواب قسم ہے۔ امام رازی اور برہان النسفی نے لکھا ہے کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ ہم ضلال اور غیّ میں فرق نہیں کرتے۔ بعض نے لکھا ہے کہ ضلال ھدی کے مقابلہ میں ہوتا ہے جبکہ غی، رشد کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ (الاعراف:۱۴۶)

ترجمہ: ''اور اگر دیکھ لیں تمام نشانیوں کو تو بھی نہ ایمان لے آئیں ان پر۔ اور دیکھ بھی لیں راہِ ہدایت تو بھی نہ بنائیں اپنا راستہ۔''

تحقیق یہ ہے کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ ضلال کا مختلف مقامات پر اعم استعمال ہے۔ جیسے تم کہتے ہو: ''ضلّ بعیری و رحلی'' لیکن تم غویٰ نہیں کہہ سکتے۔ ضلال سے مراد یہ ہے کہ راہ رو اپنی منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ نہ پا سکے۔ جب کہ غوایت یہ ہے کہ اس کی

منزل کا سیدھا راستہ نہ ہو۔اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ جو مؤمن صحیح راستہ پر نہ ہو تم اسے اِنَّ سعیۂ غیر رشد تو کہہ سکتے ہو۔لیکن انہ ضالّ نہیں کہہ سکتے۔کیونکہ ضالّ کافر کی طرح ہوتا ہے۔غاوی فاسق کی طرح ہوتا ہے۔گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: مَا ضَلَّ یعنی مَا کَفَرَ۔ یہ آیت طیبہ ہماری دلیل ہے۔

فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا۔ (النساء:٦)

ترجمہ:''پس اگر محسوس کرو تم ان سے دانائی۔''

یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ الضلال عدم کی طرح ہے۔جبکہ غوایت درجہ اور مرتبہ میں فاسد وجود کی طرح ہے۔یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ''مَا جَنَّ'' کے معنی میں ہو۔مجنون ''ضالٌّ'' ہوتا ہے۔یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان عالی شان کی طرح ہے:

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ (القلم:٢،٣)

ترجمہ:''آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔اور یقیناً آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا''

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ گمراہ نہیں بلکہ ہدایت یافتہ ہیں بلکہ آپ ﷺ ایسے مرشد کریم ﷺ ہیں جو حریم ناز کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ارشاد فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم:٤)

ترجمہ:''اور بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں۔''

یہ اس جگہ اس فرمان کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ (النجم:٣)

ترجمہ:''اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔''

یہ بھی خلق عظیم ہے۔رب تعالیٰ نے مَا ضَلَّ سے یہ اشارہ کر دیا کہ آپ ﷺ ایک راستہ پر گامزن ہیں۔مَا غَوٰی سے اشارہ کیا کہ آپ ﷺ صراطِ مستقیم پر ہیں۔ ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى'' سے یہ اشارہ فرما دیا کہ یہ راستہ ایک وسیع شاہراہ ہے۔آپ اسی شاہراہ پر گامزن ہیں۔آپ ﷺ اس کے وسط میں رواں دواں ہیں۔یہ راستہ منزل مقصود تک جلد پہنچا دیتا

ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ رب تعالیٰ کا فرمان وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نہ گمراہ ہوئے نہ ہی راہ راست سے بھٹکے۔ وہ گمراہ کیسے ہو سکتا ہے اور وہ راہِ راست سے کیسے بھٹک سکتا ہے جو اپنی خواہش سے گویاں بھی نہیں ہوتا؟ گمراہ تو وہ ہوتا ہے جو اپنی نفسانی خواہشات پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (ص:۲۶)

ترجمہ: ”اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی وہ بہکا دے گی تمہیں راہِ خدا سے۔“

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ ماغوٰی کا معنی ہے کہ آپ نے نقصان نہ اٹھایا۔ شاعر نے کہا ہے:

فمن يلق خيرا يحمد الناس امره
و من يغو لا يعدم على الغي لأ لما

ترجمہ: ”جو بھلائی سے ملاقات کرتا ہے لوگ اس کے معاملہ کی تعریف کرتے ہیں۔ جو اس کی جستجو میں نقصان اٹھاتا ہے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں۔“

پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ خبر وحی کے بعد کی ہو۔ یہ بھی روا ہے کہ یہ خبر آپ ﷺ کے عام احوال کی ہو۔ یعنی آپ ہمیشہ سے توحید الٰہی کا اقرار کرنے والے تھے۔ یہی موقف صحیح ہے۔

ابن القیم نے لکھا ہے ”اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ کریم ﷺ سے اس ضلال کی نفی فرما دی جو ہدایت کے منافی ہے اور اس غی کی بھی نفی فرما دی جو رشد کے منافی ہے۔ یہ نفی اپنے ضمن میں یہ گواہی لیے ہوئے ہے کہ آپ ﷺ ہدایت اور رشد پر ہیں۔ ہدایت آپ ﷺ کے علم مبارک اور رشد آپ ﷺ کے عمل مبارک میں ہے۔ یہ دونوں اصل ہیں جو بندے کے کمال کی غایت ہیں۔ یہ بندے کی سعادت اور اصلاح ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے خلفاءِ راشدین کو اسی وصف سے یاد فرمایا ہے۔ فرمایا: تم پر لازم ہے کہ تم میری اور میرے بعد خلفاءِ راشدین مہدیین کی سنت کی اتباع کرو۔“

راشد، غاوی کی ضد ہے۔ مہدی، ضال کی ضد ہے۔ اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس نے علم نافع اور عمل صالح سے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہو وہ ہدایت والا ہوتا ہے۔ دین حق پر

گامزن ہوتا ہے۔ ہدایت یافتہ اور راشد کو وہی شخص ضال اور غاوی کہہ سکتا ہے جو ساری مخلوق سے جاہل ہو۔ اس کا دل سارے دلوں سے اندھا ہو۔ وہ حقیقت انسانیۃ سے سب سے زیادہ دور ہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وما انتفاع اخی الدنیا بناظرہ
اذا استوت عندہ الانوار والظلم

ترجمہ: "میرے بھائی نے اس دنیا کو دیکھ کر کیا نفع حاصل کیا جب اس کے نزدیک انوار اور ظلم برابر ہوں۔"

لوگوں کی چار اقسام ہیں:

1. اپنے علم میں ضال، اپنے قصد اور عمل میں گمراہ۔ یہ سارے لوگوں سے سیاہ دل ہوتے ہیں۔ یہی رسلانِ عظام ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں۔
2. علم میں ہدایت یافتہ، منزل اور عمل میں گمراہ۔ یہ امت میں سے گمراہ لوگ ہوتے ہیں۔ ہر اس شخص کی یہی حالت ہوتی ہے جو حق کو جانتا ہے لیکن اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔
3. اپنے علم میں گمراہ۔ لیکن اس کا مقصد بھلائی ہوتا ہے لیکن اس کا شعور نہیں ہوتا۔
4. علم میں ہدایت یافتہ اپنے مقصد میں راشد۔ یہ وہ بلند نصیب لوگ ہوتے ہیں جو انبیائے کرام علیہم السلام کے ورثاء ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد قلیل ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام و منصب بہت بلند ہوتا ہے۔ وہ رب تعالیٰ کی مخلوق میں سے برگزیدہ ہوتے ہیں۔

ذرا غور کرو رب تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ" اس کی جگہ آپ ﷺ کے اسم گرامی کا تذکرہ نہ فرمایا، تاکہ کفار پر دلیل قائم ہو سکے کہ آپ ﷺ ان کے عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ وہ آپ ﷺ کے حالات، اقوال اور اعمال سب لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں وہ آپ ﷺ کو کسی کذب، گمراہی یا ضلالت کی وجہ سے نہیں جانتے۔ وہ کسی ایک نازیبا بات پر بھی آپ ﷺ کو ملامت نہیں کر سکتے۔ رب تعالیٰ نے اپنے اس فرمان سے اسی طرح اشارہ کیا ہے:

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ۔ (المؤمنین:٦٩)

ترجمہ: ''یا انہوں نے اپنے رسول مکرم کو نہ پہچانا تھا۔''

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ﴿۲۲﴾ (التکویر: ۲۲)

ترجمہ: ''اور تمہارا ساتھی کوئی مجنون تو نہیں۔''

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم: ۳)

اللہ رب العزت نے پہلے "مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى" ماضی سے تعبیر فرمایا۔ اب مضارع کا صیغہ ذکر فرمایا۔ یہ انتہائی عمدہ ترتیب ہے۔ یعنی اے مشرکین مکہ! جب آپ ﷺ نے تمہیں چھوڑا۔ تمہارے معبودانِ باطلہ سے رخ انور موڑا۔ آپ ﷺ خلوت گزیں ہوئے تو آپ ﷺ گمراہ نہیں ہوئے۔ جب اب آپ مبعوث ہو چکے ہیں۔ اور آپ ﷺ کو تم پر گواہ مقرر کیا جا چکا ہے تو اب آپ ﷺ اپنی خواہش سے بولتے بھی نہیں۔ آپ ﷺ نہ تو پہلے ضال اور غاوی تھے اب تو آپ ﷺ گمراہی سے بچانے والے مرشدِ کریم اور ھادی ﷺ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس ہستیٔ پاک کو کفر اور عیوب سے بچپن میں بچا لیتا ہے جسے وہ اپنا رسول بنا کر مبعوث کرنا چاہتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''آپ ﷺ معصوم بچپن میں بھی گمراہ نہ ہوئے کیونکہ آپ ﷺ اپنی خواہش سے بولتے بھی نہیں۔ ابن عادل نے لکھا ہے کہ ینطق میں فاعل یا تو وہ ضمیر ہے جو حضور اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے یا یہ ضمیر قرآنِ پاک کے لیے ہے۔ جیسے کہ ارشادِ باری ہے:

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ط (الجاثیہ: ۲۹)

ترجمہ: ''یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ۔''

ابن قیم نے لکھا ہے ''اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ کریم ﷺ کی گفتگو کو اس امر سے منزہ فرما دیا ہے کہ وہ خواہشات سے نکلے۔ اس کمال کی آپ ﷺ کو ہدایت عطا فرمائی۔ آپ ﷺ کے بارے اس نے یوں نہ فرمایا: "وما ینطق بالھوٰی" کیونکہ عن الھوٰی سے آپ ﷺ کی نفی زیادہ ابلغ ہے یہ امر اس بات کو متضمن ہے کہ آپ ﷺ سے گفتگو آپ کی خواہش

سے نکلتی ہی نہیں۔ جب یہ کیفیت ہے تو پھر آپ ﷺ اس کے ساتھ گفتگو کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ دو امور کی نفی کو متضمن ہے:

1. گفتگو کے صدور سے ھوٰی (خواہشات) کی نفی۔
2. اپنی طرف سے گفتگو کرنے کی نفی۔

آپ ﷺ حق کے ساتھ گفتگو فرماتے ہیں۔ اس کا منبع ہدایت اور رشد ہے۔ گمراہی اور غوایت اس کا مصدر نہیں ہے۔

اللباب میں ہے کہ نحاس نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ نے کہا کہ اس جگہ "عن" ہونا ہی بہتر ہے۔ یعنی آپ ﷺ کی گفتگو آپ ﷺ کی رائے سے نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ رب تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ﴿۴﴾ (النجم:۴)

ترجمہ: "نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔"

ایک قول یہ ہے کہ یہ باء کے معنی میں ہے۔ یعنی آپ ﷺ باطل کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار کہتے تھے: "محمد عربی ﷺ اپنی جانب سے قرآن گھڑ لیتے ہیں۔" المصباح میں ہے کہ ھوٰی، ھویتہ کا مصدر ہے۔ اس کا معنی کسی سے محبت اور پیار کرنا ہے۔ پھر اس کا اطلاق نفس کے میلان اور کسی چیز سے اس کے انحراف پر ہونے لگا۔ پھر مذموم میلان پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ کہا جاتا ہے: "اتبع ھواہ"

امام بیہقی نے لکھا ہے کہ ھوٰی کی تفسیر میں سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس سے مراد محبت ہے۔ لیکن نفس کی طرف سے ھویۃ کا معنی احببتہٗ ہے۔ ھوٰی کے الفاظ قرب، نزول اور سقوط پر دلالت کرتے ہیں۔ اس سے ھاویہ ہے جب نفس خسیس ہو وہ رفعتوں کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ غلیظ اشیاء سے پیار کرنے لگتا ہے۔ اس لیے ھوٰی کو نفس امارہ کے ساتھ مختص کر دیا گیا ہے۔"

امام شعبی نے لکھا ہے کہ ھوٰی کو ھوٰی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے صاحب کو گرا دیتی ہے۔ بعض حکماء نے کہا ہے کہ ھوی ایک معبود ہے۔ جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس کا

ایک شدید شیطان ہے۔ سرکش شیطان اس کی خدمت کرتا ہے۔ جو اس کے بت کی پوجا کرتا ہے یا اس کے شیطان کی اتباع کرتا ہے رب تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ رب تعالیٰ کی طرف سے اسے ہدایت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے گناہوں میں مستغرق ہو جاتا ہے۔

اللہ رب العزت نے فرمایا:

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾ (الجاثیہ: ۲۳)

ترجمہ: ”ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنا لیا اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اس نے اسے باوجود علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ پس کون ہدایت دے سکتا ہے اسے اس کے بعد کیا تم غور نہیں کرتے۔“

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۰﴾ (القصص: ۵۰)

ترجمہ: ”اور کون زیادہ گمراہ ہے۔ اس سے جو پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی رہنمائی کے بغیر بے شک اللہ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔“

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”تین اشیاء نجات دینے والی اور تین اشیاء ہلاک کرنے والی ہیں۔ نجات دلانے والی اشیاء یہ ہیں:

1. اعلانیہ اور پوشیدہ رب تعالیٰ سے ڈرنا۔
2. رضا اور غضب میں عدل کرنا۔
3. فقر اور غنی میں میانہ روی اختیار کرنا۔

ہلاکت میں ڈالنے والی اشیاء درج ذیل ہیں:

1. ایسا طمع جس کی اتباع کی جائے۔
2. ایسی خواہشات جن کی اتباع کی جائے۔

◆ انسان کا اپنی رائے کو عجیب سمجھنا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”آسمان کے نیچے کوئی ایسا معبود باطل نہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کی پوجا کی جاتی ہو۔ جو رب تعالیٰ کے ہاں اس خواہش سے بڑا ہو جس کی اتباع کی جائے۔“ بعض حکماء نے لکھا ہے کہ خواہشات عقلوں کو دھوکا دینے والی اور سیدھے راستہ سے پھیرنے والی ہیں۔ یہ اپنے صاحب کو صحیح سے بیمار اور واضح سے خلل والی چیز کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ اندھی ہوتی ہیں مگر دیکھ لیتی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ بہری ہوتی ہیں مگر سن لیتی ہیں۔ جیسے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ”کسی چیز کی محبت تمہیں اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔“ ایک اور عارف نے کہا ہے: ”عقل کی بصیرت کے مطابق انسان اشیاء کو دیکھتا ہے۔ جس کی عقل خواہشات نفسانیہ سے سلامت ہو وہ اشیاء کو ان کی حقیقت پر دیکھ لیتا ہے۔ گندا اور وہ نفس جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے وہ اپنی طبیعت کے مطابق اشیاء کو دیکھتا ہے۔“ ایک حکیم کی انگوٹھی میں یہ لکھا ہوا تھا ”جس کی عقل پر خواہشات کا غلبہ ہو گیا وہ نادم ہوا۔“ ابن درید نے اپنی مقصورات میں لکھا ہے:

و آفة العقل الهوى فمن علا
على هواه عقله فقد نجا

ترجمہ: ”خواہشاتِ نفسانیہ عقل کے لیے آفت ہے۔ جس کی عقل خواہشات پر غالب آ گئی وہ نجات پا گیا۔“

اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۝۴ (النجم: ۴)

امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ بیان کے لیے تکملہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب رب تعالیٰ نے فرمایا: ”وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ۝۳“ تو گویا کہ کہنے والے نے کہا ”پھر آپ ﷺ کیسے گفتگو کرتے ہیں؟ کیا دلیل اور اجتہاد سے گفتگو کرتے ہیں؟“ فرمایا: ”نہیں! یہ حریمِ ناز سے آنے والی وحی کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ یہ کلام ”هو وحی یوحٰی“ سے زیادہ بلیغ ہے۔ ”اِنۡ“ مانفی کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح ماشرطیہ اِن کے معنی میں

استعمال ہوتا رہتا ہے۔

اللباب میں ہے "یُوحیٰ وحی" کی صفت ہے۔ اس صفت کو استعمال کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ مجاز کی نفی کرتا ہے۔ یعنی وہ حقیقت میں وحی ہے صرف نام کی وحی نہیں۔ یہ اس قول کی طرح ہے "ھذا قول یقال" ایک قول یہ ہے کہ اصل عبارت یوں تھی: "یُوحیٰ الیہ" اس میں مزید فائدہ ہے۔ امام قرطبی نے سجستانی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا اگر تم چاہو تو اس آیت کو "مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ" کا بدل بنا لو۔ ابن الانباری نے لکھا ہے "یہ غلط ہے کیونکہ ان خفیفہ "ما" کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تم یوں نہیں کہہ سکتے: "واللہ ما قمت ان انا تصاعد"

ابن القیم نے لکھا ہے: "ضمیر اس مصدر کی طرف راجع ہے جو فعل سے سمجھا جاتا ہے یعنی "ما نطقہ الا وحی یوحی" یہ قول اس شخص کے قول سے عمدہ ہے جس نے کہا ہے کہ یہ ضمیر قرآن مجید کی طرف راجع ہے۔ یہ فرمان آپ ﷺ کے قرآن مجید اور سنت مطہرہ کے بارے گفتگو کرنے کو عام ہے۔ کیونکہ یہ دونوں وحی ہیں۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (النساء: ۱۱۳)

ترجمہ: "اور اتاری ہے اس نے آپ پر کتاب اور حکمت۔"

ان سے مراد قرآن پاک اور سنتِ مطہرہ ہیں۔ دارمی نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ پر سنت مطہرہ لے کر اسی طرح اترتے تھے جس طرح قرآن مجید لے کر آتے تھے۔" میں کہتا ہوں کہ امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ جعرانہ کے مقام پر تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے عرض کی: "یا رسول اللہ! اس شخص کے بارے آپ ﷺ کی رائے کیا ہے۔ جس نے خوشبو لگانے کے بعد عمرہ کا احرام باندھا۔" حضور نبی کریم ﷺ نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا پھر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ آپ ﷺ پر وحی آ گئی جب یہ کیفیت جدا ہوئی تو پوچھا: "سوال کرنے والا کہاں ہے؟" اسے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: "اپنا جبہ اتار دو۔ خوشبو کے اثرات دھو ڈالو۔ اپنے عمرہ میں اسی طرح کرو جس طرح اپنے حج میں کرتے ہو۔"

امام احمد اور امام ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''میں ہر وہ چیز لکھ لیتا تھا جو حضور اکرم ﷺ سے سماعت کرتا تھا۔ میں اسے یاد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قریش نے مجھے روک دیا۔'' انہوں نے مجھے کہا: ''تم ہر وہ چیز لکھ لیتے ہو جو حضور ﷺ سے سنتے ہو۔ آپ ﷺ بشر (کامل) ہیں۔ آپ ﷺ رضا اور غصہ کے عالم میں بھی گفتگو فرماتے ہیں۔'' میں لکھنے سے رک گیا۔ حتیٰ کہ اس کا تذکرہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنی مبارک انگلی سے اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کیا۔ فرمایا: ''لکھا کرو۔ مجھے اس ذاتِ والا کی قسم جس کے دستِ تصرف میں میری جان ہے۔ مجھ سے صرف حق ہی نکلتا ہے۔''

امام احمد نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور سید المرسلین ﷺ نے فرمایا: ''میں صرف حق بات ہی کرتا ہوں۔'' بعض صحابہ کرام نے عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ ہمارے ساتھ خوش طبعی بھی کرتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں صرف حق بات ہی کرتا ہوں۔''

امام احمد، امام طبرانی اور ضیاء نے اپنی صحیح میں حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص کی شفاعت سے دو قبیلوں یا ربیعہ اور مضر میں سے ایک قبیلہ جتنے لوگ جنت میں جائیں گے۔'' ایک شخص نے عرض کی: ''یارسول اللہ! یہ ربیعہ اور مضر کیا ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں وہی کچھ کہتا ہوں جو کچھ مجھے کہنے کے لیے کہا جاتا ہے۔''

امام رازی نے لکھا ہے: ''ھو یا تو معلوم ضمیر ہے یا مذکور ضمیر ہے۔ اس میں دو وجوہات ہیں۔ ان میں سے مشہور یہ ہے کہ یہ معلوم ضمیر ہے۔ اس سے مراد قرآن حکیم ہے گویا کہ فرمایا: "ما القرآن الا وحی" یہ اس شخص کے قول کے مطابق ہے جو کہتا ہے ''النجم سے مراد قرآن پاک نہیں'' لیکن وہ شخص جو یہ کہتا ہے ھو الوحی۔ اس میں مذکور کی ضمیر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ضمیر ضمناً مذکور کی طرف عائد ہے۔ اس سے مراد حضور اکرم ﷺ کا کلام مبارک اور فرمانِ عالی شان ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا فرمان "وما ینطق عن

الھویٰ" اپنے ضمن میں نطق کو لیے ہے۔اس سے مراد قول اور کلام ہے۔گویا کہ فرمایا:"وما کلامه ولا نطقه الا وحی" اس میں ایک اور وجہ بھی ہے کہ رب تعالیٰ کا یہ فرمان ان کفار کا رد ہے جو کہتے تھے کہ آپ کی باتیں کاہن اور آپ کا کلام کاہن کا کلام ہے۔رب تعالیٰ نے فرمایا:"ان ھو الا وحی یوحیٰ" یہ شاعر کا بھی کلام نہیں۔

وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ؕ﴿۴۲﴾ (الحاقۃ:۴۱،۴۲)

ترجمہ:"اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے تم لوگ بہت کم توجہ کرتے ہو۔"

رب تعالیٰ کا یہ فرمان "ان ھو الا وحی یوحیٰ" ھو وحی سے ابلغ ہے اس میں مبالغہ کا فائدہ ہے۔وہ یہ ہے کہ مشرکین کہا کرتے تھے:"یہ کاہن کا قول ہے یہ شاعر کا قول ہے۔" مراد ان کے قول کی نفی ہے۔یہ نفی کے صیغہ سے حاصل ہو سکتی تھی۔فرمایا:"حقیقت اس طرح نہیں جس طرح تم کہتے ہو" پھر یہ اضافہ کر دیا:"بل ھو وحی"

انوار التنزیل میں ہے:"اس شخص نے اس آیت طیبہ سے استدلال کیا ہے جو حضور اکرم ﷺ کے لیے اجتہاد روا نہیں سمجھتا۔اسے یہ جواب دیا گیا ہے کہ جب آپ ﷺ پر وحی کی جائے کہ آپ ﷺ اجتہاد کریں تو وہ آپ ﷺ کا اجتہاد ہوگا۔جو آپ ﷺ کی طرف منسوب ہو وہ واجب ہوگا لیکن اس موقف میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔کیونکہ وہ اس وقت وحی سے ہی ہوگا۔"

طیبی نے لکھا ہے:"یہ آیت طیبہ تنزیل کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔اس میں سے کسی استدلال کرنے والے کے لیے استدلال کرنا درست نہیں کہ وہ اجتہاد کے اثبات یا نفی کے لیے استدلال کرے۔کیونکہ ھو کی ضمیر قرآن پاک کے لیے ہے، کیونکہ بعض مفسرین نے نجم کی تفسیر قرآن حکیم سے کی ہے۔انہوں نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔پھر تابیر النخل کے بارے حضرت طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔"

امام رازی نے لکھا ہے:"درست موقف یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اجتہاد نہیں کرتے تھے۔لیکن ظاہر اس کے برعکس ہے۔آپ ﷺ نے جنگ میں اجتہاد کیا تھا۔آپ ﷺ نے

حرام کیا تھا۔ فرمایا:

لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ (تحریم:۱)

ترجمہ: ''کیوں حرام کرتے ہو جس کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا۔''

آپ ﷺ نے اجازت دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ۔ (التوبۃ:۴۳)

ترجمہ: ''درگزر فرمایا ہے اس نے آپ سے لیکن کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی۔''

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى پر گفتگو (النجم:۵)

''التبیان'' میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے کہ جس نے آپ ﷺ کو وحی کی تعلیم دی ہے اس میں ایسے اوصافِ حمیدہ پائے جاتے ہیں جو شیطان میں پائے جانے والے گندے اوصاف کے متضاد ہیں۔ جو گمراہی اور غوایت کا ہی سبق پڑھاتا ہے۔ یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی مانند ہے:

ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ (التکویر:۲۰)

ترجمہ: ''جو قوت والا ہے مالکِ عرش کے ہاں عزت والا ہے۔''

اس ذات کے ایسے اوصاف سے متصف کرنے میں کئی امور پر تنبیہ ہے:

1. اس میں ایسی قوت ہے کہ وہ اپنی طاقت سے شیاطین کو قریب ہونے سے روک سکتا ہے۔ کہ شیاطین اس کے قریب ہو کر کلامِ الٰہی میں کچھ کمی و بیشی کریں۔ بلکہ جب اسے شیطان دیکھتا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔ وہ اس کے قریب نہیں جاتا۔
2. وہ اس رسولِ کریم ﷺ کا مددگار ہے جس کی تم تکذیب کر رہے ہو۔ وہ اس کا معاون اور ناصر ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (التحریم:۴)

ترجمہ: ''اللہ آپ کا مددگار ہے۔ جبریل اور نیک بخت مومنین بھی آپ کے مددگار ہیں۔''

ایسی ذات جس کی مددگار، معاون اور معلم ہو وہ نصرت یافتہ اور ہدایت یافتہ ہوتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ آپ کا ہادی اور ناصر ہے۔

- ۳ جس نے اس رسولِ کریم ﷺ سے عداوت رکھی اس نے ان کے صاحب اور معاون سے دشمنی رکھی۔ وہ حضرت جبرائیل امین ہیں۔ جس نے قوت والے اور شدت والے کے ساتھ عداوت رکھی اس نے خود کو ہلاکت کے لیے پیش کر دیا۔
- ۴ وہ اس چیز کے نفاذ پر قادر ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے اور کوئی اسے یوں کرنے سے روک نہیں سکتا۔

سمین نے لکھا ہے: "علّمه کا فاعل حضرت جبرائیل امین ہیں۔ یہ ظاہر موقف ہے۔ جیسے علامہ ماوردی اور علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ حضرت حسن کے علاوہ سارے علماء کا موقف ہے۔ حضرت حسن نے لکھا ہے کہ اس میں فاعل ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے ہے:

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ (الرحمٰن: ۱، ۲)

ترجمہ: "رحمٰن نے (اپنے حبیب) کو سکھایا ہے قرآن۔"

ذو مرۃ کلام کی تکمیل کے لیے ہوگا۔"

اللباب میں ہے: "یہ جائز ہے کہ یہ ھاء ضمیر کا مرجع حضور نبی کریم ﷺ ہوں۔ یہی موقف ظاہر ہے۔ اس کا دوسرا مفعول محذوف ہوگا۔ یعنی علّمه النبی الوحی الی الموحی۔ یہ بھی روا ہے کہ یہ قرآن پاک اور وحی کے لیے ہو۔ اس صورت میں مفعول افعل محذوف ہوگا۔ یعنی علّمه النبی۔" امام رازی نے لکھا ہے "بہتر ہے کہ کہا جائے کہ یہ ضمیر حضور اکرم ﷺ کے لیے ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی: "علّم محمدا شدید القوی جبرائیل" یہ ضمیر صاحبکم کی طرف راجع ہوگی۔ شدید القوی سے مراد جبرائیل امین ہیں۔ اس سے مراد آپ ﷺ کی عملی اور علمی قوی مراد ہیں۔ جو سارے شدید ہیں۔ شدید القوی میں کئی فوائد ہیں:

- ۱ معلم کی مدح متعلم کی مدح ہوتی ہے۔ اگر صرف علمه جبرائیل کہہ دیا جاتا ان کے اوصاف ذکر نہ کیے جاتے تو حضور اکرم ﷺ کو ظاہری فضیلت حاصل نہ ہوسکتی۔
- ۲ اس میں مشرکین کا رد بھی ہے جو کہتے تھے کہ یہ اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔ فرمایا:

''انہیں لوگوں میں سے کسی نے نہیں سکھایا انہیں شدید القویٰ نے سکھایا ہے۔

◈ اس میں حضرت جبرائیل امین کے قول پر وثوق بھی ہے۔شدید القوی سے یہ وثوق محکم ہوتا ہے۔کیونکہ ادراک کی قوت وثوق کے لیے شرط ہوتی ہے۔اسی طرح حفظ کی قوت بھی۔ ان سارے اوصاف کے جامع ہونے کی وجہ سے انہیں شدید القوی کہا ہے۔یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہوگیا۔

ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿٢١﴾ (التکویر:۲۰،۲۱)

ترجمہ:''جو قوت والا ہے جو مالکِ عرش کے ہاں عزت والا ہے سردار اور وہاں کا امین ہے۔''

اللباب میں ہے''یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے کیونکہ یہ مرفوع ہے۔یہ غیر حقیقی ہے۔علامہ زمخشری نے اسی موقف کو یقین کے ساتھ کہا ہے۔صاحب الکفیل نے کہا ہے:''نہیں۔بلکہ یہ اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔انہوں نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔واضح قوت والے کو شدید کہا جاتا ہے۔

ابن عساکر نے حضرت معاویہ بن قرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل امین سے کہا''آپ کے رب نے آپ کی کتنی عمدہ تعریف کی ہے۔''فرمایا ہے:

ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿٢١﴾ (التکویر:۲۰،۲۱)

ترجمہ:''جو قوت والا ہے۔مالکِ عرش کے ہاں،عزت والا ہے۔(سب فرشتوں کا) سردار اور وہاں کا امین ہے۔''

آپ کی قدرت اور امانت کا کیا عالم ہے؟ انہوں نے عرض کی:''میری قوت کا عالم یہ ہے کہ مجھے مدائن لوط کی طرف بھیجا گیا۔یہ چار شہر تھے۔ہر شہر میں چار لاکھ جنگجو افراد تھے۔دیگر لوگ ان کے علاوہ تھے۔میں نے انہیں نچلی زمین سے اٹھایا حتیٰ کہ آسمان والوں نے ان کے مرغوں کی اور کتوں کی آوازیں سنیں۔پھر میں نے انہیں الٹا کر نیچے پھینک دیا۔میری امانت کا عالم یہ ہے کہ مجھے جس کا حکم دیا جاتا ہے میں صرف اسی ذات کی طرف اسے لے کر جاتا ہوں جس کے پاس جانے کا حکم دیا جاتا ہے کسی اور کی طرف نہیں لے کر جاتا۔''

حضرت محمد بن سائب نے لکھا ہے: ''حضرت جبرائیل امین کی قوت کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کے شہروں کو سیاہ پانی کے نیچے سے اٹھایا۔ انہیں اپنے پَر کے اوپر اٹھایا۔ آسمان تک لے گئے۔ حتیٰ کہ آسمان والوں نے ان کے مرغوں اور کتوں کی آوازیں سنیں۔ پھر انہیں الٹا دیا۔ ان کی قوت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے ابلیس کو دیکھا جو ارضِ مقدس کی ایک گھاٹی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کر رہا تھا۔ انہوں نے اس لعین کو پر مارا اور اسے ہندوستان کے پہاڑوں پر پھینک دیا۔ ان کی قوت کا عالم یہ ہے کہ وہ لحظہ بھر میں آسمان سے انبیاء کرام کے پاس آتے اور چلے جاتے۔''

ذومرۃ پر گفتگو

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ قطرب نے کہا ہے کہ اہلِ عرب میں ہر پختہ اور محکم رائے والے کو ذومرۃ کہتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

قد كنت قبل لقاء كم ذا مرّةٍ

عندى لكل مخاصم ميزانه

ترجمہ: ''میں تمہاری ملاقات سے قبل عقل و دانش والا تھا۔ ہر جھگڑنے والے کے لیے میرے پاس میزان ہوتا تھا۔''

حضرت جبرائیل امین کی رائے کی اس پختگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے انبیاء علیہم السلام پر وحی پر امین مقرر کیا تھا۔ جوھری نے لکھا ہے المِرۃ قوت اور شدید عقل کو کہتے ہیں۔ اس سے رجل مریر ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

ترى الرجل الخيف فتزدريه

وحشو ثيابه اسد مرير

ترجمہ: ''تم اسے دبلا پتلا دیکھ کر اس سے نفرت کرتے ہو حالانکہ اس کے کپڑے کا بھراؤ قوی شیر ہے۔''

ابن القیم نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ ذات ہے جس کا منظر دلکش ہو۔ صورت حسین

ہو۔صاحب جلال ہو۔شیطان کے یہ اوصاف نہیں ہو سکتے۔وہ تو رب تعالیٰ کی ساری مخلوق سے بدصورت ہے۔حضرت جبرائیل امین تو ساری مخلوق سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ساری مخلوق سے زیادہ جمیل اور امین ہیں۔حضور ایزدی میں ان کا بڑا مقام ہے۔اس لیے وہ پیغام رسانی کے لیے معتبر ہیں۔اللہ تعالیٰ نے علم، قوت، حسنِ منظر اور جلالت کے ساتھ ان کا وصف بیان کیا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان اوصاف سے متصف تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لوگوں سے زیادہ شجاع، عالم، باجمال اور پاکیزہ نفس تھے۔"

امام نے ذو مرۃ کے بارے لکھا ہے کہ اس میں کئی وجوہ ہیں:

1. قوت والا۔یہ معنی حضرت مجاہد سے روایت کیا گیا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی اسی امر پر دلالت کرتا ہے:"لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرّة سویّ"
2. عقل اور دین میں کمال والا۔
3. دلکش منظر اور عظیم ہیبت والا۔
4. اچھے اخلاق کا مالک۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ ماوردی نے پانچویں معنی کا اضافہ کیا ہے وہ ہے:"غناء والا"

میں کہتا ہوں کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔آپ ان سارے اوصاف سے متصف ہیں۔اگر اعتراض کیا جائے کہ ذو مرۃ کا معنی شدید القوی گزر چکا ہے۔تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس کے قویٰ شدید ہیں اور اسے قوت حاصل ہے؟ اس کا جواب دو اعتبار سے دیا گیا ہے:

1. یہ اس وقت درست نہیں ہوتا جب وصف کے بعد وصف ہو۔جب یہ بطور بدل ہو تو جائز ہوتا ہے۔گویا کہ یوں کہا گیا:"علّمه ذو قوة نزل شديد القوى" یہ اس کا وصف نہ رہا۔اصل عبارت یوں تھی:"ذو قوة عظيمة او كاملة"
2. مرۃ کو مفرد ذکر کرنا بعض اوقات یہ تفصیل بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ ان کے قویٰ شدید مشہور ہیں۔

ان میں ایک اور قوت بھی ہے جسے رب تعالیٰ نے ان کے ساتھ مختص کیا ہے۔اس وقت ہم کہیں گے کہ اس سے مراد ذو شدۃ ہوگا۔اصل عبارت یوں ہوگی۔"علّمه من قواه

شدیدۃ... یعنی ان کے قوی بھی شدید ہیں اور ان کی ذات میں بھی شدت ہے۔ بعض اوقات انسان کثیر قوت والا اور چھوٹے جسم والا ہوتا ہے۔ اس میں لطف آور بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے شدید القوی سے مراد قوت علم لی ہے۔ ذومرۃ سے قوت جسم مراد لی ہے۔ علم کو جسم سے مقدم کیا۔ جیسے فرمایا:

وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ (البقرۃ:۲۴۷)

ترجمہ: ''اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں۔''

''ذو'' پر گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔''

فَاسْتَوٰى ۙ﴿۶﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ﴿۷﴾ (النجم:۶،۷)

اللباب میں ہے ''مکی نے کہا ہے کہ استوٰی ایک یا زیادہ سے زیادہ دو افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے فراء نے ضمیر کو دو کے لیے بنایا ہے۔''

علامہ ماوردی اور قرطبی نے لکھا ہے: ''فاستوٰی یعنی جبرائیل آسمان پر اپنے مقام کی طرف بلند ہوئے۔ اس وقت انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھا دیا تھا۔'' یہ حضرات ابن المسیب اور ابن جبیر کا قول ہے۔

امام نے فرمایا ہے: ''یہ مشہور ہے۔'' استوٰی کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے ''وہ اس صورت میں ظاہر ہوئے جس پر رب تعالیٰ نے ان کی تخلیق کی ہے۔ کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس انسانی شکل میں حاضر ہوتے تھے جس طرح وہ دیگر انبیائے کرام کے پاس آتے تھے۔ ایک دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''وہ انہیں وہ شکل دکھائیں جس پر رب تعالیٰ نے انہیں تخلیق کیا ہے۔ انہوں نے دو بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ صورت دکھائی۔ (۱) زمین میں (۲) آسمان پر۔ زمین پر افق اعلیٰ پر اپنی اصلی صورت دکھائی۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حراء میں تشریف فرما تھے۔ مشرق کی طرف سے حضرت جبرائیل نمودار ہوئے۔ مغرب تک زمین کو گھیر لیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ حضرت جبرائیل امین شکل انسانی میں آپ کے پاس آئے۔ اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ چہرۂ انور سے غبار صاف کیا۔ جب

آپ ﷺ کو ہوش آیا تو فرمایا: ’’جبرائیل! میرا خیال نہیں تھا کہ رب تعالیٰ نے کسی کو اس طرح پیدا کیا ہوگا۔‘‘ انہوں نے عرض کی: ’’محمد عربی ﷺ! میں نے ابھی اپنے صرف دو پر ہی کھولے تھے۔ میرے چھ سو پَر ہیں۔ ہر پَر مشرق سے لے کر مغرب تک وسیع ہے۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’یہ تو عظیم خلقت ہے۔‘‘ انہوں نے عرض کی: ’’میں تو رب تعالیٰ کی مخلوق کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل کو پیدا فرمایا۔ ان کے چھ سو پر ہیں۔ ہر پر میرے سارے پروں کے برابر ہے۔ وہ کبھی خوفِ الٰہی سے سمٹتے ہیں تو وہ چڑیا کی مانند ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴿۲۳﴾ (التکویر: ۲۳)

ترجمہ: ’’بلاشبہ اس نے اس قاصد کو دیکھا ہے، روشن کنارے پر۔‘‘

آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس آپ ﷺ نے انہیں دیکھا۔ انبیاء کرام میں سے صرف حضور اکرم ﷺ نے ہی انہیں اصلی صورت میں دیکھا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے: ’’حضرت جبرائیل امین کی یہ روایت شبِ معراج کے بارے نہیں ہے۔ بلکہ یہ روایت پہلے کی ہے۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ زمین پر جلوہ افروز تھے۔ یہ بعثت کی ابتداء فترۃ وحی سے بعد کا واقعہ ہے۔ اللباب میں ہے ’’اس کی ضمیر میں دو وجہیں ہیں:

◆ ① یہ وجہ اظہر ہے کہ یہ مبتداء ہے اور بالافق اس کی خبر ہے۔ ضمیر حضور اکرم ﷺ یا حضرت جبرائیل امین کے لیے ہے۔ پھر اس جملہ میں دو وجوہات ہیں۔

◇ ۱ یہ استوٰی کے فاعل سے حال ہے۔ یہ مکی کا قول ہے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل امین اپنی اصلی صورت میں بلند ہوئے۔ اس سے قبل حضور اکرم ﷺ نے انہیں اس شکل میں نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ نے انہیں یوں کرنے کے لیے فرمایا۔

◇ ۲ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ رب تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ’’ھو‘‘ کا استوٰی میں مستتر ضمیر پر عطف ہے۔ استوٰی کی ضمیر یا تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے یہ حسن کا قول ہے یا جبرائیل یا حضور اکرم ﷺ کے لیے ہے۔ یہ ضعیف ہے کیونکہ یوں

کہا جاتا ہے استوی ھو و فلان۔ البتہ ضرورت شعری کے لیے کہا جا سکتا ہے۔
صحیح بات یہ ہے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام افق اعلیٰ پر اصلی صورت میں جلوہ نما ہوئے کیونکہ وہ شکل انسانی میں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تھے۔ حضور ﷺ نے انہیں اصلی صورت میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت جبرائیل افق مشرق پر نمودار ہو گئے۔ انہوں نے افق کو بھر دیا۔

امام احمد، عبد بن حمید، ابن منذر، بیہقی اور ابونعیم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل کو اصلی شکل میں دیکھا۔ ان کے چھ سو پر تھے۔ ہر پر نے افق کو گھیر رکھا تھا۔ ان کے ہر پر سے جواہرات، موتی اور یاقوت گر رہے تھے۔ امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل امین سے فرمایا کہ وہ آپ ﷺ کو اصلی شکل دکھائیں۔ انہوں نے عرض کی: ''آپ اپنے رب تعالیٰ سے التجاء کریں۔'' آپ ﷺ نے مولائے کریم سے دعا کی۔ مشرق کی طرف سے ایک صورت نمودار ہوئی۔ وہ بلند ہونے لگی، پھیلنے لگی۔ جب حضور اکرم ﷺ نے اسے دیکھا تو آپ ﷺ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ حضرت جبرائیل امین آپ ﷺ کے پاس آئے چہرہ انور سے غبار صاف کیا۔''

المصباح میں ہے کہ الاُفُق زمین اور آسمان کا کنارہ ہے۔ اس کی جمع آفاق ہے اسے اُفق بھی پڑھا گیا ہے علامہ ماوردی نے لکھا ہے کہ الافق الاعلیٰ کے بارے تین اقوال ہیں:

1. مطلع الشمس یہ مجاہد کا قول ہے۔
2. وہ افق جہاں سے دن نمودار ہوتا ہے یعنی طلوعِ فجر۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔
3. افق السماء یہ آسمان کے کناروں میں سے ایک کنارہ ہے۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

اخذنا بآفاق السماء علیکم
لنا قمراھا والنجوم الطوالع

ترجمہ: ''ہم آسمان کے آفاق کے اعتبار سے تم سے برتری پا گئے ہیں۔ اس کے شمس و

قمر اور طلوع ہونے والے ستارے ہمارے ہیں۔''

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿٨﴾ (النجم:٨)

امام رازی نے لکھا ہے کہ اس میں کئی وجوہ ہیں:

سب سے مشہور وجہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل امین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہوئے۔ یعنی اس کے بعد کہ انہوں نے اپنا پر پھیلایا جبکہ وہ افق اعلیٰ پر تھے۔ وہ اس صورت میں متشکل ہوئے جس میں عموماً آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہوئے۔''

امام قرطبی نے لکھا ہے: ''افق اعلیٰ پر استواء کے بعد حضرت جبرائیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہوئے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرائیل کا عظیم جسم دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل کو انسانی شکل میں لوٹا دیا۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہوئے۔ یہ جمہور کا قول ہے۔''

اس اعتبار سے تدلّٰی کے بارے میں تین اقوال ہیں:

- ① الدلو اور التدلی کا معنی ایک ہے گویا کہ فرمایا: "دنا فقرب" اللباب میں ہے ''فراء کا موقف یہ ہے کہ فتدلّٰی میں فاء، واؤ کے معنی میں ہے اصل عبارت یوں ہوگی۔ ثم تدلی علیہ الصلوٰۃ والسلام و دنا" کہہ سکتے ہو۔ اسی طرح "شتمنی و اساء اور اساء و شتمنی" بھی ہیں۔ شتم اور اساء ایک ہی چیز کا نام ہے۔ رب تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی طرح ہے:

  اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿١﴾ (القمر:١)

ترجمہ: ''قیامت قریب آگئی ہے اور چاند شق ہوگیا۔

یعنی انشق القمر و اقتربت الساعۃ۔

- ② اس کلام میں تقدم و تاخر ہے دراصل عبارت یوں ہوگی: "ثم تدلّٰی من الافق فدنا من النبی"

◆ دنا، قصد کے معنی میں ہے یعنی انہوں نے حضور ﷺ کے قریب جانے کا قصد کیا۔ اس جگہ سے حرکت کی جس میں وہ تھے۔ قریب ہوئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے رب تعالیٰ کے قریب ہوئے۔ اس جگہ دنو سے مراد منزلت ہے جیسے کہ آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا فرمان سناتے ہوئے فرمایا ہے: "من تقرب مِنّی شبرا تقربت عنه ذراعاً و من اتانی یمشی اتیتهٗ هرولة" یہ اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل امین اپنے رب تعالیٰ کے قریب ہوئے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے رب تعالیٰ کے قریب ہوئے۔ اس میں قرب منزلت کے معنی میں استعمال ہوگا جیسے کہ امام رازی نے لکھا ہے۔ جمہور علماء کا مؤقف ہے کہ حضرت جبرائیل امین حضور اکرم ﷺ کے قریب ہوئے۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ﴿۹﴾ (النجم:۹)

اللباب میں ہے "اس جگہ مجبوراً دو مضاف محذوف ماننا پڑیں گے۔ اصل عبارت یوں ہوگی "فکان مقدار مسافة قربه منه مقدار مسافة قاب"۔

امام رازی نے لکھا ہے: "حضرت جبرائیل امین اور حضور اکرم ﷺ کے مابین دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اہلِ عرب اس امر کو اکثر استعمال کرتے تھے۔ ان کے دو امیر یا سردار جب صلح کرتے، باہم عہد کرتے تو وہ اپنی دو کمانیں نکالتے، ہر ایک اپنی قوس کو اپنے ساتھی کی کمان کے ساتھ ملا لیتا اس طرح کہ اس کا ہاتھ اس کے ساتھی کے ہاتھ کے ساتھ ہوتا۔ ان کے بازو آگے نکلے ہوتے۔ اسے مباءة بھی کہتے تھے۔ اس اعتبار سے دو کمانوں کے مابین فاصلہ مراد ہوگا۔ یا حضرت جبرائیل امین حریم ناز اور حضور اکرم ﷺ کے مابین سفیر تھے۔ وہ حضور ﷺ کے تابع تھے۔ وہ اسی طرح ہوں گے جس طرح کسی کے ساتھ عہد کیا جائے۔

اللباب میں ہے: "القاب کا معنی القدر ہے۔ تم کہتے ہو: "ھذا قاب ھذا" یعنی اس کی قدر القیب، القاد، القید اور القیس اس کی مثالیں ہیں۔" جوھری نے لکھا ہے: "یہ دراصل حَابَ قِیسٍ تھا۔ اسے مقلوب کیا گیا ہے۔" حدیث پاک میں ہے: "القاب قوس احد کم من الجنة خیر من الدنیا وما فیھا" القوس سے مراد معروف قوس (کمان) ہی ہے جس کے ذریعے تیر پھینکے جاتے ہیں۔ یہ مؤنث ہے۔ اس کی تصغیر شاذ ہی ہوتی ہے۔ بعض اہلِ لغت اس کی تصغیر قویس بناتے ہیں۔ مگر وہ تانیث کے بغیر ہوتی ہے۔ قوس کے ساتھ ضرب المثل بیان کی گئی ہے۔ یہ قاب سے جدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ التباس کا اندیشہ نہیں۔"

الواحدی نے لکھا ہے کہ جمہور کہتے ہیں کہ قوس سے مراد وہ کمان ہے جس کے ساتھ تیر پھینکے جاتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد کلائی ہے کیونکہ اس کے ساتھ زور لگا کر تیر پھینکے جاتے ہیں۔ امام قرطبی نے لکھا ہے: "حضرات سعید بن جبیر، عطاء، ابواسحاق الھمدانی اور ابووائل کا قول ہے کہ فکان قاب قوسین سے مراد کلائیوں کی مقدار ہے۔ قوس سے مراد کلائی ہے جس سے ہر چیز کو پھینکا جاتا ہے یہ بعض حجازیوں کی لغت ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ ازدشنوءۃ کی لغت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن جریر و ابن منذر نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔" حافظ لکھتے ہیں: "یہ قول راجح ہونا چاہیے۔" طبرانی، ابن مردویہ اور ضیاء نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: "قاب، قید اور قوسان سے مراد کلائیاں ہیں۔" اللباب میں ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: "اَوْ یَزِیْدُوْنَ" اس کا معنی ہے کہ دیکھنے والے کی نظر کے مطابق ان دونوں مقداروں میں سے ایک مقدار۔ ان میں اتنا قرب ہے کہ دیکھنے والا شک نہیں کر سکتا۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس جگہ "اَوْ" شک کے لیے نہیں بلکہ مسافت کی مقدار کی تحقیق کے لیے ہے۔ وہ قوسین کی مقدار سے زائد نہیں۔ جیسے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ (الصافات: ۱۴۷)

ترجمہ: "اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف۔"

یہ اس مقدار کی تحقیق کے لیے ہے یعنی وہ ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ یا ایک فرد زائد تھا۔ اس کی مثال رب تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ (البقرۃ: ۷۴)

ترجمہ: ''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی۔ وہ تو پتھر کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''

یعنی ان کے دل کی قسوت پتھر کی قساوت سے کم نہ تھی۔ اگر وہ پتھر کی قساوت سے زائد نہ ہوگی تو اس سے کم بھی نہ ہوگی۔ یہ معنی اس شخص کے معنی سے احسن، الطف اور ادق ہے جس نے ''اَوْ'' کو بل کے معنی میں کیا۔ یہ معنی اس شخص کے معنی سے بھی خوبصورت ہے جس نے اسے دیکھنے والے کے اعتبار سے اسے شک کے لیے بتایا ہے یا اسے ''اَوْ'' کے معنی میں کیا ہے۔ ابن کثیر نے اسے ہی یقین کے ساتھ لکھا ہے۔

اللباب میں ہے: ''ادنیٰ اسم تفضیل ہے۔ مفضل علیہ محذوف ہے جو ادنیٰ من قاب قوسین ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا ''حضرت جبرائیل امین زمین پر افق اعلیٰ پر استواء کے بعد قریب ہوئے۔ اور قریب ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے دو کمانوں کے درمیان جتنا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم رہ گیا۔

تنبیہ

اس قریب ہونے والے سے مراد حضرت جبرائیل امین ہیں۔ جو قریب ہوئے ان کے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین دو کمانوں جتنا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ قاضی نے یہ موقف جمہور سے روایت کیا ہے۔ ابن کثیر نے اسے ہی صحیح لکھا ہے۔ اکابر صحابہ کرام کا کلام بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ ابن قیم نے لکھا ہے ''کیونکہ سورت کی ابتداء سے حضرت جبرائیل کے اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں۔ اس آیت طیبہ تک ان کے ہی اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ (النجم: ۱۳، ۱۴)

ترجمہ: ''اورانہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا۔سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔''

حضورﷺ نے صحیح حدیث میں اسی طرح تفسیر بیان کی ہے۔ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: ''میں نے حضور اکرمﷺ سے اس آیت طیبہ کے بارے پوچھا۔آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تھے۔میں انہیں صرف دوبار اس شکل میں دیکھا ہے۔جس پر ان کی تخلیق ہوئی۔قرآن پاک کے الفاظ کئی وجوہ کی بناء پر اس کے بعد کسی اور امر پر دلالت نہیں کرتے۔

1. اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "علّمه شديد القوى" یہ حضرت جبرائیل امین ہی ہیں سورۃ التکویر میں ان کا وصف قوت کے ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے۔
2. فرمایا: "ذو مرة" (النجم:٦) یعنی حسنِ خلق۔سورۃ التکویر میں انہیں الکریم کہا گیا ہے۔
3. فرمایا: "فاستوٰى وهو بالافق الاعلىٰ" یہ آسمان کا کنارہ ہے۔یہ استواء حضرت جبرائیل کا تھا۔
4. فرمایا: "ثم دنى... ادنى" یہ حضرت جبرائیل کا قرب ہے وہ زمین میں اس جگہ آئے جہاں حضور اکرمﷺ تشریف فرما تھے۔یا شب معراج یہ دنو اور قرب ہوا تھا۔جبکہ آپ ﷺ ساتوں آسمانوں کے اوپر تھے۔
5. فرمایا: "ولقد راٰه... المنتهىٰ۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس حضرت جبرائیل ہی تھے۔ حضورﷺ نے اس کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔فرمایا: ''وہ حضرت جبرائیل تھے۔''
6. "ولقد راٰه" "دنا فتدلّٰى" "فاستوٰى" "وهو بالافق الاعلىٰ" میں ایک ہی ضمیر ہے۔مناسب نہیں ہے کہ مفسرین کے مابین دلیل کے بغیر ہی مخالفت قائم کی جائے۔
7. اللہ رب العزت نے آگاہ فرمایا کہ وہ ذاتِ والا جو قریب ہوئی افق اعلیٰ پر تھی۔اس سے مراد آسمان کا افق ہے۔وہ زمین کے قریب ہوئے۔حضور اکرمﷺ کے نزدیک ہوئے۔وہ دنو اور تدلی جن کا تذکرہ حضرت شریک کی روایت میں ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ابن کثیر نے اسی بات کو یقین کے ساتھ کہا ہے۔امام مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اس آیتِ طیبہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ آپ

ﷺ نے دل کی آنکھ سے دو بار دیکھا۔انہوں نے ایک اسے کہا ہے۔

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴿۱۰﴾ (سورۃ النجم:۱۰)

ابن عادل نے امام رازی کی تبع میں کہا کہ اَوْحٰی کے فاعل میں دو وجہیں ہیں:

❶ رب تعالیٰ کی ذاتِ والا۔اس وقت معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل امین کی طرف وحی کی۔

❷ دوسرے اوحٰی میں فاعل حضرت جبرائیل ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل پر وحی کی جو انہوں نے آگے وحی کی۔اس اعتبار سے اس ذات میں دو وجوہات ہیں جن کی طرف حضرت جبرائیل نے وحی کی:

① وہ مخصوص ہو۔اس سے مراد حضرت جبرائیل کا حضور ﷺ پر وحی کرنا ہوگا۔

② وہ عام ہو۔اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل پر وحی کی جو انہوں نے ہر رسول پر نازل کیا۔

اس میں اس امر کی تفصیل ہے کہ حضرت جبرائیل نے اس میں کوئی خیانت نہیں کی جو ان کی طرف وحی کیا گیا۔یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ (الشعراء:۱۹۳)

ترجمہ:''اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبرائیل)۔''

مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿۲۱﴾ (التکویر:۲۱)

ترجمہ:''(سب فرشتوں کا) سردار اور وہاں کا امین ہے۔''

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب ہم کہیں کہ اوحٰی کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے تو عبدہٖ سے مراد حضور اکرم ﷺ ہوں گے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر وہ کچھ نازل کیا جو ہر رسول پر نازل کیا۔

پہلے اوحی کے فاعل میں دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں فاعل حضرت جبرائیل امین ہوں۔انہوں نے وہ وحی آپ ﷺ پر نازل کی ہو جو رب تعالیٰ نے ان پر نازل کی تھی۔ حضرت عطاء، کلبی، حسن، ربیع اور ابن زید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح

روایت کیا ہے۔اس اعتبار سے دوسرے اوحی کے فاعل میں دو وجہیں ہیں:

1. وہ جبرائیل ہوں۔حضور اکرم پر حضرت جبرائیل نے وحی کی جو وحی کی۔
2. فاعل رب تعالیٰ کی ذات ہو یعنی حضرت جبرائیل امین نے حضور اکرم ﷺ پر وہ وحی کی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کی تھی۔

"ما اوحی" میں کئی وجوہ ہیں:

1. نماز کی فضیلت۔
2. کوئی نبی آپ ﷺ سے اور آپ ﷺ کی امت سے قبل جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔
3. مَا عموم کے لیے ہے۔اس سے ہر وہ امر مراد ہوگا جسے لے کر حضرت جبرائیل لائے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ (النجم:۱۱)

ابن قیم نے لکھا ہے: "اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل کے تصدیق کے بارے بتایا ہے کہ دل نے اس کی تصدیق کی جو کچھ چشمانِ مقدس نے دیکھا دل نے آپ ﷺ کی تصدیق کی۔اس شخص کی طرح نہ تھا جس نے کسی چیز کو اس کی حقیقت کے برعکس دیکھا۔دل اس کی بصارت کی تکذیب کر دے۔بلکہ آپ ﷺ نے جو کچھ دیکھا دل مبارک نے اس کی تصدیق کر دی۔آپ ﷺ نے جان لیا کہ حقیقت اسی طرح ہے۔کہا جاتا ہے:" کذبتہ عینہ و کذب قلبہ و کذب جسدہ" جب انسان کے ظن و گمان کے برعکس امر رونما ہو جائے۔شاعر نے لکھا ہے:

كذبتك عينك ام رائيت بواسط
غلس الظلام من الرباب خيالا

ترجمہ: "تیری آنکھ نے تجھے جھٹلایا ہے یا تو نے رات کی تاریکی کی ظلمت میں رباب کا تصور دیکھا ہے۔"

یعنی تیری آنکھ نے وہ کچھ دکھا دیا جس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ مکرم ﷺ کی اسی چیز سے نفی فرمائی ہے۔اس نے بتا دیا کہ جو آپ ﷺ نے ملاحظہ

فرمایا دل نے اس کی تکذیب نہ کی۔

علامہ ماوردی نے لکھا ہے کہ "الفؤاد" میں جو قول ہیں: اس سے مراد صاحب الفؤاد ہے۔ اسے الفؤاد سے تعبیر کیا۔ کیونکہ یہ جسم کا قطب ہے۔ اس سے زندگی قائم ہے یا اس سے مراد فؤاد کا نفس ہے۔ کیونکہ اعتقاد کا محل وہی ہوتا ہے۔

اللباب میں ہے کہ ہشام اور ابو جعفر نے کذب کو ذال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلے اعراب کے اعتبار سے معنیٰ یہ ہوگا کہ حضور ﷺ نے جو کچھ اپنی چشمانِ مقدس سے دیکھا ہے آپ ﷺ کے قلب انور نے اس کی تصدیق کی۔ دارمی نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ معرفہ کا ہو کیونکہ اس کا حال پہلے گزر چکا ہے۔ کیونکہ پہلے "الی عبدہ" میں حضور اکرم ﷺ کا ذکر خیر گزر چکا ہے۔ اسی طرح "ما ضل صاحبکم" میں بھی آپ ﷺ کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ ایک ایسا تصور ہے جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ دوسرا ما موصولہ ہے جو مفعول لہ بن رہا ہے۔ عائد محذوف ہے رأی کا فاعل ضمیر ہے جو حضور اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے۔ تخفیف کی قرأت میں بھی اسی طرح ہے کَذَبَ خود متعدی ہوتا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ زیر دینے والا محذوف ہے اصل عبارت یوں تھی: "فیما رآہ" یہ مکی وغیرہ کا قول ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

لو کنت صادقة الذی حدثتنی
لنجوت منجا الحارث بن هشام

ترجمہ: "تو جو کچھ مجھے بیان کر رہی ہے اگر تو اس میں سچی ہے تو تو حارث بن ہشام کی طرح نجات پا گئی ہے۔"

یہ دراصل "فی الذی حدثتنی" ہے۔ انہوں نے مَا میں دو وجہیں جائز قرار دی ہیں:

1. یہ الذی کے معنی میں ہو۔ اس وقت مفہوم یہ ہوگا "جو کچھ آپ ﷺ نے چشمانِ مقدس سے دیکھا دل انور نے اسے نہ جھٹلایا۔"
2. یہ مصدریہ ہو۔ ابن قیم نے لکھا ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا۔ "آپ ﷺ کے دیدارِ الٰہی کو آپ ﷺ کے دل نے نہ جھٹلایا۔ اس صورت میں دو امور مقدر ہوں گے۔ اس میں

رؤیت قلب اور رؤیت بصر کی تطابق اور توافق کی خبر دینا ہوگا۔ان میں سے ہر ایک نے دوسری کی تصدیق کی۔یہ تشدید کی قرأت کا ظاہری معنی ہے۔ایک گروہ نے اسے مشکل سمجھا ہے۔ان میں مبرد بھی شامل ہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ اس قرأت میں بُعد ہے۔ جب آپ نے اپنے قلب انور سے دیکھا تو دل اقدس سے جان بھی لیا۔جب علم کا وقوع ہو جائے تو اس کے ساتھ کذب کا احتمال نہیں رہتا۔جب کوئی چیز دل میں معلوم ہو تو اس کے ہمراہ اس کی تکذیب کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب دو اعتبار سے دیا گیا ہے:

① بعض اوقات ایک انسان کسی چیز کو اس کی حقیقت کے برعکس دیکھتا ہے۔اس کا دل اس کی تکذیب کرتا ہے جب وہ اسے معلوم کی صورت کو خلافِ حقیقت دیکھتا ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اس کی آنکھ اس کی تکذیب کرے۔اس لیے کہا جاتا ہے "کذب قلبه و کذب ظنه و کذبته عینه" اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس امر کی نفی فرمادی۔بتادیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب انور سے جو کچھ دیکھا تھا وہ بالکل اسی طرح تھا۔جیسے کوئی کسی چیز کی اصلی حقیقت کو دیکھ لیتا ہے۔لہٰذا یوں کہنا درست ہے "لم تکذبه عینه"

② رأی میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہو۔الفؤاد کی طرف راجع نہ ہو۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا "دل نے اس چیز کی نفی نہ کی جو آنکھ نے دیکھا۔الحمدللہ! اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا "دل نے تکذیب نہ کی بلکہ اس کی تصدیق کی۔دونوں قرأتوں میں معنیٰ یہ ہوگا: "نہ تو دل انور نے اس وہم میں ڈالا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ دیکھا ہو۔اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بصارت نے بہتان لگایا۔"

اللباب میں ہے۔امام رازی نے بھی اسی طرح لکھا ہے "یہ بھی جائز ہے کہ رأی کا فاعل اسی ضمیر میں ہو جو الفؤاد کی طرف راجع ہو۔یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب انور نے اس چیز میں شک نہ کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ نے دیکھا۔علامہ زمخشری نے لکھا ہے: "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب انور نے حضرت جبرائیل امین کی اس صورت کی تکذیب نہ کی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

چشمانِ مقدس سے دیکھی۔ دل انور نے یوں نہ کہا کہ میں اسے نہیں جانتا جو کچھ آپ ﷺ نے مشاہدہ کیا۔ اگر وہ اس طرح کرتا تو وہ جھوٹا ہوتا۔ کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ آپ ﷺ نے چشمانِ مقدس سے دیکھا۔ دل نے اسے جان لیا۔ اسے شک نہ رہا کہ جو کچھ آپ ﷺ نے دیکھا ہے وہ حق ہے۔ یہ تخفیف کی قرأت کے مطابق معنی ہے۔ تشدید کی قرأت کے مطابق اس کا معنی یہ ہے ''اس نے یوں نہ کہا کہ جو کچھ آپ ﷺ نے دیکھا تھا وہ مخفی تھا۔ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ رائی کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ دل انور ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ''جو کچھ قلب انور نے دیکھا اس نے اس کی تکذیب نہ کی۔ اس نے یہ نہ کہا کہ یہ جن یا شیطان ہے۔ بلکہ اسے یقین ہو گیا جو آپ ﷺ نے اپنے قلبِ انور سے دیکھا وہ سچ اور صحیح تھا۔ رائی سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد بَصَر ہے یعنی دل نے اس کی تکذیب نہ کی جو بصارت نے دیکھا۔ دل نے اسے خیال نہ سمجھا۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ''ال'' جنس کے لیے ہے اور معنی یہ ہو گا کہ قلب نے اس کی تکذیب نہ کی جو حضور اکرم ﷺ نے مشاہدہ کیا تھا۔ دلوں نے اس کی صحت کی گواہی دے دی جو محمد عربی ﷺ نے دیکھا تھا۔

المرئی کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل کو دیکھا انہوں نے سبز رفرف کے دو حلے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے آسمان اور زمین کے مابین فضاء کو گھیر رکھا تھا۔

اسے امام ترمذی اور امام فریابی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ ایک قول میں اس سے مراد آیاتِ عجیبہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے اپنے قلبِ انور کے ساتھ رب تعالیٰ کی زیارت دو بار کی۔ (مسلم) تیسرے باب ''رؤیت باری تعالیٰ'' میں اس کی مزید تفصیل آئے گی۔

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾ (النجم: ۱۲)

ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے انکار اور مخالفت کا انکار کیا ہے۔ جیسے کہ عالم کے لیے جاہل کی مخالفت کا انکار کیا جاتا ہے۔

اللباب میں ہے: ''الاخوان نے اسے "افتمرونه" پڑھا ہے۔ باقیوں نے اسے تمارونه پڑھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور شعبی نے اسے افتمرونه پڑھا ہے۔
پہلی قرأت میں دو وجہیں ہیں:

◆ یہ "مریته حقه" سے مشتق ہے۔ جبکہ آپ اس پر غلبہ پالیں، اور اس کے حق کا انکار کریں۔ اسے ''علی'' سے متعدی کیا گیا ہے کیونکہ اس میں غلبہ کے معانی پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا ہے:

لئن هجرت اخا صدق و مكرمة
لقد مريت اخاما كان يمريكا

ترجمہ: ''اگر تو نے اپنے معزز اور سچے بھائی کو چھوڑ دیا تو تو نے ایسے بھائی کا حق مارا جو تیرا حق نہیں مارتا تھا۔''

کیونکہ جب اس نے اس کے حق کا انکار کر یا تو گویا کہ اس پر غالب آ گیا۔ مبرد نے لکھا ہے کہا جاتا ہے "مراه لمن حقه و علی حقه" جب کوئی کسی کا حق روک دے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ علی، عن کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ جیسے بنو کعب بن ربیعہ کا قول ''رضی اللہ علیک'' یہ رضی اللہ عنک کے معنی میں ہے۔

ابن قیم نے لکھا ہے کہ یہ عن کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا جیسے مبرد نے لکھا ہے بلکہ فعل میں مخالفت کا معنی پایا جاتا ہے۔ الف کے ساتھ قرأت زیادہ ظاہر ہے۔

◆ یہ مراه كذا علی كذا سے مشتق ہے۔ یعنی وہ اس پر غالب آ گیا۔ یہ المراء سے ہے جس کا معنی الجدال ہے یا یہ ما راه عاریه سے مشتق ہے۔ اس کا معنی جھگڑا کرنا ہے۔ یہ مَرَی الناقة سے مشتق ہے۔ کیونکہ جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر ایک اس چیز کو نکال لیتا ہے جو اس کے صاحب کے پاس ہوتی ہے۔ اس کے لیے مناسب تو یہ تھا کہ اسے ''فی'' کے ساتھ متعدی کیا جاتا۔ جیسے کہا جاتا ہے "جادله فی كذا" یہ غلبہ کے معنی کو متضمن ہے۔ اس لیے اسے علی سے متعدی کیا گیا۔ حضرت عبداللہ نے اسے "ما راه" سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ یہ رباعی ہے۔ اس کا معنی

ہے "کیا تم آپ سے جھگڑا کرتے ہو؟ آپ نے جو کچھ دیکھا اس کے بارے آپ کیسے جھگڑا کرتے ہو؟ کیونکہ آپ نے جو کچھ ملاحظہ کیا ہے اسے یقین کی آنکھ کے ساتھ ملاحظہ کیا ہے۔ رؤیت کے بعد شک نہیں ہوتا۔

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس میں دونوں معانی شامل ہیں۔ کیونکہ ان کا جھگڑا انکار تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ انکار ان کی طرف سے ہمیشہ سے تھا یہ نیا جھگڑا نہیں ہے۔

ابن قیم نے لکھا ہے "یہ قوم جدال اور انکار کے مابین جمع ہوگئی۔ ان کا جھگڑا انکار کا جھگڑا تھا۔ یہ مناظرہ کوئی حق کو واضح کرنے اور راہ نمائی حاصل کرنے کے لیے نہ تھا۔ الف کا اثبات مجادلہ پر دلالت کرتا ہے۔ علیٰ کے ساتھ تذکرہ کرنا مخالفت پر دلالت کرتا ہے۔ الف کے ساتھ قراءت دونوں معانی کو شامل ہے۔ انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ اس وقت جھگڑا کیا تھا۔ جب آپ ﷺ نے معراج کی تھی تو انہوں نے کہا: "آپ ﷺ ہمارے لیے بیت المقدس کا محل وقوع بیان کریں۔ ہمارے کارواں کے بارے میں بتائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مفہوم یہ ہوگا کہ تم آپ ﷺ سے جھگڑا کرتے ہو اور جو کچھ آپ نے دیکھا جسے جانا اور جس پر یقین کیا کیا تم اس پر الزام لگاتے ہو۔ اگر کہا جائے کہ اس طرح کیوں نہ کہا گیا "اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا رَاٰى ﴿۱۲﴾ " یعنی ماضی کے صیغہ کے ساتھ۔ کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ اس وقت جھگڑا کیا جب آپ کو سیر کرائی گئی تھی۔ پھر مضارع کا صیغہ لانے میں کیا حکمت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اصل عبارت یوں تھی: "افتمارونه على ما يرى فكيف فكيف وهو قد رآه في السماء فماذا تقولون فيه"

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ (النجم: ۱۳)

ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل امین کو ایک بار اور دیکھا۔ پہلی بار آسمان کے بغیر افق اعلیٰ پر دیکھا تھا۔ دوسری بار آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا تھا۔ ابن کثیر نے لکھا ہے "یہ دوسری بار کا تذکرہ ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل کو اس شکل میں دیکھا تھا جس میں رب تعالیٰ نے انہیں

تخلیق کیا تھا۔ یہ شب معراج کو ہوا تھا۔حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔انہوں نے فرمایا: شب معراج رؤیت باری تعالیٰ ثابت ہے۔انہوں نے اسی آیت طیبہ سے استدلال کیا ہے۔سلف وخلف کی ایک جماعت نے ان کی اتباع کی ہے۔ایک جماعت نے ان کی مخالفت کی ہے۔اس کی تحقیق اگلے باب میں آرہی ہے۔

اللباب میں ہے "ولقد" میں واؤ ممکن ہے عاطفہ ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حال کے لیے ہو۔یعنی تم اس میں آپ ﷺ سے کیسے جھگڑا کرتے ہو جو کچھ آپ ﷺ نے دیکھا۔آپ ﷺ نے اس اعتبار سے اسے دیکھا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔نزلۃ نزول سے فعلۃ کے وزن پر ہے۔جیسے جلسہ، جلوس سے مشتق ہے۔اس کی نصب کی تین وجوہات بیان کی گئی ہیں:

1. یہ اس ظرف کی وجہ سے منصوب ہے جو مرۃ ہے۔کیونکہ فَعلہ فعل سے مرّہ کے لیے اسم ہے۔یہ اسی کے حکم میں ہے۔الشہاب الحلبی نے لکھا ہے کہ یہ بصریوں کا موقف نہیں ہے۔یہ فرّاء کا موقف ہے۔مکی نے اس سے نقل کیا ہے۔
2. یہ اس مصدر کی وجہ سے منصوب ہے جو حال کے قائم مقام ہے۔یعنی "راٰہ نازلًا نزلَۃً اخری" حوفی اور ابن عطایہ نے یہی مذہب اختیار کیا ہے۔
3. یہ مصدر مؤکد کی وجہ سے منصوب ہے۔ابوالبقاء نے اسے مرۃ اخری یا رؤیۃ اخری مقدر مانا ہے۔شہاب حلبی نے لکھا ہے کہ نزلۃ کی رؤیۃ کے ساتھ تاویل کرنے میں اختلاف ہے۔اخری دلالت کر رہا ہے کہ رؤیت اس سے قبل تھی۔ عند سدرۃ المنتھیٰ رأی کا ظرف مکان ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ پر گفتگو

امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ کئی وجوہات کا احتمال رکھتا ہے:

1. کسی چیز کی اس کے مکان کی طرف اضافت جیسے اشجار بلدۃ منتھی وہ جگہ ہوگی جسے نہ کوئی فرشتہ اور نہ ہی کوئی روح عبور کرسکتی ہے۔حضرت کعب الاحبار نے لکھا ہے "یہ جگہ عرش کی اصل میں عرش اٹھانے والے فرشتوں کے سروں پر ہے۔اسی پر مخلوق کا

علم ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے پرے کیا ہے صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

- ۲ محل کی حال کی طرف اضافت جیسے کتاب الفقہ۔ اصل عبارت یوں ہوگی: "سدرۃ عندھا منتھی العلوم"
- ۳ مِلک کی اضافت مالک کی طرف۔ جیسے دارزید یا شجر زید۔ اس صورت میں منتہیٰ الیہ محذوف ہوگا۔ اصل سدرۃ المنتہیٰ الیہ ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ﴿۴۲﴾ (النجم: ۴۲)

ترجمہ: "اور یہ کہ سب کو آپ کے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے۔"

منتہیٰ الیہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ سدرۃ کی اس کی طرف اضافت یوں ہوگی جیسے البینۃ کی اضافت ہے جو تعظیم و شرف کے لیے ہے۔ جیسے تسبیح میں کہا جاتا ہے: "یا غایۃ رغباہ یا منتھی املاہ"

امام قرطبی نے لکھا ہے "اس جگہ کو سدرۃ المنتہیٰ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کے بارے نو اقوال ہیں:

- ۱ کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جو کچھ اوپر سے آتا ہے اس جگہ آ کر رک جاتا ہے۔ وہاں سے اسے لے لیا جاتا ہے۔ جو کچھ زمین سے جاتا ہے وہ اس جگہ جا کر رک جاتا ہے۔ (مسلم)
- ۲ انبیاء کرام کا علم اس جگہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے پرے جو کچھ ہے وہ مخفی ہے۔ (ابن عباس)
- ۳ اعمال اس تک جاتے ہیں۔ اس سے انہیں اٹھا لیا جاتا ہے۔ (ضحاک)
- ۴ انبیاء اور ملائکہ اس جگہ ٹھہر جاتے ہیں۔
- ۵ شہداء کی ارواح یہاں پر رک جاتی ہیں۔ (ربیع بن انس)
- ۶ اہلِ ایمان کی ارواح اس جگہ ٹھہرتی ہیں۔ (قتادہ)
- ۷ جو حضور اکرم ﷺ کی سنت مطہرہ اور منہج پر ہے وہ اسی جگہ جا کر رک جاتا ہے۔ (حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ)
- ۸ یہ وہ درخت ہے جو عرش اٹھانے والے فرشتوں کے سروں پر ہے۔ اس پر مخلوق کا علم

ختم ہو جاتا ہے۔

❾ جسے اس مقام تک لے جایا جاتا ہے اس کی عزت و کرامت کی انتہاء ہو جاتی ہے۔

ماوردی نے لکھا ہے "دوسری چیزوں کو چھوڑ کر صرف سدرۃ کو ہی کیوں منتخب کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بیری کے درخت کے تین اوصاف ہوتے ہیں: (۱) لمبا سایہ (۲) لذیذ ذائقہ (۳) عمدہ خوشبو۔ اسے اس ایمان کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے جو قول، نیت اور عمل میں جمع ہوتا ہے۔ ایمان میں سے اس کا سایہ عمل کی مانند ہے کیونکہ یہ پھیلتا ہے۔ اس کا ذائقہ نیت کی طرح ہے جو کہ مخفی ہوتی ہے۔ اس کی خوشبو قول کی طرح ہے جو ظاہر ہوتا ہے۔

تنبیہ

بیری کے درخت کو کاٹنے سے روکا گیا ہے۔ ابوداؤد، طبرانی، بیہقی اور ضیاء نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس نے بیری کا درخت کاٹا رب تعالیٰ اس کا سر آگ میں گرائے۔" طبرانی نے "سدر الحرم" کا اضافہ کیا ہے۔ ابوداؤد نے لکھا ہے: "یعنی جس نے جنگل میں سے ایسا بیری کا درخت کاٹا جس کے نیچے مسافر یا چوپائے ٹھہرتے تھے۔ اس نے فضول اور ظلم کرتے ہوئے کاٹا تو اس کا سر جہنم کی آگ میں گرے گا۔" امام بیہقی نے ابوثور سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے امام شافعی علیہ الرحمہ سے بیری کے درخت کو کاٹنے کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا: "کوئی حرج نہیں۔" روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اسے پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دو" اسے اسی پر محمول کیا جائے گا جس پر ابوداؤد نے اسے محمول کیا ہے۔ امام بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرت عروہ بیری کا درخت کاٹتے تھے حالانکہ وہ اس روایت کے راوی ہیں جس میں اس درخت کو کاٹنے کی نہی وارد ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نہی خاص ہو جیسے کہ ابوداؤد نے کہا ہے۔

خطابی نے لکھا ہے کہ علامہ مزنی سے اس کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شخص کے بارے پوچھا گیا جس نے کسی قوم یا یتیم کی بیری کو کاٹنے کے لیے حملہ کیا یا اس نے وہ درخت کاٹا جس کا کاٹنا رب تعالیٰ نے حرام قرار دیا

تھا۔اس وقت وہ اس سزا کا مستحق ہوگا جس کا تذکرہ آپ ﷺ نے کیا۔مسئلہ کا تذکرہ سامع سے پہلے گزر چکا ہوگا۔اس نے جواب تو سن لیا مگر مسئلہ نہ سنا۔انہوں نے حضرت اسامہ بن زید کی روایت کو اس کی نظیر کہا ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا: "انما الربا فی النسیئۃ" انہوں نے صرف جواب سنا۔انہوں نے مسئلہ نہ سنا حالانکہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''سونے کو سونے کے عوض فروخت نہ کرو مگر مثل بمثل دست بدست'' علامہ مزنی نے اسی چیز سے استدلال کیا ہے جس سے امام شافعی نے استدلال کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے میت کو بیری کے پتوں کے ساتھ غسل دینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اگر یہ حرام ہوتا تو اس سے فائدہ اٹھانے کا حکم نہ فرماتے۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیری کے پتے شاخ کی مانند ہیں۔'' انہوں نے کہا: ''حضور اکرم ﷺ نے حرم پاک کے ان درختوں کے پتوں وغیرہ میں برابری قائم فرمائی ہے جسے کاٹنا حرام قرار دیا۔جب بیری کے پتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیا منع نہ فرمایا۔تو بیری کے درخت کو کاٹنے کے جواز پر دلیل قائم ہوگئی۔''

شیخ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے ''اس حدیث پاک کی میرے نزدیک عمدہ تاویل یہ ہے کہ اسے حرم پاک کی بیری پر محمول کیا جائے۔جیسے کہ طبرانی کی روایت میں ہے۔ابن الاثیر نے النہایۃ میں لکھا ہے: ''ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حرم پاک کی بیری کا درخت ہے کیونکہ وہ حرم ہے یا مدینہ طیبہ کی پاک زمین کا بیری کا درخت ہے۔اسے کاٹنے سے منع فرمایا تاکہ یہ ہجرت کرنے والے کے لیے انس اور سایہ کا سبب بن سکے۔یا اس سے مراد بیری کا وہ درخت ہے جو چٹیل میدان میں ہو کیونکہ مسافر اور حیوان اس کا سایہ حاصل کرتے ہیں۔یا وہ درخت ہے جو کسی دوسرے انسان کی ملکیت میں ہو۔ظالم اس پر حملہ کرے اور اسے ناحق کاٹ دے۔'' لیکن یہ حدیث مضطرب الروایۃ ہے کیونکہ اکثر راویوں نے اسے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے۔حالانکہ وہ خود بیری کا درخت کاٹتے تھے اور اس سے دروازے بناتے تھے۔ہشام کہتے تھے: ''یہ اس بیری کے درخت کے دروازے ہیں جسے میرے والد صاحب نے کاٹا تھا۔اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس درخت کا کاٹنا مباح ہے۔''

ابوداؤد نے حضرت حسان بن ابراہیم سے روایت کیا ہے۔انہوں نے کہا:''میں نے حضرت ہشام بن عروہ سے بیری کے درخت کو کاٹنے کے متعلق پوچھا۔وہ اپنے والد گرامی کے مکان کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔انہوں نے فرمایا:''تم یہ دروازے اور چوکھٹیں دیکھ رہے ہو۔یہ اس بیری کے درخت کے ہیں جنہیں میرے والد صاحب نے اپنی زمین سے کاٹا تھا۔''

عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى ؕ﴿۱۵﴾ (النجم:۱۵)

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ جنت الماویٰ کے مقام کی تعریف یہ ہے کہ وہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہے۔یہ عرش کے دائیں طرف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کا مقام تھا۔بعد میں اسی جگہ سے آپ کو نکالا گیا۔ایک قول یہ ہے کہ سارے اہلِ ایمان کی ارواح جنت الماویٰ میں ہوتی ہیں۔یہ عرش کے نیچے ہیں۔وہ اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور اس کی عمدہ خوشبو سونگھتی ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ یہ مقام حضرت جبرائیل اور حضرت میکائیل کا ٹھکانہ ہے۔

اللباب میں ہے''یہ ابتدائیہ جملہ ہے جو حال کی جگہ ہے۔بہتر ہے کہ اسے حال ظرف کہا جائے۔جنت الماویٰ اس کا فاعل ہے۔عام قراء نے اسے جنۃٌ اسم مرفوع پڑھا ہے۔لیکن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ،حضرت ابو درداء،حضرت ابو ہریرہ،حضرت ابن زبیر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم،حضرت زر بن جیش،حضرت محمد بن کعب نے اسے جَنَّہٗ فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔اس میں ھاء ضمیر ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف راجع ہے۔الماوی فاعل ہے۔اس کا معنی ہے کہ رب تعالیٰ کی پناہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیر لیا۔یا گھر اور رات نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیر لیا۔یا اس کے سایہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیر لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں داخل ہو گئے۔

امام رازی نے لکھا ہے:''احتمال ہے کہ اس قرأت کے مطابق''عندھا'' کی ضمیر ''النزلۃ'' کی طرف راجع ہو۔یعنی نزول کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ماوی نے ڈھانپ لیا۔صحیح مؤقف یہ ہے کہ یہ السدرۃ کی طرف راجع ہے۔اللباب میں ہے:''یہ جمہور کا قول ہے۔حضرت

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس قرأت کو عجیب سمجھا ہے۔ایک جماعت نے ان کی اتباع کی ہے۔انہوں نے کہا ہے:"اجن اللہ من قرأھا" جب ایسی عظیم ہستیوں سے یہ قرأت منقول ہے تو آپ کے رد کی طرف کوئی سبیل نہیں ہوگی۔لیکن مستعمل اجنہ (رباعی) ہے۔اسے ثلاثی بھی استعمال کیا گیا ہے۔جو"علی" سے متعدی ہوتا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ۔ (الانعام:۷۶)

ترجمہ:"پھر جب چھا گئی ان پر رات۔"

ابو البقاء نے لکھا ہے کہ یہ شاذ ہے۔اجنہ مستعمل ہے۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ (النجم:۱۶)

ابن قیم نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تذکرہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرائیل کو دیکھا۔پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔ذکر فرمایا کہ اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔اور اسے اس چیز نے ڈھانپ لیا جسے ڈھانپ لیا۔یہ عمدہ استطراد ہے۔قرآن مجید میں یہ ایک لطیف اسلوب ہے۔

اللباب میں ہے:"اذ" حالتِ نصب میں ہے۔امام نے لکھا ہے:"اذ" کا عامل یا اس کا مابعد ہے یا اس کا ماقبل ہے۔اس میں دو وجہیں ہیں۔اگر ہم کہیں کہ اس کا عامل ما قبل ہے تو اس میں دو احتمال ہیں۔ان میں اظہر احتمال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس وقت دیکھا جب سدرۃ پر وہ چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔دوسرے احتمال میں عامل وہ فعل ہے جو النزلۃ میں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دوسری بار دیکھا۔یہ دیکھنا اس وقت تھا جب سدرۃ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔یہ نزول اس وقت کے بعد تھا جب سدرۃ پر عجائب کا نزول ہوا تھا۔اس پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لائے۔یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فائدہ کے بغیر واپس نہیں لوٹے تھے۔اگر ہم کہیں کہ اس میں عامل مابعد ہے تو پھر اس کا عامل"ما زاغ البصر" ہے یعنی جب سدرۃ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ ناز بھی درماندہ نہ ہوئی جب سدرۃ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔

اس وقت سدرۃ پر کیا چھایا تھا اس کے بارے اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سونے کے بستر یا سونے کی ٹڈیاں تھیں۔ یہ حضرات ابن عباس، ابن مسعود اور ضحاک کا قول ہے۔امام قرطبی نے لکھا ہے کہ حضرات ابن مسعود اور ابن عباس نے حضور نبی اکرم ﷺ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:''میں نے سدرۃ کو دیکھا اس پر سونے کے بستر چھائے ہوئے تھے۔میں نے ہر ہر پتے پر ایک فرشتہ دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہا تھا۔'' میں کہتا ہوں کہ امام نے لکھا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔کیونکہ یہ دلیل سمعی سے ہی ثابت ہوسکتا ہے۔اگر اس میں حدیث صحیح ہو تو درست ہے۔ورنہ اسے متعین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔صحیح مسلم میں حدیث شریف ہے۔ایسی حدیث پاک کو اپنی رائے سے نہیں کہا جاسکتا۔ایک قول یہ ہے کہ ملائکہ اس پر چھائے ہوئے تھے گویا کہ وہ پرندے تھے۔ وہ شوق فراواں اور حصولِ تبرک کے لیے زیارت کرتے ہوئے اس پر چڑھتے تھے۔جیسے لوگ خانہ کعبہ کی زیارت کرتے ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ اس پر انوارِ الٰہیہ چھا رہے تھے۔ کیونکہ جب آپ ﷺ سدرۃ پہنچے تو ربِ تعالیٰ نے اس طرح تجلی فرمائی جس طرح رب تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تھی۔انوار ظاہر ہوئے لیکن سدرۃ کا درخت پہاڑ سے مضبوط تھا۔وہ ثابت رہا۔جبکہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا۔درخت نے حرکت نہ کی۔حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر گر پڑے لیکن حضور اکرم ﷺ ثابت قدم رہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان اقوال میں کوئی منافات نہیں ہے۔جیسے کہ روایت ہے کہ ان میں سے ہر چیز وہاں چھا رہی تھی۔ایک قول یہ ہے کہ اس کی تعظیم کرتے ہوئے اسے مبہم رکھا۔یعنی سدرۃ پر اس نے ملکوت کے دلائل اور اس کی قدرت کے عجائب جو چھا رہے تھے انہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ (النجم:١٧)

الصحاح میں ہے قد زاغ البصر ای مَالَ۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے کہ نہ تو چشمانِ اقدس دائیں بائیں مائل ہوئیں۔نہ اس حد سے آگے

بڑھیں جس کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔ مفسرین کا بھی یہی قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے اس چیز کی نفی فرمادی جو اس مشاہدہ کرنے والے کو لاحق ہوتی ہے جسے بادشاہوں اور عظیم لوگوں کے سامنے کھڑے ہونے کے آداب نہ آتے ہوں۔ جو دائیں بائیں متوجہ ہوتا ہو۔ اس مقام پر آپ ﷺ کے کمال ادب کے بارے بتایا۔ آپ ﷺ نے کسی جانب توجہ نہ کی۔ آیاتِ ربانیہ اور عجائب کے علاوہ کسی اور جگہ نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ بلکہ آپ ﷺ اس عبد کامل کی طرح کھڑے ہوئے جس کا ادب اس پر لازم کرتا ہے کہ وہ سر جھکائے رکھے اور صرف اس چیز کی طرف توجہ کرے جو اس کی مراد ہے کسی اور چیز کی طرف توجہ نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ دل اضطراب سے پاک تھا۔ اس پر طمانیت اور سکون چھایا ہوا تھا۔ یہ کمال کی انتہاء ہے۔ زیغ البصر سے مراد یہ ہے کہ نظر کا ایک جانب پھر جانا۔ اور تاحدِ نگاہ اسے آگے لے جانا۔ اس سورت میں آپ ﷺ کے لیے یہ تنزیہ بھی بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کا عمل مبارک گمراہی ہو، قصد مبارک ضلالت سے اور کلام مبارک خواہشات سے پاک ہے۔ دل اس سے پاک ہے کہ وہ بصارت کی تکذیب کرے۔ نگاہِ ناز ٹیڑھے پن اور سرکشی سے پاک ہے۔ یہ آپ ﷺ کی تعریف ہے:

تلك المكارم لا قعبان من لبن
شيبا بماء فعادا بعد ابوالا

ترجمہ: ''یہ مکارم اخلاق دودھ کے ایسے پیالے نہیں جن میں پانی ملایا گیا جو بعد میں پیشاب میں تبدیل ہو جائیں۔''

اللباب میں امام رازی کی تبع میں ہے: ''البصر کا لام دو وجوہات کا احتمال رکھتا ہے: معروف یعنی حضور پاک ﷺ کی نگاہِ ناز درماندہ نہ ہوئی۔ اس اعتبار سے اس کی کئی وجوہ ہیں۔ اگر ہم کہیں کہ سدرۃ پر سونے کے بستر اور سونے کی ٹڈیاں چھائی ہوئی تھیں تو معنی یہ ہوگا کہ حضور اکرم ﷺ نے نہ تو ان کی طرف توجہ کی اور نہ ہی ان میں مصروف ہوئے۔ آپ ﷺ کی نظر آپ ﷺ کے مقصود حقیقی پر رہی۔ اس صورت میں یہ بستر اور ٹڈیاں آپ ﷺ کے لیے امتحان نہ تھیں۔ اگر ہم کہیں کہ وہاں انوارِ الٰہیہ چھائے ہوئے تھے تو پھر اس میں دو

وجوہات ہیں۔

◆ آپ ﷺ نے دائیں بائیں توجہ نہ کی۔ بلکہ ان کے مشاہدہ میں مصروف رہے۔

◆ کمزوری کی وجہ سے آپ ﷺ کی نگاہِ ناز درماندہ نہ ہوئی۔ پہلی صورت میں آپ ﷺ کے کمالِ ادب کا بیان ہے۔ دوسری صورت میں آپ ﷺ کی قوت کا بیان ہے۔

لام میں دوسری وجہ یہ ہے کہ تعریف الجنس کے لیے ہو۔ یعنی عظمت کی ہیبت کی وجہ سے آپ ﷺ کی نگاہِ ناز بالکل مائل نہ ہوئی۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر یوں ہوتا تو عبارت کچھ اس طرح ہوتی "مَا زَاغَ بَصَرٌ" یہ عمومیت پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ نفی کے اظہار میں نکرہ عمومیت کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (انعام: ۱۰۳)

ترجمہ: "نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں۔"

یوں نہیں فرمایا: "لم يدركه بصر"

وَمَا طَغٰى (النجم: ۱۷)

ترجمہ: "اور نہ (حدِ ادب سے) آگے بڑھی۔

امام رازی نے لکھا ہے اس میں دو وجوہات ہیں:

◆ یہ عطف ہے ایک جملہ کا دوسرے جملہ پر۔

◆ یہ عطف ہے ایک جملہ کا عطف دوسرے جملہ پر کیا گیا جن کا بعض حصہ محذوف ہے۔

پہلی وجہ کی مثال "خرج زيد و دخل عمرو" مقدرہ کی مثال "خرج زيد و دخل" یہ دونوں وجہیں جائز ہیں۔ پہلی وجہ کے اعتبار سے گویا کہ رب تعالیٰ نے نور کے ظہور کے وقت کہا: "مَا زاغ بصر محمد وما طغى محمد بسبب الالتفات و لو التفت لكان طاغيا" دوسری وجہ ظاہر ہے اگر کہا جائے کہ سدرۃ پر چھانے والی چیز ٹڈیاں تھیں تو معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے رب تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف توجہ نہ کی۔

آپ ﷺ نے نہ ٹڈیوں اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور کی طرف توجہ کی۔ اگر چھانے والا نور ہو تو معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی نگاہِ ناز انوارِ الٰہیہ سے مائل نہ ہوئی۔ لیکن رب تعالیٰ نے مَا مَالَ وَمَا جَاوَزَ نہ فرمایا۔ کیونکہ اس جگہ میل اور تجاوز کا ذکر کرنا مذموم ہے۔ لہٰذا اس جگہ الزیغ اور الطغیان کا تذکرہ کیا۔ اس میں ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ حضور ﷺ کے یقین کی شدت تک پہنچنے کی تفصیل ہے وہ یقین جس کے اوپر یقین نہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی نگاہِ ناز راستہ سے نہ ہٹی۔ آپ ﷺ نے خلافِ حقیقت کچھ نہ دیکھا۔ اس شخص کے برعکس جو سورج کو دیکھتا ہے۔ پھر وہ سفید چیز کو دیکھے تو وہ اسے زرد یا سبز نظر آتی ہے۔ دیکھنے کی راہ سے آپ ﷺ کی نگاہ نہ ہٹی۔ "وما طغی" کا معنی ہے کہ آپ ﷺ نے معدوم کو موجود تصور نہ کیا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے تجاوز نہ کیا جس کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۸﴾ (النجم:۱۸)

اللباب میں ہے "الکبریٰ" میں دو وجوہ ہیں: اظہر یہ ہے کہ مفصول ہے۔ رأی من آیات ربہ حال مقدم ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی: "لقد رأی الآیات الکبریٰ من آیات ربہ" دوسرا احتمال یہ ہے کہ من آیات ربہ الرؤیۃ کا مفعول ہے۔ الکبریٰ، آیاتِ ربہ کی صفت ہے۔ اس جمع کی صفت واحد مؤنث لگانا درست ہے۔ اس کا یہاں فاصلہ ہونا بہت عمدہ ہے۔

امام رازی نے لکھا ہے: "الکبریٰ میں دو احتمال ہیں:

1. یہ محذوف کی صفت ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: لقد رای من آیات ربہ۔
2. یہ آیاتِ ربہ کی صفت ہے۔ اس صورت میں رأی کا مفعول محذوف ہوگا۔ اصل عبارت یوں ہوگی: "رای من آیات ربہ الکبریٰ آیۃً او شیئًا"۔

امام قرطبی نے لکھا ہے: "روا ہے کہ من زائدہ ہو یعنی "رأی آیات ربہ الکبریٰ"۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس سے مراد آپ ﷺ کا حضرت جبرائیل امین کو اصلی صورت میں دیکھنا ہے۔"

امام نے لکھا ہے: ''ظاہری بات یہی ہے کہ ان آیات سے مراد اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اگرچہ یہ علامت بھی عظیم ہے۔ لیکن رایات میں ہے کہ رب تعالیٰ کی مخلوق ایسی بھی ہے جو ان سے بھی بڑی ہے۔ الکبریٰ اکبر کی تانیث ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: "رأی من آیات ربہ آیات ھی اکبر الآیات"

امام احمد، امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل امین کو دیکھا۔ انہوں نے رفرف کا حلہ پہن رکھا تھا۔ انہوں نے آسمان اور زمین کے مابین فضا کو بھر رکھا تھا۔

حافظ نے لکھا ہے کہ اس روایت سے علم ہوتا ہے کہ رفرف سے مراد حلہ ہے۔ یہ فرمانِ باری تعالیٰ بھی اس کی تائید کرتا ہے:

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ۔ (الرحمٰن:۷٦)

ترجمہ: ''وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسند پر جو از حد نفیس۔''

رفرف کی اصل وہ چیز ہے جو دیباج کی ہو۔ نرم ہو۔ عمدہ ہو۔ پھر اس کا استعمال پردہ میں ہونے لگا۔ ہر وہ عمدہ چیز جسے تہ کیا جائے تو وہ مڑ جائے وہ رفرف ہے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے: ''شبِ معراج کو آپ ﷺ نے اپنی سیر کو جاتے وقت اور واپس آتے وقت یہی دیکھا تھا۔ یہ بہت احسن ہے۔''

امام نے لکھا ہے: ''یہ آیت طیبہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شبِ معراج کو حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کیا تھا۔ آپ ﷺ نے آیاتِ الٰہیہ کو دیکھا تھا۔ مگر اس میں اختلاف ہے۔ دلیل پکڑنے کی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رؤیت آیات پر قصۂ معراج کو ختم کیا ہے۔ فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا۔ (الاسراء:۱)

ترجمہ: ''پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں۔''

حتیٰ کہ فرمایا:

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ (الاسراء:۱)

ترجمہ:"تاکہ ہم دکھائیں آپ کو اپنی نشانیاں۔"

اگر آپ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہوتا تو ممکنات میں سے سب سے بڑی بات ہوتی۔ یہ آیت رؤیت کے لیے ہوتی۔ کیونکہ رؤیت سب سے بڑی چیز ہے۔" ابن کثیر نے لکھا ہے "اہل السنۃ والجماعۃ میں سے جس نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اس شب کو رویۃ واقع نہیں ہوئی تھی اس نے ان دونوں آیات سے استدلال کیا ہے۔ اگر آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کی خبر دیتا۔ لوگوں کو بتاتا۔

❀❀❀❀

شب معراج دیدارِ الٰہی میں علماء کا اختلاف

وہ درست مؤقف جس پر اہلِ حق ہیں وہ یہ ہے کہ از روے عقل رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے محال نہیں ہے۔ اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ آخرت میں رؤیت ہوگی۔ اہلِ ایمان رب تعالیٰ کی زیارت کریں گے۔ بدعتیوں کے ایک گروہ نے یہ گمان کیا ہے کہ رب تعالیٰ کو اس کی مخلوق میں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ دیدارِ الٰہی عقلاً محال ہے لیکن یہ مؤقف واضح خطاء اور بہت بڑی جہالت ہے۔

کتاب حکیم کی ادلہ، سنت مطہرہ، اجماع صحابہ کرام اور بعد کے علماء کا اس بات پر اجماع عیاں ہے کہ آخرت میں دیدارِ الٰہی ہوگا۔ اکیس صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے یہی روایت کیا ہے۔ اس کے بارے آیاتِ قرآنیہ مشہور ہیں۔ اہلِ بدعت کے اس پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات اہل السنۃ کے متکلمین کی کتب میں مذکور ہیں۔ دنیا میں دیدارِ الٰہی عقلاً اور سمعاً ممکن ہے۔ اہلِ حق کا مؤقف یہ ہے کہ رؤیت وہ قوت ہے جسے رب تعالیٰ اپنی مخلوق میں پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں شعاعوں کا متصل ہونا شرط نہیں اور نہ ہی مرئی کا سامنے ہونا شرط ہے۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے یہ عادت رواں ہوگئی ہے۔ یہ اتفاق کی جہت سے ہے شرط کی جہت سے نہیں۔ ہمارے آئمہ عظام نے عمدہ دلائل سے اسے ثابت کیا ہے۔ رؤیت باری تعالیٰ کے لیے جہت ہونا لازم نہیں۔ رب تعالیٰ اس سے بلند و برتر ہے۔ بلکہ اہلِ ایمان اسے جہت کے بغیر دیکھیں گے جیسے وہ جانتے ہیں کہ وہ کسی جہت میں نہیں ہے۔ انتہائی اختصار کے ساتھ اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی ذات موجود ہے۔ ہر موجود کو دیکھنا صحیح ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ کی زیارت کرنا بھی صحیح ہے۔ حکم اپنے وجود اور عدم کے لیے اپنی علت کے اردگرد گھومتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ موجود ہونا ہی رؤیت کی صحت کے لیے علت ہے۔ اس کا وقوع اور نہ سمجھ سکنا اس کے جواز کو لازم نہیں کرتا۔ رب تعالیٰ کی

سنت مطہرہ یہی ہے کہ اس نے اسے ہم میں پیدا نہیں کیا۔ مگر یہ جواز ہے کہ وہ یہ ہم میں پیدا کر دے۔ کیونکہ یہ محال نہیں۔ اس میں اور بھی ابحاث ہیں جو اہلِ کلام کی کتب میں موجود ہیں۔ دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے دیدار کی التجاء کی۔ عرض کی:

رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ (الاعراف: ۱۴۳)

ترجمہ: "اے میرے رب مجھے دیکھنے کی قوت دے تا کہ میں تیری طرف دیکھ سکوں۔"

ان کا اعتقاد تھا کہ رب تعالیٰ کا دیدار ہو سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے التجاء کی۔ اس آیت طیبہ میں دو دلیلیں ہیں:

یہ محال ہے کہ ایک نبی کو یہ علم نہ ہو کہ رب تعالیٰ کے لیے کیا روا ہے اور کیا روا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس چیز کی التجاء کرتا ہے جو جائز ہو اور محال نہ ہو۔ کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام محال کا سوال نہیں کرتے۔ لیکن اس امر کا وقوع اور مشاہدہ ہونا اس غیب سے ہوتا ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے یا وہ ذاتِ والا جانتی ہے جسے وہ بتاتا ہے اور آگاہ کرتا ہے۔ رب تعالیٰ نے انہیں ایسا جواب دیا جو جواز کے لیے منافی نہیں ہے۔ فرمایا:

لَنۡ تَرٰىنِیۡ ۔ (الاعراف: ۱۴۳)

ترجمہ: "تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے مجھے۔"

لَنۡ اُرٰی نہیں فرمایا جس سے اس کی نفی کی طرف اشارہ ملتا ہو۔ یعنی تم میرا دیدار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ وصف ابھی تم میں نہیں پایا جاتا۔ ان کے لیے ان چیز کی تمثیل بیان کی جو ان سے اقوی اور اثبت تھی یعنی پہاڑ۔ فرمایا:

وَلٰكِنِ انۡظُرۡ اِلَى الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ (الاعراف: ۱۴۳)

ترجمہ: "البتہ دیکھو اس پہاڑ کی طرف سو اگر یہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تو تم بھی دیکھ سکو گے مجھے۔"

دوسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے لیے اپنی رؤیت کو کوہِ طور کے ساتھ معلق کیا۔ اگر کوہِ طور تجلی کے وقت برقرار رہا تو انہیں دیدارِ الٰہی سے شاد کام کیا جائے گا۔ وہ چیز جسے ممکن کے ساتھ معلق کیا جائے۔ وہ ممکن ہوتی ہے۔ کیونکہ تعلیق کا معنی ہے معلق بہ کے

ثبوت کے وقت معلق کے ثبوت کے بارے میں خبر دینا۔ اس پر یہ جملہ شرطیہ خبریہ ہے بشرطیکہ جزاء دراصل خبر ہو۔ جیسے کہ یہاں ہے۔ لہٰذا رؤیت کا امکان لازمی طور پر ثابت ہو گیا ہے۔ رب تعالیٰ نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے۔ محال تو بالکل کسی چیز پر وقوع نہیں ہوتا۔ جب امکان ثابت ہو گیا تو امتناع اٹھ گیا۔ حضرت موسیٰ کی گذارش:

تُبْتُ اِلَیْكَ۔ (الاعراف: ۱۴۳)

ترجمہ: "میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں۔"

یعنی میں اس سے توبہ کرتا ہوں کہ میں نے اس چیز کا سوال کیا جو میرے لیے دنیا میں مقدر نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ التجاء ان انوار کی شدت کی وجہ سے تھی جو آپ پر نازل ہوئے، حتیٰ کہ آپ بے ہوش ہو گئے۔ جیسے کہ تم اس جائز فعل کے بارے کہتے ہو جو تمہیں مشقت میں مبتلا کر دے۔ "میں ایسا کام کرنے سے توبہ کرتا ہوں۔"

قاضی ابوبکر الھذلی نے لکھا ہے کہ اس آیت طیبہ کا مفہوم یہ ہے "دنیا میں کسی بشر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ مجھے دیکھ سکے۔ جو دنیا میں مجھے دیکھتا ہے وہ اسی وقت مر جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے پہاڑ کو دیکھا تھا وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔"

قاضی نے لکھا ہے "میں نے بعض اسلاف اور متاخرین کو سنا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ ممتنع ہے۔ یہ امتناع اس کی ذات کے اعتبار سے نہیں۔ کیونکہ اس کے جواز کا ثبوت ہے۔ یہ اس لیے ممتنع ہے کیونکہ اہلِ دنیا کی تراکیب اور قوی کمزور ہیں۔ یہ اعضاء متغیرہ ہیں۔ یہ ایسے حادثات کا سامنا کرتے ہیں جو جگر کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ موت اور فناء سے ڈرتے ہیں۔ انہیں دنیا میں رؤیت پر قوت حاصل نہیں ہے۔ آخرت میں ان کی ایک اور ترکیب ہوگی۔ انہیں ثابت اور مضبوط قوی بخشے جائیں گے۔ ان کے دلوں اور آنکھوں کا نور مکمل ہوگا۔ آخرت میں انہیں رؤیت کی قدرت حاصل ہوگی۔"

میں نے اسی طرح کا موقف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی دیکھا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے: "یہ دیدارِ الٰہی دنیا میں نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ذات باقی ہے۔ باقی کو فانی کے ساتھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ آخرت میں انہیں باقی رہنے والی نظریں ملیں گی۔ باقی کو باقی کے ساتھ دیکھا جا

سکے گا۔" امام مالک علیہ الرحمۃ کا کلام عمدہ اور خوبصورت ہے۔ اس میں محال ہونا قدرت کے ضعف کی وجہ سے ہے۔ رب تعالیٰ جسے چاہتا ہے اور جس وقت چاہتا ہے رؤیت کا بوجھ اٹھانے کی قدرت عطا کر دیتا ہے۔

حافظ نے لکھا ہے: "صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو اس گروہ کی تائید کرتی ہے مرفوعاً روایت ہے۔ "جان لو تم اپنے رب تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکو گے حتیٰ کہ مر جاؤ۔" اس روایت کو ابن خزیمہ نے حضرت ابوامامۃ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ جب دنیا میں رؤیت از روئے عقل جائز ہوگئی۔ یہ سماعت کے اعتبار سے ممتنع تھی۔ جس نے اسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ثابت کیا ہے اس کے لیے یہ کہنا روا ہے کہ متکلم اپنے خطاب کی عمومیت میں داخل نہیں ہوتا۔"

قاضی نے لکھا ہے: "جس نے اس سے اختلاف کیا ہے اس کے لیے رب تعالیٰ کا یہ فرمان حجت نہیں ہے۔"

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز (الانعام: ۱۰۳)

ترجمہ: "نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں۔"

کیونکہ اس آیت طیبہ کی تاویلات میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ادراک سے مراد احاطہ ہے۔ اس میں مطلق رؤیت کی نفی نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ کفار کی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس کا صحیح جواب یہ ہے "اس نفی میں عموم اوقات یا عموم حالات میں سے کسی حالت پر کوئی دلالت نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ یہ مراد کہاں سے ثابت ہوگئی کہ اوقات میں سے کسی وقت میں اور احوال میں سے کسی حال میں نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ بلکہ اسے دار دنیا کی نسبت کے اعتبار سے محمول کرنے کا یقین ہو جائے گا۔ تاکہ دلائل سمعیہ کو جمع کیا جا سکے۔"

امام قرطبی نے المفہم میں لکھا ہے: "ابصار جمع ہے۔ اس کے ساتھ الف لام لگایا گیا ہے جو تخصیص کو قبول کرتا ہے۔ یہ سمع کے اعتبار سے ثابت ہے۔ رب تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ (المطففین: ۱۵)

ترجمہ: ''یقیناً انہیں اپنے رب سے اس دن روک دیا جائے گا۔''

اس سے مراد کفار ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ (القیامۃ: ۲۲،۲۳)

ترجمہ: ''کئی چہرے اس روز تر وتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

انہوں نے لکھا ہے کہ جب یہ آخرت میں جائز ہے تو دنیا میں بھی جائز ہے۔ کیونکہ دیکھنے والے کے اعتبار سے دونوں اوقات برابر ہیں۔'' حافظ نے لکھا ہے: ''یہ عمدہ استدلال ہے۔''

اس آیت طیبہ سے رؤیت کے امکان کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے۔ اگر رویت ممتنع ہوتی تو نفی رؤیت کی وجہ سے آیت سے مدح حاصل نہ ہوسکتی۔ اس لزوم کی وجہ یہ ہے کہ ممتنع اپنی ذات کی حد میں منافی ہوتا ہے۔ اس کی نفی مدح کی صفت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ وہ لازمی ہوتا ہے۔ لیکن معدوم کی رؤیت ممتنع ہوتی ہے۔ عدم رؤیت کی وجہ سے اس کی مدح نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ''المعدوم لایُرٰی'' مدح نہیں ہوگی۔ کیونکہ معدوم کی رؤیت ممتنع ہے۔ رب تعالیٰ کی رؤیت کے عدم کی نفی سے مدح ثابت ہوسکی ہے۔ لہٰذا اس کی رؤیت ممکن ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ عدم رؤیت سے نفی سے مدح رؤیت باری تعالیٰ کے امکان کی وجہ سے ہوگی۔ لیکن اسے دیکھا نہیں جا سکتا کیونکہ امتناع ہے۔ نگاہیں اس میں معذور ہیں۔ کبریائی اور جلال کے حجابات ہیں۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کی رویت ممتنع ہے۔ لیکن اس پر صفات سلبیہ ایسی صفات ہیں جو مدح کرتی ہیں۔ اگر ہم آیتِ طیبہ میں ادراک سے مراد وہ رؤیت لیں جو مرئی کی جوانب اور حدود کا احاطہ کر لے تو اس وقت یہ آیت طیبہ نہ صرف رؤیت کے جواز پر دلالت کرے گی بلکہ وقوع کے تحقق پر بھی دلالت کرے گی۔ کیونکہ اسے بطور مدح ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی دلالت سے جواز کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا معنی یہ ہوگا کہ جب تو اسے دیکھے گا تو تیری نگاہ اس کا احاطہ نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ وہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ وہ نگاہوں سے دیکھا تو جاسکتا ہے لیکن احاطہ کے اعتبار سے نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں کیونکہ وہ قطعی،

طور پر تناہی سے پاک ہے۔ وہ ان حدود سے منزہ ہے جو انتہائیں اور جوانب ہیں۔ غیر متناہی چیز کا احاطہ محال ہوتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول حدیث پاک کی شرح میں آئے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں رویت کے جواز کا قول بھی ہوگا۔ لیکن یہ سعادت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ جس کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہے وہ گمراہ ہے۔ امام موفق الدین الکاشی اور امام مہدوی نے اپنی اپنی تفاسیر میں اس کے کفر کا قول کیا ہے۔ امام جمال الدین الاردبیلی نے کتاب الانوار میں لکھا ہے: ”جب دیدار کے بارے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے عرض کی تو یہ انہیں حاصل نہ ہوسکا تو یہ لوگوں میں سے کسی اور کو کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔“ لیکن اس امر میں توقف بہتر ہے۔

فصل

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج رب تعالیٰ کا دیدار کیا تھا یا نہیں۔ اس کے بارے دو موقف ہیں۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دیدار کی نفی کی ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مشہور ہے۔ بہت سے محدثین اور متکلمین نے یہی موقف اپنایا ہے۔ امام دارمی نے مبالغہ کرتے ہوئے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کا دیدار کیا تھا۔ عبدالرزاق نے معمر سے اور وہ حضرت حسن سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رب تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہتے تھے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا انکار انہیں شدید لگتا تھا۔ حضرت ابن عباس کے ساتھیوں حضرت کعب الاحبار، امام زہری، معمر اور دیگر آئمہ کا یہی موقف ہے۔ الشیخ ابوالحسن الاشعری اور ان کے پیروکاروں اور ابن خزیمہ کا یہی موقف ہے۔ پھر ان کا اختلاف ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دلِ مبارک سے یا چشمانِ مقدس سے اس کی زیارت کی تھی۔ امام احمد سے یہ دونوں اقوال منقول ہیں۔ امام نووی نے لکھا ہے ”اکثر علماء کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج کو اپنے رب تعالیٰ کو

اپنے سرِ اقدس کی مبارک آنکھوں سے دیکھا تھا۔عنقریب ان کے دلائل کا تذکرہ ہوگا۔

ایک گروہ نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے کیونکہ دلائل کے تعارض کی وجہ سے نہ نفی کا قول کیا ہے نہ اثبات کا۔امام قرطبی نے اس کو راجح کہا ہے۔محققین کی ایک جماعت نے یہی مذہب اختیار کیا ہے یہ چیز اسے قوی کرتی ہے کہ اس ضمن میں کوئی دلیل قاطع نہیں ہے۔دونوں گروہوں نے ایسے دلائل سے استدلال کیا ہے جو ایک دوسرے کے معارض ہیں۔اوران میں تاویل ہوسکتی ہے۔یہ فضیلت کا مسئلہ نہیں جس میں ظنی دلائل کافی ہوں بلکہ یہ عقائد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔اس میں دلیل قطعی کی ضرورت ہے۔

امام سبکی نے سیف المسلول میں لکھا ہے"اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دلیل قطعی اور متواتر ہی ملے بلکہ اگر ایک صحیح حدیث مل جائے وہ آحاد کی روایت ہوتو اس پر اعتماد کرنا درست ہے۔کیونکہ اس کا تعلق اعتقاد کے مسائل سے ہے جن میں دلیل قطعی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔"

قاضی علیہ الرحمۃ نے الشفاء وغیرہ میں لکھا ہے"جواز میں تو کوئی شک نہیں ہے۔کیونکہ ان آیاتِ طیبات:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ (الانعام:۱۰۳)

ترجمہ:"نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں۔"

لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ (الاعراف:۱۴۳)

ترجمہ:"تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے مجھے البتہ دیکھو اس پہاڑ کی طرف سو اگر یہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تو تم بھی دیکھ سکو گے مجھے۔"

میں کوئی ایسی نص نہیں ہے جو رؤیت کے خلاف ہو۔بلکہ یہ جواز کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا تھا تو اس کے بارے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے نہ ہی کوئی قابل اعتماد نص ہے کیونکہ اس میں سورۃ النجم کی دو آیتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ (النجم:۱۱)

ترجمہ: ''نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشمِ مصطفیٰ) نے۔''

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ (النجم:۱۷)

ترجمہ: ''اور نہ درماندہ ہوئی چشم (مصطفیٰ) اور نہ حدِ ادب سے آگے بڑھی۔''

لیکن ان میں آئمہ کا اختلاف ہے۔ ان میں رؤیت اور عدم رؤیت کا احتمال ممکن ہے کیونکہ ان میں یہ صراحت نہیں ہے۔ اس ضمن میں آپ ﷺ سے کوئی قطعی اور متواتر روایت بھی منقول نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس کی یہ روایت کہ آپ ﷺ نے اپنے سرِ اقدس کی آنکھوں سے دیکھا تھا یا دل سے دیکھا تھا۔ یہ اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے۔ انہوں نے اسے حضورِ اکرم ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا حتیٰ کہ اس کا اعتبار کیا جائے اور اس اعتقاد پر عمل کیا جائے کہ آپ ﷺ نے اپنے ربِ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا۔ اسی طرح کی روایت حضرت شریک نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے ربِ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا۔ حضرت معاذ کی روایت "رائیت ربی فی احسن صورۃ" کی سند اور متن مضطرب ہے۔ حضرت ابوذر کی روایت الفاظ کے اعتبار سے مختلف احتمال رکھتی ہے کہ آپ ﷺ نے ربِ تعالیٰ کا دیدار کیا یا نہ کیا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی ذات کو نور فرمایا ہے۔ روایت ہے "نورانیّ اراہ" یعنی وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ کیونکہ نور کو دیکھنے سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ دوسری روایت ہے "نور انّی اراہ" وہ نور ہے میں نے اس کو دیکھا ہے۔

قاضی نے لکھا ہے ''اس رؤیت کا وقوع ہمارے لیے نہیں ہوا۔ نہ ہی میں نے اسے اصول میں سے کسی اصل میں دیکھا ہے۔ یہ محال ہے کہ ربِ تعالیٰ کی ذاتِ والا نور ہو۔ نور جسم ہوتا ہے۔ ربِ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس اس سے بلند و بالا ہے۔ اسی لیے اس کا نامِ مبارک ''نور'' ہے یعنی نور والا یا نور کا خالق۔ ایک اور روایت میں ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''میں نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کی: ''کیا آپ ﷺ نے اپنے ربِ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے نور دیکھا ہے۔'' ان میں سے کسی ایک روایت سے استدلال کرنا

درست نہیں کیونکہ یہ وضاحت کر رہی ہیں کہ آپ ﷺ نے اسے نہیں دیکھا۔ اگر یہ صحیح ہو" میں نے نور دیکھا ہے" تو اس کا مطلب ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بتایا کہ آپ ﷺ نے رب تعالیٰ کو نہیں دیکھا بلکہ نور دیکھا۔ جس نے آپ ﷺ کو دیدارِ الٰہی سے روک دیا۔ یہ فرمان اس فرمان کی طرف راجع ہے "نور انّٰی اَراہ" میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اس کا حجاب نور ہے جو آنکھوں کو چندھا دیتا ہے۔ یہ حدیث مبارک معنی میں اس روایت کے مشابہ ہے "حجابہٗ نور" (مسلم) الاکمال میں ہے "ہمارے بعض مشائخ نے اس میں توقف کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے "یہ کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ لیکن یہ جائز ہے۔ رؤیت باری تعالیٰ دنیا میں جائز ہے۔"

پہلے موقف کے دلائل

امام بخاری، امام مسلم، عبدالرزاق عبد بن حمید، ترمذی اور ابن جریر وغیرہم نے حضرت مسروق سے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے اضافہ کیا ہے "حضرت ابن عباس حضرت کعب سے ملے۔ میدانِ عرفات کا مقام تھا۔ انہوں نے ان سے ایک سوال کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: "ہم بنوہاشم یہی گمان کرتے ہیں (کہ آپ نے ربِ تعالیٰ کا دیدار کیا ہے) دوسری روایت میں ہے "حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کو دو بار دیکھا۔" حضرت کعب نے تکبیر کہی جس کی گونج پہاڑوں سے ابھری۔ پھر فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اپنا دیدار اور اپنا کلام حضور انور ﷺ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے مابین تقسیم کیا ہے۔ (حضور ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کو دو بار دیکھا۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے دو بار اس سے گفتگو کا شرف حاصل کیا۔ پھر انہوں نے اتفاق کرلیا۔

حضرت مسروق حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے کہا: "میں نے عرض کی: "امی جان! کیا حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا تھا؟" انہوں نے فرمایا: "جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ جو شخص تم سے تین امور بیان کرے اس نے جھوٹ بولا ہے۔ یا اس نے رب تعالیٰ پر بہتان باندھا ہے۔ جو تم سے یہ بیان کرے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا

ہے۔انہوں نے جھوٹ بولا ہے یا رب تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان لگایا ہے۔" پھر انہوں نے یہ آیت طیبہ تلاوت کی:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٠٣﴾ (الانعام:۱۰۳)

ترجمہ:"نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں اور وہ گھیرے ہوئے ہے سب نظروں کو اور وہ بڑا باریک بین اور پوری طرح باخبر ہے۔"

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ۔ (الشوریٰ:۵۱)

ترجمہ:"اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ۔"

اگر کوئی یہ کہے کہ آپ ﷺ جانتے ہیں کہ کل کیا ہوگا؟ تو اس نے بھی جھوٹ بولا ہے۔ یا رب تعالیٰ پر بڑا بہتان باندھا ہے۔" پھر انہوں نے آیت کریمہ تلاوت کی:

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ (لقمان:۳۴)

ترجمہ:"اور کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائے گا۔"

جو تم سے یہ کہے کہ آپ ﷺ نے کچھ چھپایا ہے اس نے بھی بہتان باندھا ہے۔ یا جھوٹ بولا ہے۔ پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت کی:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ (المائدۃ:۶۷)

ترجمہ:"اے رسول پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ کا پیغام۔"

بلکہ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل میں دوبار دیکھا۔" امام احمد اور امام مسلم نے یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت مسروق نے عرض کی:

"میں ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں سیدھا ہو گیا۔ میں نے عرض کی: کیا یہ رب تعالیٰ کا فرمان نہیں ہے؟

وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ﴿۱۳﴾ (النجم:۱۳)

ترجمہ: ''اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا۔''

صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا۔ میں نے عرض کی: ''کیا آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! میں نے حضرت جبرائیل کو اترتے وقت دیکھا تھا۔''

امام احمد نے حضرت ہمام سے، حضرت امام مسلم نے حضرت معاذ بن ہشام سے اور یزید بن ابراہیم نے ان سب سے حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ''میں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے عرض کی: ''اگر میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت کر لیتا تو آپ ﷺ سے ایک سوال پوچھتا۔'' انہوں نے فرمایا: ''کون سا؟'' میں نے عرض کی: ''یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کی زیارت کی ہے؟'' انہوں نے فرمایا: میں نے آپ ﷺ سے التجاء کی تھی۔ میں نے عرض کی: ''یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا تھا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ نور ہے وہ کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔'' (یا ''وہ نور ہے میں نے اس کی زیارت کی ہے) دوسری روایت میں ہے ''میں نے نور دیکھا ہے۔''

تنبیہات

- ① ایک جماعت نے لکھا ہے کہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے کسی مرفوع روایت سے رؤیت کی نفی نہیں کی۔ اگر ان کے پاس مرفوع روایت ہوتی تو وہ اس کا تذکرہ کرتیں۔ انہوں نے آیتِ طیبہ کے ظاہر سے استدلال کیا تھا۔ جو کچھ اس نظریہ کے حامل لوگوں نے کہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حضرت ام المومنین کے فرمان سے صحیح آگاہ نہ تھے کہ انہوں نے اس کے بارے حضوا کرم ﷺ سے سوال کیا۔ عرض کی: ''یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے حضرت جبرائیل کو نیچے اترتے دیکھا ہے۔''

◆ جو شخص یہ کہتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کی عقل کی مطابق ان سے گفتگو کی تھی جس نے ان کے مؤقف میں لغزش کا ارادہ کیا ہے۔ وہ خطا کار ہے۔ وہ بے ادب ہے۔

◆ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے معراج سے قبل حضور اکرم ﷺ سے یہ سوال کیا تھا۔ جس میں آپ ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا تھا۔ جو فرمایا تھا۔ اگر وہ معراج کے بعد سوال کرتے تو آپ ﷺ انہیں اثبات میں جواب ارشاد فرماتے۔ یہ مؤقف کمزور ہے حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے معراج کے بعد سوال کیا تھا۔ ان کے لیے بھی رؤیت ثابت نہ ہو سکی۔

◆ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اس آیتِ طیبہ سے استدلال کیا ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کی مخالفت کی ہے۔ امام ترمذی نے حسن روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا ہے۔“ حضرت عکرمہ نے عرض کی: ”کیا رب تعالیٰ کا ارشاد نہیں:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز (الانعام:۱۰۳)

ترجمہ: ”نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں۔“

انہوں نے کہا: ”تم پر تعجب ہے۔ وہ اس کا نور ہے۔ جس وقت وہ اس نور کے ساتھ تجلی فرمائے جو اس کا نور ہے۔ آپ ﷺ نے دو بار اپنے رب کا دیدار کیا تھا۔“ لب لباب یہ ہے کہ آیت طیبہ میں مراد رؤیت کے وقت اس کا احاطہ کرنا ہے۔ اصل رؤیت کی نفی نہیں ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ الادراک سے مراد احاطہ ہے۔ رب تعالیٰ کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ جب احاطہ کی نفی کے بارے نص وارد ہو گئی تو اس سے احاطہ کے بغیر رؤیت کی نفی لازم نہیں آتی۔ جو رب تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کرے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا ۔ (الشوریٰ:۵۱)

ترجمہ: ”اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ (براہِ راست) مگر وحی کے طور پر۔“

اس کے کئی جوابات دیے گئے ہیں:

① رؤیت کے وقت کلام کا ہونا ضروری نہیں ۔رؤیت کلام کے بغیر جائز ہوگی۔

② یہ عام ہے جو سابقہ دلائل سے مخصوص ہے۔

③ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس جگہ مراد واسطہ کے بغیر کلام کرنا ہے۔اگر چہ اس قول کا احتمال ہے لیکن جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس جگہ وحی سے مراد الہام اور خواب میں زیارت کرنا ہے۔ان میں سے ہر ایک کو وحی کہا جاتا ہے۔

اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ (الشوریٰ:۵۱)

ترجمہ:"یا پس پردہ۔"

اس کے بارے امام واحدی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ کسی کے ساتھ آواز بلند کیے بغیر کلام کرے۔وہ اس طرح رب تعالیٰ کا کلام سنیں کہ اس کی ذات کی زیارت نہ کریں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہاں حجاب ہو جو ایک جگہ کو دوسری جگہ سے جدا کر رہا ہو۔جو محجوب کی حد بندی پر دلالت کر رہا ہو۔یہ اسی طرح ہے کہ جیسے پس پردہ سنا جائے اور متکلم نظر نہ آئے۔

⑤ حضرت کعب کا یہ فرمان کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے دو بار کلام کیا تھا۔"اس میں اعتراض کی گنجائش ہے۔حق یہ ہے کہ انہوں نے کئی بار یہ شرف حاصل کیا تھا۔ارشاد فرمایا:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ (طٰہٰ:۱۷)

ترجمہ:"اور (ندا آئی) یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ!"

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ (طٰہٰ:۸۳)

ترجمہ:"اور کس وجہ سے تم جلدی آگئے اپنی قوم سے اے موسیٰ!"

فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ۔ (طٰہٰ:۸۵)

ترجمہ:"ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے تمہاری قوم کو تمہارے (چلے جانے کے) بعد۔"

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ۔ (الاعراف:۱۴۵)

ترجمہ:"پھر (فرمایا) پکڑلو اسے مضبوطی سے۔"

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ۔ (طٰہٰ:۴۳)

ترجمہ: ''آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس۔''

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ۔ (طٰہٰ:۳۹)

ترجمہ: ''میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جناب سے (تاکہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے) اور (اس تدبیر کا منشاء یہ تھا) کہ آپ کی پرورش کی جائے میری چشم (کرم) کے سامنے۔ یاد کرو جب چلتے چلتے آئی آپ کی بہن۔''

دوسرے موقف کے دلائل

◆ ابن کثیر اور ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس سے مطلق اور مقید روایات منقول ہیں۔ ان میں سے مطلق کو مقید پر محمول کرنا ضروری ہے۔ مقید وہ ہے جسے امام مسلم نے حضرت ابوالعالیۃ سے رب تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے نقل کی ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ۔ (النجم:۱۱)

ترجمہ: ''نہ جھٹلایا دل نے۔''

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ (النجم:۱۳)

ترجمہ: ''اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا۔''

اس روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے قلب انور سے دو بار رب تعالیٰ کی زیارت کی ہے۔ حضرت عطاء کی سند سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دلِ انور سے رب تعالیٰ کی زیارت کی ہے۔ ابن مردویہ نے اس آیت طیبہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے دل سے دیکھا تھا چشمانِ مقدس سے نہیں دیکھا تھا۔ امام نسائی اور ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے آپ ﷺ کے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: ''ہم نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں

نے اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا بلکہ دل سے دو بار اس کی زیارت کی ہے۔"
پھر انہوں نے یہ آیت طیبہ تلاوت کی:
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿٨﴾ (النجم:٨)

ترجمہ: "پھر وہ قریب ہوا اور قریب ہوا۔"

- حافظ نے لکھا ہے کہ رؤیت الفؤاد سے مراد دل انور سے دیکھنا ہے۔ اس سے صرف حصول علم مراد نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ ہمیشہ سے رب تعالیٰ کے بارے جانتے تھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لیے یہ ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنے قلبِ انور سے اسے دیکھا ہے۔ جو رؤیت آپ ﷺ کو حاصل ہوئی اسے آپ ﷺ کے قلبِ انور میں اس طرح تخلیق کیا گیا جس طرح کسی اور کے لیے آنکھ میں رؤیت تخلیق کی گئی۔" صاحب السراج نے لکھا ہے "اولیا کرام کا معاملہ آپ ﷺ کے برعکس ہے۔ جب وہ رؤیت یا مشاہدہ کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ اس سے معرفت مراد لیتے ہیں۔ یہ اہم امور میں سے ہے اسے یاد کرلو۔ بہت سے لوگ اس میں لغزش کھا جاتے ہیں۔" رؤیت کے لیے از روئے عقل کوئی مخصوص چیز ہونا شرط نہیں ہے۔ اگرچہ آنکھ کی تخلیق میں عادت یہی ہے۔ امام واحدی نے لکھا ہے "آپ ﷺ نے اپنے قلبِ انور سے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا تھا۔ اس صورت میں رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کی چشمِ مقدس کو دل میں بنا دیا تھا یا دل مبارک کے لیے بھی ایک آنکھ بنا دی تھی حتیٰ کہ آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کا صحیح دیدار کر لیا۔"
- حضرت ابن عباس سے یہ مقید روایات ہیں۔ ان سے حضرت ام المومنین کی نفی اور حضرت ابن عباس کے اثبات کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہ ان کی نفی کو آنکھ سے دیکھنے پر اور ان کے اثبات کو دل سے دیکھنے پر محمول کیا جائے۔
- ابن کثیر نے لکھا ہے: "وہ حدیث جسے امام احمد نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "رایت ربی عزّوجلّ" اس کی سند صحیح ہے۔ یہ صحیح کی شرط پر ہے۔ لیکن یہ حدیث المنام سے مختصر ہے۔

۵ ابن کثیر نے لکھا ہے ''جن راویوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چشمانِ مقدس سے دیکھا تھا تو یہ بہت غریب ہے کیونکہ اس ضمن میں کسی صحابی سے بھی کوئی روایت منقول نہیں ہے۔علامہ بغوی کا یہ قول ''ایک جماعت کا یہ مؤقف ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چشمِ مقدس سے دیکھا تھا'' یہ حضرات انس، حسن اور عکرمہ کا قول ہے۔'' اس میں اعتراض کی گنجائش ہے۔میں کہتا ہوں کہ امام بغوی نے اسے ابوالحسن الواحدی کی طرف منسوب کیا ہے۔ابن کثیر کا یہ قول بھی عمدہ نہیں کہ اس ضمن میں صحابہ کرام سے کچھ مروی نہیں۔طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ۔حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کو دوبار دیکھا۔ایک بار اپنی چشمِ مقدس سے اور دوسری بار اپنے قلب انور سے۔''

❀❀❀❀

کس وقت اور کس جگہ سے معراج کا سفر ہوا

اس باب میں دو فصلیں ہیں۔

فصل اول: جگہ کے بارے

امام بخاری نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ اس وقت بیت اللہ کے پاس تشریف فرما تھے۔ باب بدء الخلق میں بیت اللہ اور باب المعراج میں الحطیم کا ذکر کیا۔ کبھی الحجر کا ذکر کیا۔ یہ شک حضرت قتادہ کی طرف سے ہے۔ جیسے کہ امام احمد نے اپنی روایات میں عفان بن ھمام سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "بینما انا فی الحطیم" حضرت قتادہ نے بھی الحجر فرمایا ہے۔ حافظ نے لکھا ہے کہ الحجر سے مراد الحطیم ہی ہے۔ یہ بعید مؤقف ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ رکن اور مقام یا چشمۂ زمزم اور حجر کے مابین تھے۔ اگرچہ حطیم اور حجر میں جلوہ نما ہونے میں اختلاف ہے اس سے مراد وہ مبارک جگہ ہے جس میں سے اس مبارک سفر کا آغاز ہوا۔ کیونکہ یہ واقعہ متعدد بار رونما نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ واقعہ مخرج کے ایک ہونے کی وجہ سے ایک ہی ہے۔

امام زھری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے کاشانۂ اقدس کے چھت میں سوراخ کیا گیا جبکہ میں مکہ مکرمہ میں تھا۔'' امام واقدی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کو شعب ابی طالب سے معراج کرائی گئی۔ طبرانی نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر تھے۔ انہوں نے فرمایا: ''میں نے آپ ﷺ کو رات کے وقت غائب پایا۔ حافظ نے لکھا ہے کہ ان اقوال کو جمع کرنا ممکن ہے آپ ﷺ نے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر رات بسر فرمائی۔ ان کا گھر شعب ابی طالب کے پاس تھا۔ چھت میں سوراخ کیا گیا۔ گھر کی نسبت آپ ﷺ کی طرف کی گئی کیونکہ آپ ﷺ

اس میں جلوہ افروز تھے۔گویا کہ آپ ﷺ مالک تھے۔آپ ﷺ کو مسجد حرام کی طرف لے جایا گیا، آپ پر نیند کے اثرات تھے۔پھر مسجد کے دروازے کی طرف لے جایا گیا۔آپ ﷺ کو براق پر سوار کرایا گیا۔ابن اسحاق نے حسن کی مرسل روایت کی ہے کہ حضرت جبرائیل آپ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ کو مسجد کی طرف لے گئے۔یہ روایت بھی اسی جمع کی تائید کرتی ہے۔"

بعض علماء نے لکھا ہے کہ مختلف روایات "اسی اثناء میں کہ میں مسجد حرام میں تھا۔" "میں اپنے گھر میں تھا۔" "میں ام ہانی کے گھر تھا۔" میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ آپ ﷺ مسجد حرام میں تھے۔

دوسری فصل، مقام کے بارے

وہ صحیح موقف جس پر علماء کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ الاسراء (معراج) بعثت کے بعد ہوئی تھی۔وہ بات جس کا تذکرہ حضرت شریک کی روایت میں ہے کہ تین افراد آپ ﷺ کے پاس آئے ابھی آپ ﷺ پر نزولِ وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔اس میں ہے "اس رات آپ ﷺ نے انہیں نہ دیکھا حتیٰ کہ وہ دوسری رات آئے۔" انہوں نے دو بار آنے کے مابین مدت کا تعین نہیں کیا۔اسے اس امر پر محمول کیا جائے گا کہ دوسری بار آنا نزولِ وحی کے بعد تھا۔اس وقت معراج ہو چکی تھی۔اگر دونوں بار آنے میں مدت ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ مدت ایک رات ہو یا زیادہ راتیں ہوں یا کئی سال ہوں۔"

ابن کثیر نے لکھا ہے "اس پر محمول کرنا زیادہ ظاہر ہے۔ابن قیم نے اسے یقین کے ساتھ لکھا ہے۔حافظ نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔انہوں نے فرمایا: "اس سے حضرت شریک کی روایت سے اشکال دور ہو جاتا ہے۔اس سے اس امر پر اتفاق حاصل ہوتا ہے کہ معراج بعثت کے بعد اور ہجرت سے قبل عالم بیداری میں ہوئی۔اس سے خطابی اور ابن حزم کی تشنیع ختم ہو جاتی ہے کہ شریک نے اپنے اس دعویٰ سے اجماع کی مخالفت کی ہے کہ معراج بعثت سے پہلے ہوئی تھی۔" حافظ نے لکھا ہے کہ بعض شارحین نے جو لکھا ہے کہ یہ ان دو

راتوں کے مابین تھی جن میں سات یا نو یا تیرہ فرشتے تھے جو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ تو اس امر پر محمول کیا جائے گا کہ وہ فرشتے مختلف سالوں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے جیسے کہ شارح مذکور نے سمجھا ہے۔ بعض نے یہ جواب دیا ہے اس جگہ لفظ قبل مخصوص امر میں استعمال ہوا ہے مطلق نہیں ہے۔ اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ آپ ﷺ کو معراج نزولِ وحی سے قبل کرائی گئی۔ یعنی یہ اچانک ہوا تھا۔ امام زہری کی روایت بھی اسی تائید کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے کاشانہ اقدس کی چھت میں سوراخ کیا گیا۔"

اس میں اختلاف ہے کہ معراج کس سال ہوئی تھی۔ جمہور نے یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ ہجرت سے ایک سال قبل ہوئی تھی۔ امام نووی نے یہی موقف اختیار کیا ہے ابن حزم نے مبالغہ کرتے ہوئے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ قاضی نے لکھا ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے پانچ سال قبل ہوا تھا کیونکہ اس میں اختلاف نہیں کہ حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نماز کی فرضیت کے بعد آپ ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس میں بھی اختلاف نہیں کہ ان کا وصال ہجرت سے قبل ہو گیا تھا۔ اس میں بھی اختلاف نہیں کہ نمازِ شب معراج کو فرض ہوئی تھی۔ ابن دحیہ نے قاضی کی یوں گرفت کی ہے "وہ نماز جو انہوں نے آپ ﷺ کے ہمراہ پڑھنے کی سعادت حاصل کی تھی وہ بعثت کی ابتداء میں تھی۔ وہ دو رکعتیں صبح اور دو رکعتیں شام تھی۔ شب معراج پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا نماز کے فرض ہونے سے پہلے وصال ہو چکا تھا۔ (ابن سعد اور یعقوب بن سفیان)

معتمد موقف یہ ہے کہ جس نے یہ کہا اس کی مراد یہ ہے کہ جنہوں نے کہا ہے کہ فرض نماز سے قبل ان کا وصال ہوا تھا ان کی مراد پانچ نمازیں ہیں۔ اگر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مذکورہ بالا فرمان سچ ثابت ہو جائے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا وصالِ نماز فرض ہونے سے پہلے ہوا تھا۔ اس سے دونوں اقوال کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان کا وصال معراج سے پہلے ہوا تھا۔ عسکری نے روایت کیا ہے کہ ان کا وصال ہجرت سے سات سال قبل ہوا تھا۔ ان کے تذکرہ میں یہ تفصیل بیان ہوگی۔

معراج کس مہینہ میں ہوئی تھی۔ اس میں اختلاف ہے۔ ابن الاثیر نے جزم کے ساتھ

لکھا ہے۔ امام نووی نے فتاویٰ میں رقم کیا ہے کہ معراج ماہِ ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ ۲۷ ربیع الاول کی شب کو معراج ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے جمہور کا قول قرار دیا ہے۔ فتاویٰ الانبوی، اذرعی نے توسط میں، زرکشی نے الخادم میں دمیری نے حیاۃ الحیوان میں اور مسلم شریف کے بعض نسخوں میں اسی طرح لکھا ہے۔ فتاویٰ کے اکثر نسخوں میں ربیع الآخر لکھا ہوا ہے۔ ابن دحیہ نے الابتہاج میں، حافظ نے فتح میں اور ابن دحیہ نے التنویر والمعراج الصغیر، ابوشامہ نے الباعث میں اور حافظ نے فضائل رجب میں لکھا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ معراج رجب کے مہینہ میں ہوئی۔ امام نووی نے امام رافعی کی تبع کرتے ہوئے الروضۃ میں یہی لکھا ہے۔ ایک قول رمضان المبارک اور ایک قول شوال کا بھی ہے۔

ابن عطیہ نے یہ اختلاف لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ یہ صحیفہ شق ہونے کے بعد اور بیعۃ العقبہ سے پہلے ہوئی تھی۔ ابن دحیہ نے لکھا ہے: "ممکن ہے کہ یہ رات پیر کی مبارک شب ہو، ہجرت کی تاریخ کے حساب کے مقدمات اسی کی دلیل ہے۔ لب لباب یہ ہے کہ انہوں نے یہ استنباط کیا ہے۔ انہوں نے ولادتِ مبارکہ، بعث مبارکہ، معراج، ہجرت اور وصال مبارک کو پیر کے دن ہی ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے "یہ انتقالات نبویہ کی ہیئتوں سے وجودِ مسعود، نبوت، معراج اور وصال کے اعتبار سے پانچ ہیئتیں ہیں۔ آپ ﷺ کے حق میں پیر کا روز اسی طرح ہے جس طرح حضرت آدم کے حق میں جمعۃ المبارک تھا۔ اس روز میں ان کی تخلیق ہوئی۔ اسی میں انہیں زمین پر اتارا گیا۔ اسی میں ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اسی میں ان کا وصال ہوا۔ آپ ﷺ کے وجودیہ اور دینیہ اطوار ایک ہی دن کے ساتھ مختص ہیں۔ ابن شیبہ نے حضرت جابر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: "پیر کے روز حضور اکرم ﷺ کی ولادت، بعثت، معراج اور اسی میں آپ ﷺ کا وصال ہوا۔" اسی میں آپ ﷺ کو سیر کرائی گئی۔" اس امر پر اتفاق ہے کہ معراج رات کے وقت ہوئی تھی۔

تنبیہ

ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ معراج پیر کی رات کو ہوئی تھی۔ کیونکہ رات اس دن کے تابع

ہوتی ہے جو اس کے بعد ہوتا ہے۔ پھر لکھا ہے ''اس بات پر اجماع ہے کہ عرفہ کی شب وہ رات ہوتی ہے جو عرفہ کے دن سے پہلے ہوتی ہے۔'' بعض علماء فرماتے ہیں ''بعض لوگوں کے گمان کے مطابق ہفتہ کی رات جمعۃ کے بعد کی رات ہے۔'' نجات میں جو لکھا ہے: ''ہر دن کی رات وہ شب ہوتی ہے جو اس سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ مہینہ کی ابتداء رات سے ہوتی ہے اور اس کا آخر دن پر ہوتا ہے۔ ہمارے شوافع آئمہ نے یہی تفصیلات لکھی ہیں۔ عرفہ کی رات اگرچہ شرعی طور پر اس سے مؤخر ہوتی ہے۔ لیکن شرعاً حکم میں شامل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس مخصوص وقت میں وقوف مشروع قرار دیا گیا ہے۔ رب تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے اعتراض نہیں ہوگا۔

وَلَا الَّيۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ (یٰس:۴۰)

ترجمہ: ''اور نہ رات کی یہ طاقت ہے کہ دن سے آگے نکل جائے۔''

کیونکہ مفسرین نے اس کا ایک اور معنی لکھا ہے۔ مجاہد لکھتے ہیں: ''رب تعالیٰ کے فیصلہ اور علم میں ہے کہ دن رات کو نہیں چھوڑتا حتیٰ کہ اسے پالیتا ہے اور اس کی ظلمت مٹا دیتا ہے۔ رب تعالیٰ کے فیصلہ اور علم میں ہے کہ رات دن کو نہیں چھوڑتی اسے پالیتی ہے اور اس کے اجالے کو ختم کر دیتی ہے۔''

ضحاک نے لکھا ہے: ''کوئی دن اس طرف سے نہیں گزرتا بلکہ رات بھی اسی طرف سے گزر جاتی ہے۔'' امام بغوی نے لکھا ہے: ''وہ معلوم حساب سے ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے وقت سے پہلے نہیں آتا۔'' ایک قول یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی سلطنت میں دخل اندازی نہیں کرتے۔ رات کے وقت سورج طلوع نہیں ہوتا۔ دن کے وقت چاند روشن نہیں ہوتا۔ جب یہ دونوں اکٹھے ہو جائیں گے ایک دوسرے کو پالیں گے تو قیامت قائم ہو جائے گی۔ ایک قول یہ ہے کہ رات رات کے متصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کے مابین دن بطور فاصل ہوتا ہے۔

❀❀❀❀
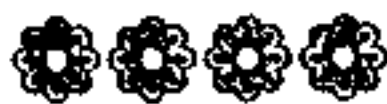
معراج کی کیفیت اور بار بار معراج کے بارے

اس باب میں دو فصلیں ہیں۔

پہلی فصل

معراج کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اجمالاً نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اور اس کی تفصیلات اور عجائب میں متفرق احادیث ہیں جو مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ ان کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ البتہ معراج کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ اس کے بارے علماء کے کئی اقوال ہیں:

یہ قول اکثر علماء کا ہے کہ معراج جسم انور اور روح اقدس کے ساتھ عالم بیداری میں ہوئی تھی۔ یہ مکہ مکرمہ سے لے کر بیت المقدس تک، پھر سماوات علیٰ سے لے کر سدرۃ المنتہیٰ اور جہاں تک رب تعالیٰ نے چاہا معراج ہوئی۔ قاضی لکھتے ہیں: ''یہ موقف ہی حق ہے۔ اسی پر آیت طیبہ کی نص دلالت کر رہی ہے۔ بہت سی احادیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ آیت طیبہ اور ان احادیث طیبہ سے عدول نہیں کیا جائے گا جو اس کے بارے وارد ہیں۔ نہ ہی اس حقیقت سے عدول کیا جائے گا۔ الفاظ سے اذہان جس کی طرف تیزی سے جاتے ہیں۔ تاویل کا سہارا صرف محال ہونے کی صورت میں لیا جاتا ہے جبکہ الفاظ کو ان کی حقیقت پر محمول کرنا متعذر ہو۔ جسمِ اطہر اور روح مبارک کے ساتھ معراج کرانے میں اور حالتِ بیداری میں معراج کرانے میں کوئی بھی چیز محال نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے تاویل کرنا پڑے۔ اگر معراج عالم نیند میں ہوتی تو یہ آیت اس طرح ہوتی۔ ''سبحان الذی اسریٰ بروح عبدہٖ'' بعبدہٖ کا لفظ نہ ہوتا۔ عبد سے حقیقت میں روح اور جسم مراد ہے۔ رب تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ (النجم:۱۷)

ترجمہ: "نہ درماندہ ہوئی چشم (مصطفیٰ) اور نہ (حد ادب سے) آگے بڑھی۔"

ملکوت کے عجائب میں جن عجائب کو دیکھنے کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا نگاہِ ناز نے ان سے عدول نہ کیا۔ نہ ہی ان سے تجاوز کیا۔ یہ بھی اس امر پر صراحت ہے کہ معراج عالم بیداری میں جسم اور روح کے ساتھ تھی۔ کیونکہ امر کو بصر کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ یہ عالم بیداری میں ہی ہو سکتا ہے کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے:

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ (النجم:۱۸)

ترجمہ: "یقیناً انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

اگر معراج نیند میں ہوتی تو اس میں نہ نشانی ہوتی نہ ہی معجزہ ہوتا۔ اگرچہ انبیائے کرام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں وہ ابلغیت اور خرقِ عادت امر نہیں ہوتا جو بیداری میں ہوتا ہے اگر یہ عالم نیند میں ہوتی تو کفار اسے بعید از قیاس نہ سمجھتے، نہ ہی اس کی تکذیب کرتے۔ نہ ہی اس کی وجہ سے کمزور مسلمان فتنہ میں مبتلا ہوتے۔ کیونکہ ایسے خوابوں کا انکار نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی کفار اسے بعید از قیاس سمجھتے، نہ اس کی تکذیب کرتے نہ فتنہ میں مبتلا ہوتے۔ یہ سارے امور اسی وقت ہی رونما ہو سکتے ہیں جب معراج جسمِ اطہر کے ساتھ عالم بیداری میں ہو۔

امام بخاری نے باب الاسراء میں اور حضرت سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ (الاسراء:۶۰)

ترجمہ: "اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لیے۔"

اس سے مراد آنکھ کا مشاہدہ ہے جو حضور اکرم ﷺ کو شب معراج کرایا گیا۔ سعید نے یہ اضافہ کیا ہے: "اس سے مراد خواب نہیں ہے۔"

حافظ نے لکھا ہے کہ مشاہدہ کی نسبت آنکھ کی طرف کی گئی ہے تاکہ قلب کے ساتھ دیکھنے سے احتراز ہو سکے۔ رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں رویت قلب کو اس آیت طیبہ سے ثابت کیا ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ⑪ (النجم:۱۱)

ترجمہ: ''نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشمِ مصطفیٰ نے)''

آنکھ کے مشاہدہ کو اس آیت طیبہ سے ثابت کیا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰ (النجم:۱۷)

ترجمہ: ''نہ درماندہ ہوئی چشم (مصطفیٰ) اور نہ (حد ادب سے) آگے بڑھی۔''

ابن مردویہ نے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ کرام مکہ مکرمہ پہنچ گئے ہیں۔ جب مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو روک دیا تو اس میں بعض لوگوں کے لیے فتنہ تھا۔ ابن مردویہ نے جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''میں نے دیکھا گویا کہ بنو امیۃ میرے منبر کو استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے مراد دنیا ہے جو انہیں ملے گی۔'' اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی'' یہ دونوں روایات ضعیف ہیں۔ صحیح موقف وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ ابن عباس نے جو کچھ فرمایا ہے یقینی طور پر وہی حق ہے کہ اس سے مراد شبِ معراج آنکھ مبارک سے مشاہدہ کرنا ہے۔ حضرات مجاہد، سعید بن جبیر، حسن، مسروق، ابراہیم، قتادہ اور عبدالرحمان وغیرہم نے یہی کہا ہے۔

تنبیہ

ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ امام بخاری کا موقف ہے کہ شبِ اسراء اور تھی اور شبِ معراج اور۔ کیونکہ انہوں نے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ باب باندھا ہے۔ حافظ نے لکھا ہے کہ اس میں ان کے لیے مغایرت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ نماز کی ابتداء میں ان کا تذکرہ ان کے متحد ہونے کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے یہ باب باندھا ہے۔ ''شب اسراء کو نماز کیسے فرض ہوئی؟ نماز شبِ معراج کو ہی فرض ہوئی۔ اس سے یہی علم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ دونوں متحد ہیں۔ انہوں نے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ باب اس لیے باندھا ہے کہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ قصہ پر مشتمل ہے۔ اگرچہ دونوں واقعات ایک ہی وقت رونما ہوئے تھے۔

دوسرا قول

اسراء بیت المقدس تک جسمِ اطہر کے ساتھ اور آسمانوں تک سیر روح مبارک کے ساتھ تھی۔ایک گروہ کا یہ موقف ہے۔انہوں نے رب تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل پکڑی ہے۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا۔ (الاسراء:۱)

ترجمہ:"(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔"

انہوں نے مسجد اقصیٰ کو اس اسراء کے لیے انتہاء بنایا ہے۔جس میں اس حیثیت سے تعجب ہے کہ وہ رات کے قلیل حصہ میں رونما ہوا۔کفار اس میں محال ہونے کی وجہ سے تعجب کرتے تھے۔جب کہ اہلِ ایمان کا تعجب قدرت باہرہ کی وجہ سے تھا۔اس میں حضور اکرم ﷺ کی عزت اور کرامت کا بھی ظہور ہے۔اگر مسجد اقصیٰ سے زائد سیر ہوتی تو رب تعالیٰ اس کا ذکر کرتا تا کہ آپ ﷺ کی مدح اور توصیف میں اور اضافہ ہوتا۔"

آئمہ کرام نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ایمان کی طرف استدراجاً لانے کے لیے پہلے اسراء کا تذکرہ کیا۔جب آپ کی صداقت کی نشانیاں عیاں ہوگئیں اور آپ ﷺ کی رسالت کی برہان پوری ہوگئی اور وہ اس معجزہ سے اُنس پا گئے تو انہیں اس سے بڑے معجزہ کے بارے بتایا گیا جو کہ معراج ہے۔حضور اکرم ﷺ نے انہیں اس کے بارے بتایا۔رب تعالیٰ نے سورۃ النجم میں یہ واقعہ نازل فرمایا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت بھی اسی امر پر دلالت کرتی ہے کہ اسراء اور معراج ایک ہی شب میں تھی۔امام مسلم نے ان سے روایت کیا ہے۔"میرے پاس براق لایا گیا۔میں اس پر سوار ہوا حتیٰ کہ میں بیت المقدس پہنچ گیا..... پھر مجھے آسمان دنیا کی طرف لے جایا گیا۔" حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے"جب میں بیت مقدس میں فارغ ہو گیا تو میرے پاس سیڑھی لائی گئی۔"

تیسرا قول

اگرچہ اسراء روح کے ساتھ تھا۔ یہ نیند میں خواب تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی حکایت بیان فرمائی:

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ۔ (الصافات:۱۰۲)

ترجمہ: "اے میرے پیارے فرزند! میں نے دیکھا ہے خواب میں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔"

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "انبیائے کرام کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں سو جاتی ہیں لیکن ان کے قلوبِ مبارکہ نہیں سوتے۔" یہ مؤقف رکھنے والے علماء کرام نے اس آیت طیبہ سے استدلال کیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ (اسراء:۶۰)

ترجمہ: "اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لیے۔"

اگر عالم بیداری میں معراج ہوتی تو "الرؤیۃ" کا لفظ استعمال کیا جاتا۔ شریک کی روایت میں ہے "آپ مسجد حرام میں آرام فرما تھے" پھر انہوں نے شب معراج کی ساری داستان روایت کر دی۔ پھر روایت کیا: "جب میں اپنی نیند سے بیدار ہوا تو میں مسجد حرام میں تھا۔" یہ مؤقف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کی معراج کے بارے سوال کیا جاتا تو فرماتے: "یہ رب تعالیٰ کی طرف سے ایک سچا خواب تھا" یعقوب راوی اگرچہ ثقہ ہیں لیکن انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ یہ دلیل منقطع ہے۔" یہ قول حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے: "مجھے آلِ ابو بکر رضی اللہ عنہ میں سے ایک شخص نے بتایا ہے کہ حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں: "اس رات حضور اکرم ﷺ کا جسد اطہر غائب نہیں ہوا

تھا۔ بلکہ آپ ﷺ کی روح کو سیر کرائی گئی۔" شفاء کے نسخوں میں ہے "میں نے شب معراج آپ ﷺ کا جسم اطہر مفقود نہ پایا۔"

پہلی دلیل کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رؤیا کبھی کبھی الرویۃ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی عالم بیداری میں مشاہدہ کرنا۔ جیسے ابن دحیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام سہیلی نے الروض الانف میں لکھا ہے:

و کبّر للرؤیا وھش فوادہ

و بشر قلبا کان جما بلا بلہ

رب تعالیٰ کا یہ فرمان الا فتنۃ للناس۔ (الاسراء: ۶۰) بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد آنکھ کا مشاہدہ ہے وجود مسعود کے ساتھ سیر ہے کیونکہ نیند میں سیر کرنا لوگوں کے لیے فتنہ نہیں ہو سکتا کیونکہ محال امر سمجھتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ لوگ مرتد ہو گئے۔ کفار نے کہا: "محمد عربی (جانِ عالم ﷺ) یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بیت المقدس گئے۔ پھر اسی رات مکہ مکرمہ لوٹ آئے۔ جبکہ ایک کارواں ایک ماہ وہاں تک جاتے ہوئے اور ایک وہاں سے آتے ہوئے لگاتا ہے۔" اگر یہ خواب ہوتا تو کوئی بھی اسے بعید از قیاس نہ سمجھتا۔ یہ معروف امر ہے کہ ایک سونے والا کبھی خود کو آسمانوں میں کبھی مشرق میں اور کبھی مغرب میں دیکھتا ہے۔ کوئی بھی اسے بعید نہیں سمجھتا۔ عالم بیداری میں معراج کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس رات قریش کے ایک کارواں کا پانی پیا تھا۔ انہوں نے یہ پانی پیالہ میں ڈال کر ڈھانپ رکھا تھا۔ وقت صبح اس برتن میں پانی نہ تھا۔ انہوں نے اس پر تعجب کیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اس شخص کی راہ نمائی کی تھی جس کا اونٹ براق کی آہٹ سن کر بھاگ گیا تھا۔ آپ ﷺ نے اہلِ مکہ کو اس کی نشانی بھی بتائی تھی۔ آپ ﷺ نے دو بوروں کا تذکرہ کیا جن میں سے ایک سیاہ اور دوسرا اسفید و سیاہ تھا۔ آپ ﷺ نے اس کارواں کے بارے بتایا کہ وہ بدھ کو آجائے گا۔ جس میں سے اونٹ والے کی راہ نمائی کی تھی۔ اور جن کے پیالے سے پانی نوش کیا تھا۔ یہ سارے امور عالم بیداری میں ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے حضرت ابن عباس کا یہ فرمان گزر چکا ہے "یہ آنکھ کا نظارہ تھا جو حضور ﷺ کو معراج کی شب

کرایا گیا تھا۔"

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ اس میں بھی اس امر کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ احتمال ہے کہ یہ اس وقت کا تذکرہ ہو جبکہ ابتدائے سفر میں فرشتہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہو۔ آپ ﷺ استراحت فرما ہوں۔ حضرت حسن کی روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: "اسی اثناء میں کہ میں حجر میں سویا ہوا تھا۔ حضرت جبرائیل امین میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھے جگایا۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے کچھ بھی نہ دیکھا۔ میں اپنے بستر پر لوٹ گیا...... وہ مجھے مسجد حرام کے دروازے تک لے گئے۔ میں نے وہاں ایک جانور پایا۔" اسے ابتدائے حال پر محمول کیا جائے گا۔ پھر آپ ﷺ مسجد حرام کے دروازے کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ کو سوار کرایا گیا۔ آپ عالم بیداری میں تھے۔ حدیث پاک میں یہ ذکر نہیں کہ آپ ﷺ سارے واقعہ کے دوران سوئے ہی رہے۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان "پھر میں بیدار ہوا تو میں مسجد حرام میں تھا۔" اس کے بارے حافظ نے لکھا ہے کہ اگر کہا جائے کہ معراج کئی بار ہوئی تو پھر اس میں کوئی اشکال نہیں۔ ورنہ اسے اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ جب میں ملکوت کے عجائب کے مشاہدہ سے لوٹا اور عالم دنیوی کی طرف آیا، جب میں عالم بشریت کی طرف آیا تو میں مسجد حرام میں تھا۔"

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب آپ ﷺ پر وحی ہوتی تھی تو آپ ﷺ بہت زیادہ مستغرق ہوتے تھے۔ جب وحی کا نزول ختم ہو جاتا تھا تو آپ ﷺ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتے تھے۔ اس حالت کو آپ ﷺ نے بیداری سے تعبیر فرمایا۔ جیسے کہ اس حدیث پاک میں ہے جس میں ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ طائف تشریف لے گئے۔ اہلِ طائف نے آپ ﷺ کو جھٹلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب میں واپس آیا تو میں غمزدہ تھا۔ میں قرن الثعالب پہنچ کر اپنی پہلی حالت پر آیا۔" حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ اپنے نورِ نظر کو لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تاکہ آپ اسے گھٹی دیں۔ انہوں نے اسے آپ ﷺ کی مبارک ران پر بٹھا دیا۔ حضور اکرم ﷺ لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ حضرت اسید نے اپنا بچہ وہاں سے اٹھا لیا۔ جب حضور اکرم پہلی حالت پر

آئے تو بچہ کو نہ پایا تو اس کے متعلق پوچھا۔ تو لوگوں نے آپ ﷺ کو بتایا کہ اسے اٹھالیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس بچہ کا نام منذر رکھا۔ اس میں ''استیقظ'' کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ شریک کی تغلیط کو اس معنی پر محمول کرنا بہت بہتر ہے۔

تنبیہ

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس رات کو آپ ﷺ کی چشمِ مبارک تو سوئی تھی لیکن دل مبارک حاضر تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی چشمانِ مقدس کو بند کر لیا تھا تا کہ محسوسات میں سے کوئی چیز آپ ﷺ کو اپنی طرف مائل نہ کر سکے۔'' قاضی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''یہ درست نہیں۔ یہ مقام ملکوت کے عجائب کو دیکھنے کا مقام ہے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے:

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ (الاسراء:۱)

ترجمہ: ''تاکہ ہم آپ کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔''

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ (النجم:۱۸)

ترجمہ: ''یقیناً انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

آنکھ سے جلد مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس طرح آپ ﷺ کی اس کیفیت کو اس وقت پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا جب آپ ﷺ نے انبیائے کرام کو امامت کرائی تھی۔

جو قول ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ ایسی سند سے وارد نہیں جو حجت بن سکے۔ بلکہ اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن دحیہ نے التنویر میں لکھا ہے کہ یہ موضوع روایت ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''معراجۃ الصغیر'' میں لکھا ہے کہ شوافع کے امام قاضی ابوالعباس بن سریج نے لکھا ہے ''یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ صحیح حدیث کے رد کے لیے اسے وضع کیا گیا ہے۔'' اگر اسے صحیح تصور بھی کر لیا جائے اور یہ مجہول صیغہ سے روایت ہو تو ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے اپنا مشاہدہ بیان نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اس وقت آپ ﷺ کی زوجہ نہ تھیں۔ اگر اسے معروف روایت کیا جائے تو ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے ساتھ وظیفۂ زوجیت آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ادا کیا تھا۔ اسراء کے وقت ان کی عمر ایسی تھی جس میں امور ضبط نہیں

ہو سکتے۔ کیونکہ ہجرت کے وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی۔ اگر معراج ہجرت سے ایک سال قبل ہو تو اس وقت ان کی عمر سات سال ہوگی یا اس سے کم۔ اس شخص کے قول کے مطابق جس نے کہا ہے کہ معراج بعثت سے ایک سال بعد میں ہوئی وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

تنبیہ

زاد المعاد میں ہے: "وہ فرق معلوم ہونا چاہیے جو اس مؤقف کہ معراج نیند میں تھی اور اس مؤقف کے مابین ہے کہ معراج جسم اطہر کے بغیر صرف روح کے ساتھ تھی۔ ان کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ نہیں کہتے کہ یہ نیند تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سفر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح مبارک کے ساتھ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسم اطہر غائب نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں امور میں فرق ہے۔ کیونکہ سونے والا جو کچھ دیکھتا ہے وہ ضرب الامثال ہوتی ہیں جو محسوس صور میں معلوم کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے گویا کہ اسے آسمان کی سیر کرائی گئی۔ یا وہ مکہ مکرمہ یا زمین کے گوشوں کی طرف گیا۔ اس کی روح نہ جاتی ہے نہ اوپر چڑھتی ہے۔ اس کے لیے صرف ضرب المثل بیان کی جاتی ہے۔ معراجِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جسمِ مبارک اور روحِ اقدس کے ساتھ معراج کرائی گئی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح مبارک کو سیر کرائی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسم غائب نہیں ہوا تھا۔ یہ گمان نہیں کرتے کہ معراج خواب تھی۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ روح کی ذات کو سیر کرائی گئی۔ اسے حقیقت میں معراج کرائی گئی۔ اس نے وہ امور سرانجام دیے جو وہ مفارقت کے بعد دیتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت وہی تھی جو مفارقت کے بعد ہوتی ہے۔ وہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف چڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ ساتویں آسمان پر جا کر رک گئی۔ وہ رب تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگئی اس نے اسے جو چاہا حکم دیا پھر وہ زمین پر آگئی۔ اس شب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ امر اکمل صورت میں حاصل ہوا تھا جو مفارقت کے بعد روح کے لیے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے یہ فرق عیاں ہوگیا جو سونے والا دیکھتا ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عظیم مقام پر فائز تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بطن

اقدس چاک کیا گیا آپ ﷺ کا وصال نہ ہوا آپ ﷺ کو درد نہ ہوا۔ حقیقت میں آپ ﷺ کی روح مبارک کو سیر کرائی گئی لیکن آپ ﷺ کا وصال نہ ہوا۔ جبکہ دیگر لوگوں کی ارواح مرنے کے بعد ہی آسمانوں کی طرف جاتی ہیں۔" اس کی مزید تفصیل حیات النبی ﷺ کے باب میں آئے گی۔

دوسری فصل، کتنی بار معراج ہوئی؟

ایک گروہ جس میں ابوشامۃ بھی شامل ہیں ان کا مؤقف ہے کہ معراج کئی بار ہوئی۔ انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے سعید بن منصور، بزار، بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "اسی اثناء میں کہ میں سو رہا تھا کہ حضرت جبرائیل امین آئے۔ انہوں نے میرے شانوں کے مابین مس کیا۔ میں ایک درخت کی طرف گیا جس میں پرندوں کے گھونسلوں کی طرح کوئی چیز تھی۔ ایک میں حضرت جبرائیل اور دوسرے میں میں بیٹھ گیا۔ وہ اوپر بلند ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ شمس وقمر سے بھی اوپر چلی گئی۔ میں پہلو بدل رہا تھا۔ اگر میں آسمان کو چھونا چاہتا تو اسے چھو سکتا تھا۔ آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ میرے لیے کھولا گیا۔ میں نے بہت بڑا جانور دیکھا۔ پس پردہ موتی اور یاقوت تھے۔ نور گرا۔ حضرت جبرائیل امین بے ہوش ہو گئے۔ گویا کہ وہ بوریا ہوں۔ میں جان گیا کہ ان میں مجھ سے زیادہ خشیت پائی جاتی ہے۔ رب تعالیٰ نے جو چاہا مجھ پر وحی کی۔" دوسری روایت ہے کہ اس نے مجھ پر وحی کی کہ کیا میں بادشاہ بننا چاہتا ہوں یا عبد نبی" حضرت جبرائیل نے لیٹے ہوئے مجھے اشارہ کیا کہ میں تواضع اختیار کروں۔ میں نے عرض کی: "نہیں بلکہ میں عبد نبی بننا چاہتا ہوں۔"

❁❁❁❁

گمراہ لوگوں کے معراج کے بارے اعتراضات کے جواب

حضور اکرم ﷺ کی معراج میں کسی ایک مسلمان کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ گمراہوں نے باطل شبہات کے ساتھ اس پر اعتراضات کیے ہیں۔ امام رازی وغیرہ نے ان کا رد کیا ہے۔ میں ان اعتراضات کا تذکرہ کروں گا پھر ان کے جوابات لکھوں گا۔ گمراہوں نے کہا ہے "اس قدر تیز رفتاری سے حرکت کرنا عقل میں نہیں آسکتا۔ اگر آپ ﷺ آسمان کی طرف تشریف لے جاتے تو افلاک میں لازماً شگاف ہوتا۔ یہ محال ہے۔ بھاری جسم کا آسمان کی طرف چڑھنا مشہور نہیں ہے۔ اگر یہ معجزہ سچا ہوتو یہ آپ ﷺ کے سارے معجزات سے عظیم ہوتا۔ لازم ہوتا کہ آپ ﷺ اس کا اظہار لوگوں کے مجمع عام میں کرتے حتیٰ کہ لوگ اس سے آپ ﷺ کی نبوت کی صداقت پر استدلال کرتے۔ اس وقت معراج ہونا جس میں کوئی آپ ﷺ کو نہ دیکھ رہا ہو عبث ہے۔ یہ حکیم کی حکمت کے مناسب نہیں ہے۔

1. پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس قدر تیز رفتاری سے حرکت کرنا ممکن ہے۔ رب تعالیٰ اس پر قادر ہے۔ اس کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ فلک اعظم رات کی ابتداء سے لے کر آخر تک نصف چکر کے قریب حرکت کرتا ہے۔ ہندسہ کے حساب سے یہ ثابت ہے کہ چکر کی قطر کی طرف نسبت ایک اور تین کی نسبت سے ہے۔

اگر یہ سمجھا جائے کہ حضور اکرم ﷺ مکہ مکرمہ سے فلک اعظم کے اوپر تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے صرف نصف قطر کے اعتبار سے ہی حرکت کی ہے۔ جب نصف چکر زمانہ کی مقدار ممکن ہوگئی تو نصف قطر کے مقدار میں حرکت بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگئی۔ یہ برہان قاطع ہے کہ آپ ﷺ رات کے تہائی حصہ میں مکہ مکرمہ میں عرش اعلیٰ تک گئے۔ یہ امر ممکن ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر پوری رات میں اس کے حصول کا امکان بدرجہ اولیٰ ہے۔

حساب کی رو سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ سورج کے دونوں کناروں کا فاصلہ کرۂ ارض کے دونوں کناروں سے ایک سو ساٹھ گنا زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ سورج کی

ٹکیہ انتہائی قلیل مدت میں طلوع ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی یہی دلیل ملتی ہے کہ اس سرعت سے حرکت کرنا ممکن ہے۔ اگر ہماری گفتگو ایسے شخص کے بارے میں ہے جو حساب نہ جانتا ہو تو ہم اسے کہیں گے کہ تم شمس و قمر اور ستاروں کو دیکھتے ہو کہ مشرق سے لے کر مغرب تک اتنی مسافت طے کرتے ہیں جسے کئی سالوں میں بھی طے نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا قلیل مدت میں دور دراز تک چلی جاتی تھی۔ ارشادِ ربانی ہے:

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سباء:۱۲)

ترجمہ: ''اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی ہوتی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی۔''

اسی طرح آندھی ایک لحظہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ فوراً چلی جاتی ہے۔ اسی طرح اس شخص نے جس کے پاس الکتاب کا علم تھا اس نے یمن کے دور کے علاقہ سے پلک جھپکنے کی دیر میں بلقیس کا تخت حاضر کیا تھا۔ اجسام اپنی تمام ماہیات میں ایک دوسرے کے متماثل ہوتے ہیں۔ جب یہ حرکت بعض اجسام کے حق میں ثابت ہوگئی تو سارے اجسام میں ان کے حصول کا امکان ثابت ہوگیا۔ یہ ممکنات میں سے ہے۔ ربّ تعالیٰ اسی خصوصیت کو اپنے نبی اکرم ﷺ کے جسد اطہر میں بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

- افلاک کا پھٹ جانا محال نہیں ہے۔ جنت اور دوزخ کا انکار کرنے والوں نے اس کو محال سمجھا ہے۔ شیخ سعد الدین لکھتے ہیں: ''معراج کے محال ہونے کا دعویٰ باطل ہے۔ کیونکہ اس دعویٰ کی بنیاد فلاسفہ کے اس اصول پر ہے کہ آسمان میں شگاف ہونا اور پھر مل جانا ممتنع ہے۔ ورنہ اہلِ حق کے نزدیک آسمانوں میں شگاف ہونا اور ان کا ملنا حق ہے۔ اجسام علویہ اور سفلیہ متماثل ہیں جو جواہرہ فردہ متماثلہ سے مرکب ہوتے ہیں۔ اس مذکورہ تماثل کی وجہ سے جو چیز ایک جسم پر صحیح ہوتی ہے وہ دوسری پر بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ جب اجسام سفلیہ پھٹ سکتے ہیں تو اجسام علویہ بھی پھٹ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سارے ممکنات پر قادر ہے۔ وہ آسمانوں میں شگاف کرنے پر بھی قادر ہے اس کے بارے سنا بھی گیا ہے۔ اس کی تصدیق لازم ہے۔

◆ جسم کثیف کے بلند ہونے کو بعید از قیاس سمجھنا جسم لطیف روحانی کے عرش سے عالم کے مرکز میں نزول کے بعید از قیاس ہونے کو لازم ہے۔ اگر حضور اکرم ﷺ کا ایک رات میں معراج ممتنع ہے تو پھر حضرت جبرائیل کا عرش سے مکہ مکرمہ کی طرف ایک لحظہ میں نزول بھی ممتنع ہے۔ اگر ہم اس پر امتناع کا حکم لگائیں تو یہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت پر طعن ہوگا۔ معراج کو ثابت کرنے کا قول دراصل نبوت کی اصل کے جواز کو تسلیم کرنے کی فرع ہے۔ اس حرکت کو ممتنع سمجھنا نزول جبرائیل کے امتناع کو لازم ہے۔ جب یہ باطل ہے تو وہ کچھ بھی باطل ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں۔

◆ رات کو معراج کرانے کے کئی فوائد ہیں:

① تا کہ اہلِ ایمان کا غیب پر ایمان زیادہ ہو۔ اہلِ کفر کے کفر میں اضافہ ہو۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ (الاسراء:۶۰)

ترجمہ: ”اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لیے۔“

رات خلوت اور اختصاص کا وقت ہوتا ہے۔ جو شخص بادشاہ کے پاس دن کو بیٹھتا ہے اور جو رات کو بیٹھتا ہے ان کے مابین بہت فرق ہے۔ اس کے باوجود کفار نے کہا:

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ (الاحقاف:۷)

ترجمہ: ”کہ یہ کھلا جادو ہے۔“

ان کے لیے برابر ہے خواہ آپ انہیں دن کے وقت یہ معجزہ دکھاتے یا انہیں ایسی خبر دیتے جو انہیں یقین کا فائدہ دیتی جب آپ نے انہیں چاند کو دو ٹکڑے کر دیا تو انہوں نے کہا:

سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ (القمر:۲)

ترجمہ: ”بڑا زبردست جادو ہے۔“

✿✿✿✿

ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء جن سے یہ داستان مروی ہے

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان سے ابن مردویہ نے عبید بن عمیر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے، عبداللہ بن امام احمد نے زوائد المسند میں، ابن مردویہ نے حضرت ابوذر سے، حافظ نے اطراف المسند میں لکھا ہے: ''اس میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ یہ دراصل ابی ذر تھا۔ نسخہ سے ''ذر'' کا لفظ محذوف ہو گیا ہے۔ ابی کو ابی سمجھا گیا۔ اسے مسند ابی بن کعب میں غلطی سے درج کر دیا گیا۔

میں کہتا ہوں: ''دار قطنی نے علل میں لکھا ہے کہ اس میں وہم ابوضمرۃ انس بن عیاض کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔'' حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اس روایت کو ابوحفص نسفی نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ لیکن میں اس سے آگاہ نہیں ہوا۔ حضرت انس بن مالک۔ انہوں نے کسی واسطہ کے بغیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور امام مسلم نے حضرت ثابت بنانی کی سند سے ان کی روایت کو ذکر کیا ہے۔ شیخین نے شریک بن عبداللہ، ابن مردویہ نے کثیر بن خنیس اور امام نسائی نے یزید بن ابی مالک اور ابن ابی حاتم نے ایک اور سند سے اسے روایت کیا ہے۔

ابن جریر، ابن مردویہ اور امام بیہقی نے عبدالرحمٰن بن ہاشم کی سند سے روایت کیا ہے۔ اسے عبدالعزیز بن صہیب کی سند سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ طبرانی نے اسے میمون بن سیاہ، ابن جریر نے ابوسلمہ بن سلیم، ابن مردویہ نے اسے ابوہاشم سے، ابن سعد اور سعید بن منصور اور بزار نے اسے ابوعمران الجولانی کی سند سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے بعض کی روایت میں وہ امور ہیں جن کا تذکرہ دوسروں کی روایت میں نہیں۔''

بریدہ بن خصیب رضی اللہ عنہ۔ ان سے امام ترمذی اور امام حاکم نے روایت کیا ہے۔ حضرت بلال بن حمامۃ اور حضرت بلال بن سعد، ان سے ابوحفص النسفی نے روایت کیا ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما۔ ان سے امام بخاری، امام مسلم، طبرانی، ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ۔ ان سے ابن ابی شیبہ، امام احمد اور امام ترمذی نے

روایت کیا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ۔ ان سے ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ۔ ان سے ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ۔ ان سے بزار، طبرانی، بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ۔ ان سے طبرانی، ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔ ان سے امام احمد، ابونعیم اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابویعلی نے حضرت عکرمہ کی سند سے، امام مسلم اور امام بخاری نے ابوالعالیۃ اور عکرمہ کی سند سے، امام احمد، امام نسائی اور بزار نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ امام احمد، ابن ابی شیبہ اور بزار نے حضرت زرارہ بن اوفی کی سند سے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمر، ان سے ابوداؤد اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ان سے ابن سعد اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی۔ ان سے ابوحفص نسفی نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن اسعد بن زرارۃ رضی اللہ عنہ، ان سے بزار، بغوی اور ابن قانع نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود۔ ان سے امام مسلم نے مرّہ کی سند سے ابن عرفۃ نے عبیداللہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے موثر بن عفازہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ بزار، ابویعلی اور طبرانی نے علقمہ اور امام بیہقی نے زر بن جیش کی سند سے روایت کیا ہے۔ عبدالرحمان بن عابس ابن دحیہ نے ان کا تذکرۃ التنویر میں کیا ہے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما۔ ان سے ابوحفص النسفی نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان سے امام احمد اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان سے امام احمد اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس بن عیاض۔ ان کا تذکرہ ابن دحیہ نے کیا ہے۔ حضرت مالک بن صعصعۃ رضی اللہ عنہ۔ ان سے امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابن جریر، امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ ان کا ذکر ابن دحیۃ نے کیا ہے۔ حضرت ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ۔ ان سے امام بخاری، امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابوالحمراء رضی اللہ عنہ۔ ان سے امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ۔ ان سے ابوحفص النسفی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری

رضی اللہ عنہ۔ ان سے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔ ان سے ابن جریر، ابن ابی حاتم، امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔

امام بیہقی نے ابوالازھر سے روایت کیا ہے۔ زید بن ابی حکیم نے فرمایا: ''میں نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی۔ میں نے عرض کی: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کا وہ شخص کیسا ہے جسے سفیان ثوری کہا جاتا ہے۔ کیا اس میں کوئی حرج نہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے انہوں نے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شبِ معراج کے بارے فرمایا: ''میں نے آسمان میں دیکھا۔'' میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں روایت عرض کر دی۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں!'' میں نے عرض کی: ''یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے بعض لوگ معراج کے بارے عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ داستان گوؤں کی باتیں ہیں۔''

حضرت ابوسفیان بن حرب۔ ان سے ابوحفص النسفی نے روایت کیا ہے۔ ابوسلمہ بن دحیہ اور ابوسلمی رضی اللہ عنہ۔ ابوحفص نے ان سے روایت کی ہے۔ ابولیلی انصاری رضی اللہ عنہ، ان سے طبرانی اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ۔ ان سے ابن جریر، ابن ابی حاتم، امام بیہقی، حاکم نے ابوالعالیہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ابوجعفر رازی ہیں۔ وہ حفظ کے سچے تھے۔ امام مسلم اور امام بخاری نے حضرت سعید بن مسیب کی سند سے۔ امام احمد اور امام مسلم نے ابوسلمہ کی سند سے، امام احمد اور ابن ماجہ نے ابوالصلت کی سند سے ابن مردویہ نے سلیمان التیمی کی سند سے ابن سعد، سعید بن منصور اور طبرانی نے ان کے غلام کی سند سے روایت کیا ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما۔ ابن مردویہ نے ان سے روایت کیا ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان سے حاکم، امام بیہقی، ابن مردویہ نے امام زہری اور حضرت عروہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے ہشام کی سند سے روایت کیا ہے۔

حضرت ام کلثوم بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و رضی اللہ عنہا۔ ان سے ابوحفص النسفی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔ ان سے ابوسعید اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا۔ ان سے طبرانی، ابویعلی اور ابن عساکر نے ابوصالح کی سند سے روایت کیا ہے۔

داستانِ معراج

اللہ تعالیٰ آپ پر اور مجھ پر رحم کرے جان لو۔مذکورہ بالا صحابہ کرام کی روایات میں سے ہر ایک کی روایت میں اس چیز کا تذکرہ ہے جو دوسرے کی روایت میں نہیں۔میں نے استخارہ کیا اور ان کی احادیث کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا۔میں نے اس داستان کو ایک ترتیب سے لکھا ہے۔تاکہ یہ یاد رکھنے والے کانوں کے لیے شیریں بن سکے۔اور سارے حالات میں اس کا نفع عام ہو سکے۔اگر تم کہو کہ معراج کے بارے بعض روایات بعض کے مخالف ہیں۔ممکن ہے کئی بار معراج ہوئی ہو۔تم نے ان سب کو ایک قصہ میں کیسے شامل کر دیا ہے؟ میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں "یہ ظاہری لوگوں کا کمزور طریقہ ہے۔وہ اربابِ نقل ہیں۔ وہ جب کسی قصہ میں ایک لفظ دیکھتے ہیں جو سیاق میں کسی دوسری روایت کے مخالف ہوتا ہے وہ اسے دوسری مرتبہ معراج قرار دے دیتے ہیں۔جب مختلف روایات ان کے پاس پہنچتی ہیں اور انہیں متفرق معراجیں قرار دے دیتے ہیں۔صحیح مؤقف وہی ہے جسے آئمہ نے اختیار کیا ہے کہ معراج صرف ایک ہی مکہ مکرمہ سے بعثت سے بعد ہوئی تھی۔ان لوگوں پر تعجب ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ معراج کئی بار ہوئی۔ان کے لیے یہ کیسے روا ہے کہ وہ گمان کریں کہ ہر بار آپ ﷺ پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔پھر آپ ﷺ رب تعالیٰ اور حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کے مابین آتے جاتے رہے حتیٰ کہ یہ پانچ رہ گئیں پھر رب تعالیٰ فرماتا رہا۔"میں نے اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی ہے۔پھر دوسری بار اسی امر کا اعادہ کیا اور دس دس نمازیں کم کر دیں۔"

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں "مالک بن صعصعۃ کی روایت میں بیت المقدس میں جانے کا تذکرہ نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض راوی بعض روایت کو حذف کر دیتے تھے یا تو اسے اس کا علم ہوتا تھا۔یا وہ اسے بھلا چکا ہوتا تھا۔یا وہ اس چیز کا ذکر کرتے جو اس سے اہم

ہوتی تھی یا بعض کی طبیعت میں روانی ہوتی تو وہ ساری روایت بیان کر دیتا۔ بعض اوقات وہ اپنے مخاطب کو وہ چیز بیان کر دیتا ہو جو اس کے لیے زیادہ نفع بخش ثابت ہوتی۔ جس نے ہر اس روایت کو جو دوسری روایت کے مخالف ہوا سے اس امر پر محمول کیا ہے کہ یہ دوسری بار معراج کے بارے ہے۔ اس طرح اس نے کئی معراجیں ثابت کی ہیں۔ اس نے عجیب و غریب مؤقف اختیار کیا ہے۔ اس نے غلط روش اختیار کی اور مدعا پر پورا نہ اترا۔ کیونکہ ساری روایات میں ہے کہ انبیاء کرام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی۔ ساری روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر اس تعدد کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت بعید مؤقف ہے۔" اسلاف میں سے کسی سے یہ مؤقف ثابت نہیں ہے۔ اگر معراج اتنی بار ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کو اس کے بارے ضرور فرماتے۔ اور لوگ اسے بار بار نقل کرتے۔"

حافظ "الفتح" میں مزید لکھتے ہیں "آپ نے ہر نبی کے بارے سوال کیا۔ ہر دروازے کے دربان نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے پوچھا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف قاصد بھیجا گیا تھا؟ اسی طرح پانچ نمازوں کا فرض ہونا۔ قصہ میں اس طرح کے تعدد کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ بلکہ بعض روایات جو دوسری روایات سے تضاد رکھتی ہوں یا تو ان کے رد کا تعین کیا جائے گا یا انہیں ترجیح دی جائے گی۔ البتہ اس تعدد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیند میں وقوع ہونے والے واقعات جو بعد میں عالم بیداری میں ظہور پذیر ہوئے ہوں کو شامل نہیں کیا جائے گا۔"

اب میں اس داستان کا آغاز کرتا ہوں "اسی اثناء میں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ میں حجر کے مقام پر تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل اور ایک اور فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ پہلے نے کہا: "ان میں سے وہ کون ہیں؟" درمیانے نے کہا: "وہ ان سے بہترین ہیں۔" یہ پہلی رات کا واقعہ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دوسری رات دیکھا۔ پہلے نے کہا: "یہ وہی ہیں۔" درمیانے نے کہا: "ہاں!" آخری نے کہا: "قوم کے سردار کو پکڑ لیں جو دو افراد کے مابین ہیں۔" فرشتے واپس آ گئے۔ وہ تیسری رات آئے۔ پہلے نے کہا: "وہ وہی ہیں۔" درمیانے نے کہا "ہاں" آخری نے کہا: "قوم کے اس سردار کو پکڑ لو جو دو افراد کے مابین ہیں۔" انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اٹھایا۔ چشمہ زمزم کے پاس لے

آئے۔آپ ﷺ کو کمر کے بل لٹا دیا۔''

ایک اور روایت میں ہے''میرے کاشانہ اقدس کا چھت چیرا گیا۔حضرت جبرائیل امین نیچے آئے۔انہوں نے آپ ﷺ کا سینۂ اقدس پیٹ تک چاک کیا۔حضرت جبرائیل نے حضرت میکائیل سے کہا:''میرے پاس طشت میں آبِ زمزم لے کر آئیں۔تاکہ میں آپ ﷺ کے قلبِ اطہر کو صاف کروں۔سینۂ اقدس کھول دوں۔''انہوں نے آپ ﷺ کا قلبِ انور نکالا۔اسے تین بار دھویا۔اس سے کچھ نکالا۔حضرت میکائیل آبِ زمزم کے تین طشت لے کر ان کے پاس آئے۔پھر وہ سونے کا ایک طشت لائے جو حکمت اور ایمان سے بھرا ہوا تھا۔انہوں نے اسے آپ ﷺ کے سینہ میں انڈیل دیا۔اسے حلم،علم،یقین اور اسلام سے بھر دیا۔پھر اسے باہم جوڑ دیا۔اس پر مہر نبوت لگا دی۔پھر براق لایا گیا۔اس پر زین ڈالی گئی تھی۔اسے لگام ڈالی گئی تھی۔وہ سفید جانور تھا۔وہ گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔وہ تا حد نظر قدم اٹھاتا تھا۔اس کے کانوں میں لرزہ تھا۔جب وہ پہاڑوں پر آتا تو اپنے قدم اٹھالیتا۔جب نیچے آتا تو اپنے بازو اٹھالیتا تھا۔اس کی رانوں کے پاس دو پر تھے جن سے وہ اپنے پاؤں جھاڑتا تھا۔امام ثعلبی نے ضعیف سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کے رخسار انسان کے رخساروں کی طرح تھے۔ان کی گردن کے بال گھوڑے کے بالوں کی طرح تھے۔اس کے پاؤں اونٹ کے پاؤں کی طرح تھے۔اس کے سم اور دم گائے کے سموں اور دم کی طرح تھی۔اس نے مشکل محسوس کی۔اس نے گویا اپنے کان کھڑے کر لیے۔حضرت جبرائیل نے اسے جھڑکا۔انہوں نے کہا:''رک جا؟ کیا تو حضور اکرم ﷺ سے اس طرح کرتا ہے۔''حضرت جبرائیل امین نے اس کی گردن کے بالوں پر ہاتھ رکھے اور کہا:''براق! تجھے حیاء نہیں آتی۔بخدا! مخلوق میں کوئی ایسا نہیں جو تجھ پر سوار ہوا ہو اور وہ بارگاہِ ربانیہ میں محمد عربی ﷺ سے افضل ہو۔''یہ سن کر براق کو پسینہ آگیا۔اسے شرم نے آلیا۔وہ ٹھہر گیا حتیٰ کہ حضور ﷺ اس پر سوار ہوگئے۔آپ ﷺ سے قبل انبیائے کرام اس پر سوار ہوتے تھے۔حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمان سے روایت ہے کہ یہ جانور حضرت ابراہیم کی اس وقت سواری بنتا تھا جب وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔''

حضرت جبرائیل اسے لے کر روانہ ہوئے۔ دوسری روایت میں ہے: ''میں حضرت جبرائیل کے ساتھ روانہ ہوا۔'' ابوسعید نیشاپوری نے ''الشرف'' میں لکھا ہے۔ حضرت جبرائیل رکاب تھامے ہوئے تھے۔ حضرت میکائیل براق کی لگام پکڑے ہوئے تھے۔'' ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبرائیل دائیں طرف اور حضرت میکائیل بائیں طرف تھے۔ یہ حضرات قدسیہ روانہ ہوئے حتیٰ کہ کھجوروں والی زمین تک پہنچے۔ حضرت جبرائیل نے عرض کی: ''آپ ﷺ نیچے تشریف لائیں اور نماز ادا فرمائیں۔'' آپ ﷺ نے اسی طرح کیا۔ پھر آپ ﷺ سوار ہو گئے۔ حضرت جبرائیل نے عرض کی: ''کیا آپ ﷺ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کہاں نماز ادا کی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں!'' انہوں نے عرض کی: ''آپ ﷺ نے طیبہ میں نماز ادا فرمائی ہے۔ یہی آپ ﷺ کی ہجرت گاہ ہوگی۔'' براق آگے رواں ہوا۔ وہ تاحدِ نظر قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ حضرت جبرائیل امین نے عرض کی: ''آپ ﷺ نیچے تشریف لائیں اور نماز ادا فرمائیں۔'' آپ ﷺ نے اسی طرح کیا۔ پھر سوار ہو گئے۔ حضرت جبرائیل امین نے عرض کی: ''کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کہاں نماز ادا کی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' انہوں نے عرض کی: ''آپ ﷺ نے مدین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درخت کے پاس نماز ادا کی ہے۔'' پھر براق روانہ ہوا۔ حضرت جبرائیل نے عرض کی: ''آپ ﷺ نیچے اتریں اور نماز ادا کریں۔'' آپ ﷺ نے اسی طرح کیا۔ پھر سوار ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی: ''کیا آپ ﷺ کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے کہاں نماز ادا کی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' انہوں نے عرض کی: ''آپ ﷺ نے طورِ سیناء میں نماز ادا کی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام فرمایا تھا۔''

پھر آپ ﷺ ایسی سرزمین تک پہنچے جہاں محلات نظر آرہے تھے۔ حضرت جبرائیل امین نے آپ ﷺ سے عرض کی: ''آپ ﷺ نیچے تشریف لائیں اور نماز ادا کریں۔'' آپ ﷺ نے اسی طرح کیا۔ پھر سوار ہو گئے۔ براق آگے روانہ ہو گیا۔ حضرت جبرائیل نے پوچھا: ''کیا آپ ﷺ کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے کہاں نماز ادا کی ہے؟'' فرمایا: ''نہیں۔'' انہوں نے عرض کی: ''آپ ﷺ نے بیت اللحم میں نماز ادا کی ہے۔ جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا

ہوئے تھے:" آپ ﷺ براق پر رواں دواں تھے کہ آپ ﷺ نے ایک بہت بڑا جن دیکھا۔ وہ آگ کا شعلہ لیے آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب بھی آپ ﷺ توجہ فرماتے۔ آپ ﷺ اسے دیکھ لیتے۔ حضرت جبرائیل امین نے عرض کی: "کیا میں آپ ﷺ کو ایسے کلمات نہ سکھاؤں جب آپ ﷺ انہیں پڑھیں تو اس کا شعلہ بھی بجھ جائے اور وہ منہ کے بل گر پڑے۔" حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "ضرور!" حضرت جبرائیل امین نے عرض کی: "کہیں: "قل اعوذ بوجه الكريم و بكلمات الله التامّات التي لا يجاوزهن بر و لا فاجر من شر ما ينزل من السماء و من شر ما يعرج فيها و من شر ما ذراء في الارض و من شر ما يخرج منها و من شر فتن الليل والنهار و من طوارق الليل والنهار الا طارقا يطرق بخير يا رحمان۔" آپ ﷺ نے یہ کلمات پڑھے تو وہ منہ کے بل گر پڑا اور اس کا شعلہ بجھ گیا۔

آپ ﷺ آگے روانہ ہو گئے۔ آپ ﷺ ایسی قوم کے پاس سے گزرے جو ایک دن کاشت کرتی دوسرے دن وہ کھیتی کاٹ لیتی تھی۔ وہ جب بھی کھیتی کاٹتے تھے تو وہ پہلے کی طرح ہو جاتی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جبرائیل! یہ کیا ہے؟" انہوں نے عرض کی: "یہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے ہیں جن کا اجر سات سو گنا تک کر دیا جاتا ہے۔ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے پورا کر دیا جاتا ہے۔" آپ نے عمدہ خوشبو سونگھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جبرائیل! یہ کیسی خوشبو ہے؟" انہوں نے عرض کی: "یہ فرعون کی لڑکی کو کنگھی کرنے والی اور اس کی اولاد کی خوشبو ہے۔ وہ فرعون کی لڑکی کو کنگھی کر رہی تھی کہ اچانک کنگھی نیچے گر پڑی۔ اس نے کہا: "بسم اللہ فرعون ہلاک ہو گیا۔" اس کی بیٹی نے کہا: "کیا میرے باپ کے علاوہ تیرا اور بھی کوئی رب ہے؟" اس نے کہا: "ہاں! میرا اور تیرا رب اللہ تعالیٰ ہے۔" اس عورت کا خاوند اور دو لڑکے تھے۔ اس نے ان کی طرف پیغام بھیجا۔ اس نے انہیں ابھارا کہ وہ اپنے دین سے لوٹ آئیں۔ فرعون نے کہا: "میں تمہیں قتل کر دوں گا۔" انہوں نے کہا: "اگر تم مجھے قتل کر دو تو پھر ہمیں ایک ہی گھر میں دفن کرنا۔" دوسری روایت میں ہے۔ اس عورت نے کہا: "مجھے تجھ سے ایک ضروری کام ہے۔" فرعون نے کہا: "وہ کیا؟" اس عورت نے کہا: "میری اور میرے

بچوں کو ہڈیاں جمع کرنا اور انہیں اکٹھا جمع کر دینا۔" فرعون نے کہا: "میں تمہاری یہ تمنا پوری کر دوں گا؟" اس نے تانبے کی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ اس میں اس عورت کو اور اس کی اولاد کو پھینک دیا جائے۔ انہیں ایک ایک کر کے اس میں پھینک دیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ شیر خوار بچے تک پہنچ گئے۔ اس بچے نے کہا: "امی جان! اس دیگ میں گر جانا۔ پیچھے نہ ہٹنا۔ آپ حق پر ہیں۔" چار بچوں نے بچپن میں گفتگو کی ہے:

① اس بچے نے۔

② حضرت یوسف علیہ السلام کے گواہ نے

③ جریج کے صاحب نے

④ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرے جن کے سر پھوڑے جا رہے تھے۔ جب انہیں چھوڑ دیا جاتا تو وہ پہلے کی طرح ہو جاتے۔ انہیں ذرہ بھر بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "جبرائیل! یہ کون ہیں؟" انہوں نے عرض کی: "یہ وہ لوگ ہیں جو فرض نماز سے غفلت برتتے ہیں۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایسی قوم سے ہوا جن کے اگلے حصے پر بھی چیتھڑے تھے اور پچھلے حصے پر بھی۔ وہ اس طرح چر رہے تھے جس طرح اونٹ اور بکریاں چرتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "جبرائیل! یہ کون ہیں؟" انہوں نے عرض کی: "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔" یہ لوگ خشک کانٹے، زقوم اور جہنم کے پتھر کھا رہے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی قوم کے پاس سے گزرے جن کے سامنے ہنڈیوں میں عمدہ گوشت پڑا تھا۔ ان کے پاس کچا اور گندا گوشت بھی پڑا تھا۔ وہ کچا گندا گوشت کھا رہے تھے لیکن عمدہ پکا ہوا گوشت چھوڑ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جبرائیل! یہ کیا ہے؟" انہوں نے عرض کی: "یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کا وہ شخص ہے جس کے پاس پاکیزہ اور حلال بیوی ہوتی ہے۔ وہ خبیث عورت کے پاس جاتا ہے۔ وہ صبح تک رات وہیں بسر کرتا ہے یا کسی عورت کے پاس پاکیزہ حلال مرد ہوتا ہے۔ وہ خبیث شخص کے پاس جاتی ہے اور اس کے پاس رات بسر کرتی ہے۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لکڑی کے پاس سے گزرے جو راستہ میں

پڑی تھی اس کے پاس سے جو بھی کپڑا یا چیز گزرتی وہ اسے چیر دیتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے فرمایا: ''یہ آپ ﷺ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو راستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت کی:

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ۔ (الاعراف:۷۶)

ترجمہ: ''اور مت بیٹھا کرو راستوں پر کہ ڈرا رہے ہو تم (راہ گیروں کو)''

آپ ﷺ نے ایسا شخص دیکھا جو خون کی نہر میں تیر رہا تھا۔ وہ پتھر نگل رہا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ سود خور ہے۔'' پھر آپ ﷺ ایسی قوم کے پاس سے گزرے جن میں سے ایک شخص نے بہت بڑا گٹھا بنا رکھا تھا۔ وہ اسے اٹھا نہیں سکتا تھا۔ وہ اس میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ آپ ﷺ کی امت کا وہ شخص ہے جس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں وہ انہیں ادا نہ کر سکتا ہو وہ مزید بوجھ اٹھانے کا متمنی ہو۔''

پھر آپ ﷺ ایسی قوم کے پاس سے گزرے جس کی زبانیں اور لب لوہے کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ جب بھی انہیں کاٹا جاتا وہ پہلی حالت پر واپس آجاتے۔ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ آپ ﷺ کی امت کے فتنہ پسند خطباء ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے۔'' پھر آپ ﷺ کا گزر ایسی قوم سے ہوا جس کے ناخن تانبے کے تھے وہ اپنے سینے اور چہرے نوچ رہے تھے۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' عرض کی: ''یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزتوں سے کھیلتے ہیں۔''

پھر آپ ﷺ ایک چھوٹے سے پتھر کے پاس سے گزرے جس سے بہت بڑا بیل نکلا تھا۔ وہ بیل اسی طرح واپس جانا چاہتا تھا جس طرح نکلا تھا مگر اس میں یہ طاقت نہ تھی۔ آپ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ وہ شخص ہے جو بہت بڑی بات کر لیتا ہے۔ پھر اس پر نادم ہوتا ہے مگر اسے لوٹانے پر قادر نہیں ہوتا۔'' پھر آپ ﷺ ایسی وادی سے گزرے جس سے مشک کی سی خوشبو آرہی تھی۔ آپ نے آواز سماعت فرمائی۔ آپ

ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ جنت کی آواز ہے۔ وہ عرض کر رہی ہے: ''مولا! مجھے وہ کچھ عطا کر دے جس کا تو نے وعدہ کیا ہے۔ میرے کمرے، استبرق، ریشم، سندس، عبقر، موتی، مرجان، سونا اور چاندی کثیر ہو گئے ہیں۔ میرے جام، پیالے، سواریاں، شہد اور پانی زیادہ ہو گیا ہے۔'' رب تعالیٰ نے فرمایا: ''تیرے لیے ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت، مؤمن مرد اور مؤمن عورت ہے جو مجھ پر اور میرے رسلانِ عظام پر ایمان لایا۔ جس نے نیک اعمال کیے۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا۔ جو مجھ سے ڈرا اس کے لیے امن ہے۔ جس نے مجھ سے سوال کیا میں نے اسے عطا کر دیا۔ جس نے مجھے قرض دیا میں نے اسے جزاء دے دی۔ جس نے مجھ پر توکل کیا میں اس کے لیے کافی ہو گیا۔ بلاشبہ میں خدائے یکتا ہوں۔ میرا کوئی شریک نہیں ہے۔ میں وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اہلِ ایمان کامیاب ہو گئے۔ تَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ جنت نے کہا: ''میں راضی ہو گئی ہوں۔''

پھر آپ ﷺ ایسی وادی سے گزرے جہاں سے عجیب و غریب آواز آئی۔ گندی بو آ رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ جہنم کی صدا ہے۔'' وہ عرض کر رہی ہے: ''مولا! تو نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما۔ میری زنجیریں، میرے طوق، میرے شعلے، میری گرمی، میری پیپ اور میرا عذاب بہت سخت ہو گیا ہے۔ میری گہرائی زیادہ ہو گئی ہے۔ میری گرمی شدت اختیار کر گئی ہے۔ تو نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ہر مشرک مرد اور مشرکہ عورت تیرے لیے ہے۔ ہر کافر مرد اور ہر کافرہ عورت تیرے لیے ہے۔ ہر خبیث مرد اور ہر خبیثہ عورت تیرے لیے ہے۔ ہر وہ سرکش تیرے لیے ہے جو روزِ جزا پر ایمان نہیں رکھتا۔'' آپ ﷺ نے دجال کو بھی دیکھا۔ آپ ﷺ سے عرض کی گئی: ''یارسول اللہ! آپ ﷺ نے اسے کیسے دیکھا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اسے اس طرح دیکھا ہے کہ اس کا جسم بہت بڑا تھا۔ وہ سفید اور تاباں تھا۔ اس کی ایک آنکھ ابھری ہوئی تھی گویا کہ وہ چمکدار ستارہ ہو۔ اس کے سر کے بال گویا کہ درخت کی شاخیں تھیں۔ وہ عبدالعزیٰ بن قطن کے مشابہ تھا۔'' آپ ﷺ نے سفید ستون دیکھے گویا کہ وہ موتی تھا جسے فرشتوں نے اٹھایا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: ''تم کیا اٹھائے ہوئے ہو؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ اسلام کا ستون ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اسے شام میں رکھیں۔'' آپ ﷺ آگے رواں تھے کہ آپ ﷺ نے اپنے دائیں طرف ایک پکارنے والے کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا: ''اے محمد عربی! صلی اللہ علیک وسلم میری طرف دیکھیں۔ میں آپ ﷺ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ یہودیوں کا داعی تھا۔ اگر آپ ﷺ اسے جواب دے دیتے تو آپ ﷺ کی امت یہودی ہو جاتی۔'' اسی اثناء میں کہ آپ ﷺ رواں دواں تھے کہ آپ ﷺ نے اپنی دائیں طرف آواز سنی۔ پکارنے والا کہہ رہا تھا۔ ''محمد عربی! ﷺ میری طرف دیکھیں۔ آپ ﷺ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے اسے بھی جواب نہ دیا۔ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل سے پوچھا تو انہوں نے عرض کی: ''یہ عیسائیوں کا داعی تھا۔ اگر اسے جواب دے دیتے تو آپ ﷺ کی امت عیسائی بن جاتی۔'' تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ نے ایک عورت دیکھی جس کا سر ننگا تھا۔ رب تعالیٰ نے اسے ہر طرح کی زیب و زینت سے آراستہ فرمایا تھا۔ اس نے کہا: ''محمد عربی ﷺ! میری طرف توجہ فرمائیں۔ میں آپ سے سوال کرنا چاہتی ہوں۔'' آپ ﷺ نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ دنیا ہے۔ اگر اسے جواب دے دیتے تو آپ ﷺ کی امت دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتی۔'' تھوڑی سی دیر کے بعد آپ ﷺ نے ایک چیز دیکھی جو رستہ سے ہٹ کر آپ ﷺ کو بلا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: ''محمد عربی ﷺ میرے پاس آؤ۔'' حضرت جبرائیل نے عرض کی: ''آپ ﷺ آگے تشریف لے چلیں۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' انہوں نے کہا: ''یہ رب تعالیٰ کا دشمن ابلیس ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ آپ ﷺ اس کی طرف مائل ہو جائیں۔'' کچھ دیر بعد آپ ﷺ نے راستہ کے ایک طرف ایک بڑھیا دیکھی۔ اس نے کہا: ''محمد عربی! میری طرف توجہ کریں۔ میں آپ ﷺ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔'' آپ ﷺ نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''اس دنیا کی عمر اتنی باقی رہ گئی ہے جتنی اس بڑھیا کی عمر ہے۔'' آپ ﷺ آگے رواں تھے کہ آپ ﷺ نے رب تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق

دیکھی۔ انہوں نے آپ ﷺ کو یوں سلام عرض کیا: ''السلام علیک یا اول، السلام علیک یا آخر، السلام علیک حاشر!'' حضرت جبرائیل نے عرض کی: ''آپ ﷺ ان کے سلام کا جواب ارشاد فرمائیں۔'' آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا۔ پھر دوسری اور تیسری مخلوق ملی۔ اس نے بھی آپ ﷺ کو اسی طرح سلام عرض کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔'' آپ ﷺ کا گزر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر انور کے پاس سے ہوا۔ وہ اپنی قبر انور میں نماز ادا کر رہے تھے۔ وہ ایک طویل اور گندم گوں شخص تھے۔ گویا کہ وہ ان کا تعلق شنوءۃ قبیلہ کے افراد کے ساتھ ہو۔ وہ بآواز بلند کہہ رہے تھے ''تو نے انہیں عزت دی ہے۔ تو نے انہیں فضیلت دی ہے۔'' آپ ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ تمہارے ساتھ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''یہ احمد مجتبیٰ ﷺ ہیں۔ انہیں خوش آمدید کہیں۔ یہ وہ نبی اکرم ﷺ ہیں جنہوں نے اپنی امت کے لیے خیر خواہی کا اظہار کیا۔'' انہوں نے آپ ﷺ کے لیے برکت کی دعا کی اور کہا: ''اپنی امت کے لیے آسانی کا سوال کرنا۔'' یہ مبارک کارواں آگے روانہ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام ہیں۔'' آپ نے پوچھا: ''یہ کس کے ساتھ جھگڑا کر رہے تھے؟'' حضرت جبرائیل: ''اپنے رب تعالیٰ سے۔'' حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: ''کیا یہ اپنے رب تعالیٰ کے حضور اپنی صدا بلند کر رہے تھے۔'' انہوں نے عرض کی: ''رب تعالیٰ نے انہیں خاص مقام عطا فرمایا ہے۔'' پھر یہ کارواں ایک شخص کے پاس سے گزرا جو کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا: ''جبرائیل! تمہارے ہمراہ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''یہ تمہارے بھائی حضرت محمد عربی ﷺ ہیں۔'' انہوں نے آپ ﷺ کو خوش آمدید کہا اور برکت کی دعا کی اور کہا: ''اپنی امت کے لیے آسانی کا سوال کرنا۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''یہ آپ کے بھائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔'' پھر آپ ﷺ ایک درخت کے پاس سے گزرے۔ جس کے پھل گویا کہ سرخ ہوں۔ اس کے نیچے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ کچھ عیال بھی تھے۔ آپ ﷺ نے چراغ اور روشنی دیکھی۔

آپ ﷺ نے پوچھا: ”جبرائیل! یہ کون ہیں۔“ انہوں نے عرض کی: ”یہ آپ ﷺ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔“ آپ ﷺ نے انہیں سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا: ”یا جبرائیل! آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہے؟“ انہوں نے کہا: ”یہ آپ ﷺ کے لختِ جگر احمد مجتبیٰ ﷺ ہیں۔“ انہوں نے کہا: ”نبی عربی ﷺ کو خوش آمدید! جنہوں نے اپنے رب تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا ہے اور اپنی امت کے لیے خیر خواہی کا اظہار کیا ہے۔ نورِ نظر! آج رات آپ ﷺ اپنے رب تعالیٰ سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ کی امت آخری امت ہے۔ یہ سب سے کمزور امت ہے۔ اگر آپ ﷺ اپنی امت کی کسی حاجت کو پورا کر سکتے ہیں تو ضرور کر دینا۔“ انہوں نے آپ ﷺ کے لیے برکت کی دعا کی۔

یہ کارواں آگے بڑھ گیا حتیٰ کہ بیت المقدس کی وادی میں پہنچ گیا۔ وہاں جہنم قالین کی طرح عیاں تھی۔ آپ ﷺ سے عرض کی گئی: ”یارسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم! آپ ﷺ نے اسے کیسے پایا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کوئلہ کی طرح۔“ پھر آپ ﷺ بیت المقدس پہنچ گئے۔ بابِ یمانی سے داخل ہوئے۔ مسجد کے دائیں اور بائیں دو نور پھیل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”جبرائیل! یہ کیسے نور ہیں؟“ انہوں نے عرض کی: ”جو نور آپ ﷺ کے دائیں طرف ہے وہ آپ ﷺ کے بھائی حضرت داؤد علیہ السلام کا محراب ہے۔ جو نور آپ ﷺ کے بائیں طرف ہے وہ آپ ﷺ کی بہن حضرت مریم علیہا السلام کی قبر انور پر ہے۔ آپ ﷺ مسجد کے اس دروازہ سے داخل ہوئے جہاں سورج اور چاند کا میلان ہوتا ہے۔“ حضرت جبرائیل امین اس چٹان کے پاس گئے جو بیت المقدس میں ہے۔ انہوں نے اس میں انگلی ڈال کر اس میں شگاف کیا۔ اس کے ساتھ براق باندھا۔ مسلم شریف میں ہے کہ انہوں نے اس حلقہ کے ساتھ براق باندھا جس کے ساتھ انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔

آپ ﷺ جب مسجد اقصیٰ کی چٹان پر چڑھے تو حضرت جبرائیل نے کہا: ”محمد عربی! صلی اللہ علیک وسلم کیا میں اپنے رب تعالیٰ سے التجاء کروں کہ وہ آپ ﷺ کو حور عین دکھائے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں!“ انہوں نے کہا: ”آپ ﷺ میرے ہمراہ ان خواتین کے پاس چلیں اور انہیں سلام کریں۔“ وہ چٹان کی بائیں طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ ان کے

پاس گئے۔ انہیں سلام کیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب دیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' انہوں نے کہا: ''عمدہ سیرت والیاں، خوبصورت چہرہ والیاں، ہم پاکباز بندوں کی بیویاں ہیں۔ وہ پاک ہو گئے۔ ان میں میل نہ رہی۔ وہ مقیم ہو گئے۔ انہوں نے سفر نہ کیے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو گئے۔ اب انہیں موت نہیں۔''

پھر آپ ﷺ نے اور حضرت جبرائیل امین نے دو رکعتیں نماز پڑھی۔ تھوڑی سی دیر میں وہاں انبیائے کرام علیہم السلام جمع ہو گئے۔ ان میں بعض حالت قیام، بعض حالتِ رکوع اور بعض حالتِ سجود میں تھے۔ پھر مؤذن نے آذان دی۔ اقامت کہی گئی وہ سب انتظار کرنے لگے کہ اب انہیں امامت کون کرائے گا۔ حضرت جبرائیل امین نے آپ ﷺ کا دست اقدس پکڑا اور مصلیٰ امامت پر کھڑا کر دیا۔ آپ ﷺ نے انہیں دو رکعتیں پڑھائیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ انبیائے کرام نے آپ ﷺ کو آگے کھڑا کیا تھا۔ حضرت کعب سے روایت ہے کہ حضرت جبرائیل امین نے آذان دی۔ آسمان سے فرشتے اتر آئے۔ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے سارے انبیاء کو جمع کر دیا۔ آپ نے ملائکہ اور انبیاء کو نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ واپس آئے تو حضرت جبرائیل امین نے پوچھا: ''کیا آپ ﷺ کو پتہ ہے کہ آپ ﷺ کے پیچھے نماز کس نے ادا کی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' انہوں نے عرض کی: ''ہر نبی نے جسے اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا ہے۔''

امام حاکم اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ انبیاء کرام کی ارواح نے باہم ملاقات کی۔ انہوں نے اپنے رب تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے مجھے اپنا خلیل بنایا۔ وہ عظیم ملک عطا فرمایا مجھے انکساری کرنے والی امت بنایا۔ میری اقتداء کی جاتی ہے۔ اس نے مجھے آگ سے بچایا۔ اسے مجھ پر ٹھنڈی اور سلامتی والا بنا دیا۔''

پھر حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کی تعریف کی: ''ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے مجھے شرف ہمکلامی بخشا۔ میرے ہاتھوں فرعون کو ہلاک کیا۔ بنو اسرائیل کو نجات دی۔ میری امت میں سے ایک ایسی قوم بنائی جو حق کے ساتھ راہ نمائی

کرتی ہے اور اس کے ساتھ عدل کرتی ہے۔" پھر حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی۔ انہوں نے کہا: "ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے میرے لیے بڑا ملک بنایا۔ مجھے زبور کا علم عطا کیا۔ میرے لیے لوہا نرم کیا۔ میرے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا۔ وہ پرندوں کے ساتھ مل کر تسبیح بیان کرتے تھے۔ مجھے حکمت اور فیصلہ کرنے کی قوت عطا کی۔"

پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کی یوں تعریف بیان کی: "تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے میرے لیے ہوا کو مسخر کیا۔ میرے لیے شیاطین اور انسانوں کو مسخر کیا۔ وہ میرے لیے محراب، مجسمے، بڑے بڑے پیالے اور جم جانے والی ہنڈیاں بناتے۔ مجھے پرندوں کی بولیاں سکھائیں۔ مجھے اپنے فضل و کرم سے ہر چیز عطا کی۔ میرے لیے جن و انس کے لشکر، شیاطین اور پرندوں کو مسخر کیا۔ مجھے اپنے بہت سے مؤمن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ مجھے عظیم سلطنت عطا کی جو میرے بعد کسی کے حصہ میں نہ ہوگی۔ میرے ملک کو پاکیزہ ملک بنایا جس میں نہ حساب ہے نہ ہی عذاب۔"

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی۔ انہوں نے کہا: "ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے مجھے اپنا کلمہ بنایا۔ مجھے حضرت آدم علیہ السلام کی مثل بنایا۔ انہیں مٹی سے بنایا پھر انہیں کہا: "ہو جا" تو وہ بن گئے۔ مجھے کتاب، حکمت، تورات اور انجیل سکھائی۔ مجھے یہ سعادت بخشی کہ میں مریضوں کو شفایاب کر دیتا تھا۔ میں اذنِ الٰہی سے مردے زندہ کر دیتا تھا۔ اس نے مجھے بلند کیا۔ مجھے پاک کیا۔ مجھے اور میری والدہ ماجدہ کو شیطان مردود سے پناہ دی۔ شیطان کو ہم پر کوئی تسلط نہ تھا۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم سب نے اپنے رب تعالیٰ کی تعریف بیان کی ہے۔ میں بھی اپنے رب تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے لگا ہوں۔" پھر فرمایا: "ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ مجھے سارے لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ مجھ پر قرآن پاک نازل کیا جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ میری امت کو بہترین امت قرار دیا۔ جس کا ظہور لوگوں کے لیے کیا گیا ہے۔ میری امت کو بہترین امت بنایا۔ میری

امت کو اول اور آخر بنایا۔ میرے لیے میرا سینہ کھولا۔ مجھ سے میرا بوجھ دور کیا۔ میرا ذکر بلند کیا۔ مجھے فاتح اور خاتم بنایا۔"

پھر انہوں نے باہم قیامت کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے اپنا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹایا۔ انہوں نے فرمایا: "مجھے تو اس کا کوئی علم نہیں۔" انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹایا۔ انہوں نے بھی فرمایا: "مجھے تو اس کا کوئی علم نہیں ہے۔" انہوں نے معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹایا۔ انہوں نے فرمایا: "اس کے مقررہ وقت کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ میرے رب نے میرے ساتھ یہ معاہدہ کیا ہے کہ دجال کا ظہور ہو گا۔ میرے پاس دو تلواریں ہوں گی۔ جب دجال مجھے دیکھے گا تو وہ اس طرح پگھل جائے گا جس طرح سیسہ پگھلتا ہے۔ وہ جب مجھے دیکھے گا تو رب تعالیٰ اسے ہلاک کر دے گا۔ حتیٰ کہ پتھر کہے گا: "اے مسلمان! میرے نیچے کافر ہے۔ آؤ اسے تہ تیغ کر دو۔ رب تعالیٰ انہیں ہلاک کر دے گا۔ لوگ اپنے شہروں اور وطنوں کی طرف لوٹ آئیں گے۔ اس وقت یاجوج ماجوج کا ظہور ہو گا۔ وہ ہر بلند جگہ سے تیزی کے ساتھ آئیں گے۔ وہ ہر چیز کو تباہ کر دیں گے۔ وہ جس چیز کے پاس سے گزریں گے اسے کھا جائیں گے۔ جس پانی کے پاس سے گزریں گے اسے پی جائیں گے۔ لوگ واپس آئیں گے۔ میرے پاس ان کی شکایت کریں گے۔ میں رب تعالیٰ سے دعا کروں گا۔ وہ انہیں ہلاک کر دے گا۔ زمین پر ان کی بو پھیل جائے گی۔ رب تعالیٰ بارش کو نازل کرے گا۔ پانی ان کے اجسام کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گا۔ رب تعالیٰ نے میرے ساتھ یہ عہد کیا ہے۔ جب صورت حال اس طرح ہو گی تو قیامت اس حاملہ اونٹنی کی طرح ہو گی جس کے اہلِ خانہ نہیں جانتے کہ دن یا رات میں کسی وقت اس کا وضع حمل ہو جائے۔"

حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیاس نے آلیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں دو پیالے پیش کیے گئے۔ ایک دائیں طرف سے دوسرا بائیں طرف سے۔ ایک میں دودھ اور دوسرے میں شہد تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تین برتن پیش کیے گئے۔ ان کے منہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک برتن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں

پیش کیا گیا۔ اس میں پانی تھا۔ آپ نے اس میں سے تھوڑا سا پی لیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ بھی نہ پیا۔ پھر آپ ﷺ کی خدمت میں ایک اور برتن پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے اس سے سیر ہو کر پیا۔ پھر ایک اور برتن پیش کیا گیا۔ جس میں شراب تھی۔ آپ ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ ﷺ نوش فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں سیر ہو چکا ہوں'' حضرت جبرائیل نے عرض کی: ''یہ عنقریب آپ ﷺ کی امت پر حرام کر دی جائے گی۔'' ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں پانی، شراب اور دودھ پیش کیا گیا۔ ایک روایت میں پانی کی جگہ شہد کا تذکرہ ہے۔ آپ ﷺ نے تھوڑا سا شہد تناول فرمایا۔ دودھ کا برتن پکڑا تو اس سے سیر ہو کر پیا۔ حضرت جبرائیل امین نے آپ ﷺ کے شانہء اقدس پر ہاتھ رکھا اور عرض کی: ''آپ ﷺ نے فطرت کو پالیا ہے۔ اگر آپ ﷺ شراب پی لیتے تو آپ ﷺ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ ان میں سے بہت تھوڑے آپ ﷺ کی اتباع کرتے۔ اگر آپ ﷺ پانی پی لیتے تو آپ کی امت غرق ہو جاتی۔'' ایک روایت میں ہے کہ اس بزرگ نے حضرت جبرائیل سے کہا جو منبر کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھا ''تمہارے رفیق نے فطرت کو پالیا ہے۔ یہ ہدایت یافتہ ہیں۔''

پھر آپ ﷺ کی خدمت میں وہ سیڑھی لائی گئی جس سے اولادِ آدم کی ارواح اوپر چڑھتی ہیں۔ مخلوق نے اتنی حسین سیڑھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس کا ایک زینہ چاندی کا اور دوسرا زینہ سونے کا تھا۔ ابوسعید نے شرف المصطفیٰ میں لکھا ہے کہ جنت الفردوس سے ایک سیڑھی آپ ﷺ کی خدمت میں لائی گئی۔ جس پر موتی جڑے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کے دائیں اور بائیں فرشتے تھے۔ آپ ﷺ اور حضرت جبرائیل اس پر چڑھ گئے۔ حتیٰ کہ آسمان دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازے تک پہنچ گئے۔ اس دروازے کو باب الحفظہ کہا جاتا ہے۔ اس پر نگران فرشتے کا نام اسماعیل ہے۔

امام بیہقی نے لکھا ہے کہ ہوا پرسکون ہوتی ہے۔ وہ نہ کبھی آسمان کی طرف چڑھتی ہے نہ زمین کی طرف آتی ہے۔ مگر اس روز جب حضور اکرم ﷺ کا وصال ہوا تھا'' آپ کے آگے ستر ہزار فرشتے تھے۔ ہر فرشتے کے ساتھ ستر ہزار کا لشکر تھا۔ حضرت جبرائیل نے دروازہ

کھولنے کے لیے کہا۔ پوچھا گیا: ''کون ہو؟'' انہوں نے کہا: ''جبرائیل!'' پوچھا گیا: ''تمہارے ہمراہ کون ہے؟'' انہوں نے کہا: ''محمد عربی ﷺ'' اس نے کہا: ''کیا ان کی طرف پیغام دے کر بلایا گیا ہے؟'' جبرائیل: ہاں!'' فرشتہ نے کہا: ''انہیں مرحبا اھلاً وسہلاً'' رب تعالیٰ بھائی اور خلیفہ کی طرف سے انہیں سلام پہنچائے۔ وہ کتنے اچھے بھائی اور کتنے اچھے خلیفہ ہیں۔ وہ کتنے اچھے آنے والے ہیں۔'' فرشتہ آگے آیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ جب آسمان پر پہنچے تو وہاں حضرت آدم تشریف فرما تھے۔ وہ اس صورت میں تھے جس میں رب تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تھا۔ ان پر ان کی اولاد میں اہلِ ایمان کی ارواح پیش کی جاتیں۔ وہ فرماتے: ''کتنی پاکیزہ روح ہے۔ کتنا طیب نفس ہے۔ اسے علیین میں رکھ دو۔'' پھر ان پر کفار کی ارواح پیش کی جاتیں۔ وہ کہتے ''کتنی خبیث روح ہے؟ کتنا خبیث نفس ہے؟ اسے سجین میں رکھ دو۔'' ان کی دائیں طرف ہجوم تھا۔ ایک دروازہ تھا جس سے عمدہ خوشبو نکل رہی تھی۔ ایک دروازہ بائیں طرف تھا جس سے گندی بو آ رہی تھی۔ اس طرف بھی ہجوم تھا۔ جب وہ دائیں طرف دیکھتے تو مسکراتے۔ خوش ہو جاتے۔ جب بائیں طرف دیکھتے تو غمزدہ ہو جاتے اور رونے لگتے۔ حضور اکرم ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا: ''صالح بیٹے اور صالح نبی کو خوش آمدید!'' حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل سے پوچھا: ''اے جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''یہ آپ ﷺ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ یہ اژدہام ان کی اولاد کا ہے۔ دائیں طرف جنتی ہیں۔ بائیں طرف دوزخی ہیں۔ جب وہ دائیں طرف دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ جب بائیں طرف دیکھتے ہیں تو رونے لگتے ہیں۔ ان کے دائیں طرف جنت کا دروازہ ہے۔ جب اپنی اولاد میں سے جنت میں داخل ہونے والے کو دیکھتے ہیں تو مسکراتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ ان کے بائیں طرف جہنم کا دروازہ ہے۔ جب اپنی اولاد میں سے اس میں داخل ہونے والے کو دیکھتے ہیں تو روتے ہیں غمزدہ ہوتے ہیں۔''

پھر آپ ﷺ آگے تشریف لے گئے۔ اچانک آپ ﷺ نے دستر خوان دیکھے جن پر عمدہ گوشت پڑا ہوا تھا۔ لیکن ان کے قریب کوئی نہ جاتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے اور دستر خوان دیکھے جس سے بُو آ رہی تھی۔ لوگ ان سے کھا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''اے

جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ آپ ﷺ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو حلال کو چھوڑ کر حرام کے پاس جاتے ہیں۔'' دوسری روایت میں ہے ''آپ ﷺ نے ایسے دسترخوان دیکھے جن پر انتہائی خوبصورت بھونا ہوا گوشت تھا۔ اس کے اردگرد مردار پڑے ہوئے تھے۔ لوگ مردار کی طرف جا رہے تھے اور اسے کھا رہے تھے۔ وہ گوشت کو چھوڑ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جبرائیل! یہ کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ زانی ہیں۔ جو رب تعالیٰ کے حرام کردہ امور کو حلال کرتے ہیں اور اسے چھوڑ دیتے ہیں جسے رب تعالیٰ نے حلال کیا ہے۔''

پھر آپ ﷺ تھوڑا سا آگے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے ایسے لوگ دیکھے جن کے پیٹ کمروں کی طرح تھے۔ جن میں سانپ تھے جو باہر سے نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک اسے جب بھی ڈنگ مارتا وہ گر پڑتا۔ وہ کہتا: ''رب تعالیٰ قیامت قائم نہ ہو۔ وہ آلِ فرعون کی راہ پر تھے۔ وہ انہیں روندھ رہے تھے۔ وہ انہیں سن رہے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں آہ و زاری کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ آپ ﷺ کی امت کے وہ لوگ ہیں:

الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ (البقرۃ:۲۷۵)

ترجمہ: ''وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے چھوکر۔''

پھر آپ ﷺ آگے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے ایسے لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے ہونٹوں کی طرح تھے۔ جو اپنے منہ کھولتے تھے اور پتھر نگل رہے تھے۔ دوسری روایت میں ہے، وہ اپنے منہ سے جہنم کے پتھر کھا رہے تھے وہ پتھر ان کے پیچھے سے نکل رہے تھے۔ وہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں آہ و زاری کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''اے جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ وہ لوگ ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝۱۰ (النساء:۱۰)

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے وہ تو بس کھا رہے ہیں

اپنے پیٹوں میں آگ اور وہ عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی آگ میں۔"

پھر آپ ﷺ آگے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے کچھ خواتین دیکھیں جو پستانوں کے بل لٹکی ہوئی تھیں۔ بعض کو پاؤں کے بل اوندھا لٹکایا گیا تھا۔ وہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں آہ و پکار کر رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جبرائیل! یہ کون ہیں؟" انہوں نے عرض کی: "یہ وہ عورتیں ہیں جو بدکاری کرتی ہیں اور اپنی اولاد کو قتل کرتی ہیں۔"

پھر آپ ﷺ آگے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے ایسے لوگ دیکھے جن کے پہلوؤں سے گوشت کاٹا جا رہا تھا۔ انہیں کہا جا رہا تھا۔ "اسے کھاؤ! جیسے تم اپنے بھائی کا گوشت کھاتے تھے۔" آپ ﷺ نے پوچھا: "جبرائیل! یہ کون ہیں؟" انہوں نے عرض کی: "یہ آپ ﷺ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی کرتے ہیں۔"

پھر یہ دونوں حضرات قدسی دوسرے آسمان کی طرف بلند ہو گئے۔ حضرت جبرائیل نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو ان کو کہا گیا: "کون؟" انہوں نے کہا: "جبرائیل!" پوچھا گیا: "تمہارے ہمراہ کون ہے؟" انہوں نے کہا: "جانِ عالم محمد عربی ﷺ" پوچھا گیا: "کیا ان کی طرف پیغام بھیج کر بلایا گیا ہے؟" انہوں نے کہا: "ہاں" کہا گیا: "انہیں مرحبا، اھلا و سھلا اللہ تعالیٰ انہیں ایک بھائی اور ایک خلیفہ کی طرف سے سلام بھیجے۔ وہ کتنے عمدہ بھائی اور کتنے عمدہ خلیفہ ہیں؟ وہ کتنے اچھے آنے والے ہیں۔" ان کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ جب وہ آسمان پر جلوہ افروز ہو گئے۔ وہاں دو خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ بن زکریا علیہم السلام۔ ان میں سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ ان کے کپڑے اور ان کے بال ایک جیسے تھے۔ ان کے ہمراہ ان کی قوم کے کچھ افراد تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قد مبارک میانہ تھا۔ ان کی رنگت میں سرخی اور سفیدی تھی۔ بال سیدھے تھے گویا کہ وہ ابھی ابھی حمام سے نکلے ہوں۔ وہ حضرت عروہ بن مسعود الثقفی کے مشابہ تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا: "صالح بھائی اور صالح نبی کو خوش آمدید! انہوں نے آپ ﷺ کے لیے دعا کی۔

پھر یہ حضرات قدسی تیسرے آسمان کی طرف چلے گئے۔ حضرت جبرائیل نے دروازہ

کھولنے کے لیے کہا۔ ان سے پوچھا گیا: ''کون ہو؟'' انہوں نے کہا: ''جبرائیل!'' پوچھا گیا: ''آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''روحِ کائنات محمد عربی ﷺ'' پوچھا گیا: ''کیا انہیں پیغام بھیج کر بلایا گیا ہے۔'' انہوں نے کہا: ''ہاں۔'' آپ کو خوش آمدید اور مرحبا کہا گیا۔ آپ ﷺ کو سلام پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔
جب یہ دونوں حضرات آسمان پر آئے تو وہاں حضرت یوسف علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ ان کے ہمراہ ان کی قوم کے کچھ افراد تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ پھر انہوں نے کہا: ''صالح بھائی اور صالح نبی کو مرحبا!'' انہوں نے آپ ﷺ کے لیے دعائے خیر کی۔ انہیں حسن و جمال کا نصف عطا کیا گیا تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی مخلوق میں سے حسین ترین تھے۔ وہ اس طرح حسین تھے جس طرح ماہِ تمام سارے ستاروں سے حسین ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ آپ ﷺ کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔'' پھر یہ دونوں حضرات چوتھے آسمان تک پہنچے۔ حضرت جبرائیل نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ پوچھا گیا: ''کون؟'' انہوں نے کہا: ''جبرائیل'' ان سے پوچھا گیا: ''آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہے؟'' انہوں نے کہا: ''محمد عربی ﷺ'' انہوں نے پوچھا: ''کیا انہیں پیغام دے کر بھیجا گیا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''ہاں!'' آپ ﷺ کو خوش آمدید اور مرحبا کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ایک بھائی اور ایک خلیفہ کی طرف سے سلام بھیجے۔ آپ ﷺ کتنے اچھے بھائی اور خلیفہ ہیں۔ آپ ﷺ کتنے اچھے آنے والے ہیں۔ جب وہ آسمان تک پہنچے تو وہاں حضرت ادریس علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ رب تعالیٰ نے انہیں بلند مقام عطا کیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا: ''صالح بھائی اور صالح نبی کو سلام۔'' پھر آپ ﷺ نے ان کے لیے دعائے خیر کی۔
پھر یہ دونوں حضرات پانچویں آسمان کی طرف رواں ہوئے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ ان سے پوچھا گیا: ''کون؟'' انہوں نے کہا: ''جبرائیل۔'' انہوں نے پوچھا: ''آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہے؟'' انہوں نے کہا: ''محمد عربی ﷺ۔'' ان

سے پوچھا گیا: ''کیا انہیں پیغام بھیجا گیا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''ہاں!'' انہوں نے کہا: ''خوش آمدید! مرحبا! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خلیفہ اور بھائی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام! آنے والے کتنے اچھے خلیفہ اور کتنے اچھے بھائی ہیں۔'' ان کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ جب وہاں پہنچے تو وہاں حضرت ہارون علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ ان کی نصف داڑھی سفید اور نصف داڑھی سیاہ تھی۔ داڑھی ان کی ناف تک تھی۔ ان کے ارد گرد بنو اسرائیل تھے۔ وہ انہیں کچھ بیان فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے انہیں سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا: ''صالح بھائی اور صالح نبی کو سلام۔'' پھر دعائے خیر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''یہ اپنی قوم کے محبوب حضرت ہارون علیہ السلام ہیں۔'' پھر یہ دونوں حضرات چھٹے آسمان کی طرف بلند ہوئے۔ حضرت جبرائیل نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ ان سے پوچھا گیا: ''کون؟'' انہوں نے کہا: ''جبرائیل!'' ان سے پوچھا گیا: ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ کون ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' پوچھا گیا: ''کیا انہیں پیغام دے کر بھیجا گیا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''ہاں!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا گیا: ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک بھائی اور ایک خلیفہ کی طرف سے سلام! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتنے اچھے بھائی اور کتنے اچھے خلیفہ اور کتنے اچھے آنے والے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض ایسے انبیاء کرام کے پاس سے گزرے جن کے ہمراہ ایک قبیلہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض ایسے انبیائے کرام کے پاس سے گزرے جن کے ہمراہ ایک قوم تھی۔ بعض انبیاء کے ہمراہ ایک شخص بھی نہ تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عظیم ہجوم کے پاس سے گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جواب دیا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم ہیں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا سر اقدس بلند فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت ہی بڑا اژدہام دیکھا۔ جس نے اس طرف سے بھی اور اس طرف سے بھی افق کو گھیر رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی گئی: ''یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہے۔ ان کے علاوہ ستر ہزار ایسے بھی ہیں جو حساب کے بغیر جنت میں داخل ہوں گے۔'' جب یہ حضرات آسمان پر چڑھے تو وہاں حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ ان کی رنگت گندم گوں تھی۔ وہ طویل قامت تھے۔ گویا کہ وہ شنوءۃ کے

ایک آدمی ہوں۔ ان کے بال کثیر تھے۔ اگر انہوں نے دو قمیصیں بھی پہنی ہوتیں وہ ان سے بھی باہر نکل آتے۔" حضور اکرم ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ پھر کہا: "صالح بھائی اور صالح نبی کو سلام۔" پھر آپ ﷺ کے لیے دعائے خیر کی۔ پھر کہا: "لوگ گمان کرتے ہیں کہ میں بارگاہِ ربانیہ میں ان سے زیادہ معزز ہوں۔ بلکہ یہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں مجھ سے زیادہ معزز ہیں۔" جب حضور اکرم ﷺ آگے گزرے تو یہ رونے لگے۔ ان سے پوچھا گیا: "آپ کیوں رو رہے ہیں؟" انہوں نے کہا: "میں اس لیے رو رہا ہوں کہ حضور اکرم ﷺ کو مجھ سے بعد میں مبعوث کیا گیا۔ لیکن ان کے امتی میرے امتیوں سے زیادہ جنت میں داخل ہوں گے۔ بنو اسرائیل گمان کرتے ہیں کہ میں سارے بنو آدم سے بارگاہِ ربوبیت میں معزز ہوں۔ لیکن یہ ہستی مجھ سے بعد میں دنیا میں گئی۔ لیکن میں مرتبہ میں ان سے کم ہوں۔ اگر یہ اکیلے ہی ہوتے مجھے کوئی پرواہ نہ تھی۔ لیکن ان کے ہمراہ ان کی ساری امت ہوگی۔" پھر یہ حضرات آگے گزر گئے۔

جب ساتویں آسمان تک پہنچے تو اوپر رعد، برق اور بجلیاں دیکھیں۔ حضرت جبرائیل نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ ان سے پوچھا گیا۔ "کون؟" انہوں نے کہا: "جبرائیل!" پوچھا گیا: "آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہے؟" انہوں نے کہا: "محمد عربی ﷺ!" پوچھا گیا کیا انہیں پیغام دے کر بلایا گیا ہے؟" انہوں نے کہا: "ہاں!" آپ ﷺ کو خوش آمدید اور مرحبا کہا گیا۔ آپ ﷺ کو ایک بھائی اور ایک خلیفہ کی طرف سے خوش آمدید آپ ﷺ کتنے اچھے آنے والے ہیں۔ ان کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ انہوں نے بلند آسمانوں سے تسبیح کی آوازیں سنیں۔ ان کے ساتھ بھی بہت سی تسبیحات تھیں۔ بلند آسمان ڈرتے ڈرتے تسبیح خوانی کر رہے تھے۔ یہ یوں کہہ رہے تھے: "سبحان العلی الاعلیٰ سبحانہ و تعالیٰ" جب یہ حضرات آسمان پر چڑھے تو وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ ان کے بال سیاہ اور سفید تھے۔ وہ جنت کے دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک کرسی پر بیت المعمور کی طرف کمر انور کیے ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ ان کی قوم کے کچھ افراد تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا: "صالح

نبی اور صالح فرزند کو خوش آمدید! انہوں نے کہا: ''آپ ﷺ اپنی امت کو حکم دیں کہ جنت میں زیادہ پودے لگایا کرے۔ اس کی مٹی بہت عمدہ اور اس کی زمین بہت وسیع ہے۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''جنت کے پودے کیسے لگتے ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھنے سے'' دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: ''اپنی امت کو میری طرف سے سلام دینا اور انہیں بتانا کہ جنت کی مٹی بہت عمدہ ہے۔ اس کا پانی بڑا شیریں ہے اور سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ پڑھنے سے اس میں پودا لگ جاتا ہے۔'' آپ اولادِ ابراہیم میں سے سب سے زیادہ ان کے مشابہ تھے۔ ان کے پاس ایسی قوم بیٹھی ہوئی تھی جس کے چہرے سفید تھے۔ وہ اوراق کی مانند تھے۔ ایک قوم کی رنگت میں کچھ اختلاط تھا۔ یہ لوگ اٹھے جن کی رنگت میں اختلاط تھا۔ وہ ایک نہر میں داخل ہوئے۔ اس میں انہوں نے غسل کیا۔ جب وہ باہر نکلے تو ان کی رنگت بھی سفید ہو چکی تھی۔ ان کی رنگت ان کے ساتھیوں کی رنگت کی طرح ہو چکی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ سفید رنگت والے کون تھے۔ یہ کون تھے جن کی رنگت میں اختلاط تھا۔ اور یہ کون سی نہر ہے؟'' انہوں نے کہا: ''یہ لوگ جو سفید رنگت والے تھے یہ وہ تھے جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا تھا۔ جن کی رنگت میں اختلاط تھا ان کے بعض اعمال پاکیزہ اور بعض اعمال عمدہ نہ تھے۔ انہوں نے توبہ کی۔ رب تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرما لی۔ ان نہروں میں سے پہلی نہر اللہ تعالیٰ کی رحمت دوسری اللہ تعالیٰ کی نعمت اور تیسری کا تذکرہ اس آیت طیبہ میں ہے:

وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿٢١﴾ (الانسان:٢١)

ترجمہ: ''اور ان کا پروردگار انہیں شرابِ طہور پلائے گا۔''

آپ ﷺ سے عرض کی گئی کہ یہ آپ ﷺ کا اور آپ ﷺ کی امت کا مقام ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کو دو حصوں میں منقسم دیکھا۔ ایک حصہ نے کاغذ کی طرح سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ لیکن دوسرے حصے کے کپڑے صحیح سفید نہ تھے بلکہ میلے تھے۔ حضور ﷺ بیت المعمور میں داخل ہو گئے۔ آپ ﷺ کی امت کے سفید پوش لوگ بھی آپ ﷺ کے ہمراہ اس

میں داخل ہو گئے۔لیکن جن کے کپڑے میلے تھے انہیں روک دیا گیا۔حالانکہ وہ بھی بھلائی پر تھے۔آپ ﷺ نے اور دیگر اہلِ ایمان نے بیت المعمور میں نماز ادا کی۔اس مقدس گھر میں ہر روز ستر ہزار ملائکہ داخل ہوتے ہیں۔پھر وہ دوبارہ حشر تک اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ پھر آپ ﷺ اور وہ سفید پوش لوگ اس سے باہر نکل آئے۔

طبرانی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:''جب شبِ معراج مجھے ملاءِ اعلیٰ کی سیر کرائی گئی تو حضرت جبرائیل خشیت الٰہیہ سے پرانے بوریا کی طرح ہو گئے تھے۔پھر آپ ﷺ کے پاس تین برتن لائے گئے۔ایک میں شراب دوسرے میں دودھ اور تیسرے میں شہد تھا۔آپ ﷺ نے دودھ نوش فرما لیا۔حضرت جبرائیل نے کہا۔''آپ ﷺ کی امت فطرت پر عمل پیرا ہو گی۔''یا''یہ وہ فطرت ہے جس پر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت ہے۔''پھر آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا۔زمین سے بلند ہونے والی چیز اس جگہ جا کر رک جاتی ہے۔وہاں سے اسے حاصل کر لیا جاتا ہے۔اوپر سے آنے والی چیز بھی اس جگہ آ کر رک جاتی ہے۔اسے وہاں سے حاصل کر لیا جاتا ہے۔آپ ﷺ نے ایک درخت دیکھا جس کے نیچے سے نہریں نکل رہی تھیں۔کچھ نہریں ایسے پانی کی تھیں جو بوسیدہ نہیں ہوتا تھا۔کچھ نہریں شراب کی تھیں جو پینے والوں کے لیے سراپا لذت تھیں۔کچھ نہریں صاف شہد کی تھیں۔اگر ایک سوار ستر سال اس کے سایہ میں چلتا رہتا وہ پھر بھی اسے طے نہ کر سکتا۔اس کا پھل ہجر کے مٹکوں کی طرح تھا۔اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کی طرح تھے۔ قریب تھا کہ اس کا ایک پتا اس امت کو ڈھانپ دیتا۔طبرانی کی روایت میں ہے''اس کا ایک پتا مخلوق کو سایہ کر سکتا تھا۔''ہر ہر پتے پر ایک ایک فرشتہ بیٹھا ہوا تھا۔اس پر رنگ غالب تھا۔ معلوم نہیں انہیں کس چیز سے بنایا گیا تھا۔جب اس پر اللہ تعالیٰ کا وہ امر غالب آ گیا جو آ گیا تو وہ متغیر ہو گیا۔دوسری روایت میں ہے کہ وہ یاقوت اور زبرجد میں تبدیل ہو گیا۔کسی شخص میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس کا حسن و جمال بیان کر سکے۔اس میں سونے کے بستر لگے ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہاں سونے کی ٹڈیاں تھیں۔

آپ ﷺ سے عرض کی گئی کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔اس پر آپ ﷺ کی امت کا ہر وہ شخص

فائز ہوگا جو آپ ﷺ کی راہ پر چلے گا۔اس کی اصل سے چار نہریں رواں تھیں۔دو ظاہری اور دو باطنی نہریں۔آپ ﷺ نے پوچھا: ''اے جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''باطنی نہریں جنت کی نہریں ہیں جبکہ ظاہری نہریں نیل اور فرات ہیں۔'' دوسری روایت میں ہے کہ اس کے اصل سے ایک چشمہ رواں تھا جسے سلسبیل کہا جاتا تھا۔اس سے دو نہریں نکل رہی تھیں۔ان میں سے ایک نہر کوثر ہے۔جو تیر کی طرح تیزی سے بھرپور رواں دواں تھی۔ اس پر موتی، یاقوت اور زبرجد کے خیمے تھے۔اس پر سبز نرم پرندے تھے۔آپ ﷺ نے وہاں سونے اور چاندی کے برتن دیکھے۔ یہ نہر یاقوت اور زمرد پر بہہ رہی ہے۔اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید تھا۔آپ ﷺ نے ایک برتن لیا۔اس پانی سے بھرا اور نوش فرمایا۔وہ شہد سے زیادہ شیریں تھا۔مشک سے زیادہ خوشبودار تھا۔حضرت جبرائیل نے کہا: ''یہ وہ نہر ہے جسے رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا کیا ہے۔دوسری نہر، نہر رحمت تھی۔جو اس میں غسل کرتا ہے اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ حضور پاک ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس حضرت جبرائیل کو دیکھا ان کے چھ سو پر تھے۔ایک پر نے افق کو گھیر رکھا تھا۔ان کے پروں کی رنگت یاقوت اور موتیوں کے بارے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔پھر آپ ﷺ جنت کے اندر تشریف فرما ہو گئے۔وہاں ایسی نعمتیں تھیں جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا۔جن کے بارے کسی کان نے نہ سنا تھا۔نہ ہی ان کے بارے کسی بشر کے دل پر گمان گزرا تھا۔آپ ﷺ نے دیکھا اس کے دروازے پر لکھا تھا ''صدقہ کا اجر دس گنا ہے اور جبکہ قرض کا اجر اٹھارہ گنا ہے۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''جبرائیل! کیا وجہ ہے کہ قرض صدقے سے افضل ہے؟'' انہوں نے کہا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ سائل جب مانگتا ہے تو اس کے پاس کچھ ہوتا ہے لیکن قرض مانگنے والا صرف حاجت کے وقت ہی مانگتا ہے۔'' آپ ﷺ کے سامنے ایک حور آ گئی۔آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''تو کس کے لیے ہے؟'' اس نے عرض کی: ''حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے لیے۔'' آپ ﷺ نے جنت کو دیکھا جسے سفید موتی سے بنایا گیا تھا۔وہاں موتیوں کے قبے تھے۔آپ ﷺ نے کہا: ''جبرائیل! میرے

صحابہ مجھ سے جنت کے بارے سوال کریں گے۔" انہوں نے عرض کی: "انہیں بتائیں کہ جنت ایک بلند جگہ ہے جس کی مٹی مشک ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باہر سے ایک ہلکی سی آواز سنی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "جبرائیل! یہ کیسی آواز ہے؟" انہوں نے کہا: "یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے وہاں دودھ کی نہریں تھیں جن کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوتا۔ وہاں شراب کی نہریں تھیں جو پینے والے والوں کے لیے سراپا لذت تھیں۔ وہاں صاف شہد کی نہریں تھیں۔ وہاں ڈول جتنے بڑے انار تھے۔ روایت ہے کہ وہ انار ایسے تھے کہ گویا کہ وہ کجاوے والے اونٹوں کی جلد ہوں۔ وہاں کے پرندے بختانی اونٹوں کی طرح تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: "یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! وہ پرندے تو بڑے نرم و ملائم ہوں گے۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں نے ان سے بھی زیادہ نرم اور ملائم پرندے کھائے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی ان سے کھاؤ گے۔" اسی اثناء میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رواں دواں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نہر ملاحظہ فرمائی۔ اس کے دونوں کناروں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موتی دیکھے۔ اس کی مٹی مشک اذفر کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "جبرائیل! یہ کیا ہے؟" انہوں نے عرض کی: "یہ کوثر ہے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آگ کو پیش کیا گیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا غضب، زجر اور انتقام تھا۔ اگر اس میں پتھر اور لوہا پھینک دیا جاتا تو اسے بھی ہڑپ کر جاتی۔ وہاں ایک قوم تھی جو مردار کھا رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "جبرائیل! یہ کون ہیں؟" انہوں نے کہا: "یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیلی آنکھوں والا سرخ شخص دیکھا۔ پوچھا: "جبرائیل! یہ کون ہے؟" انہوں نے کہا: "یہ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگ کے نگران فرشتے مالک کو دیکھا۔ وہ ایک ترش رو شخص تھا۔ جس کے چہرے سے غصہ عیاں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سلام کیا۔ پھر جہنم کو بند کر دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سدرۃ المنتہیٰ کی طرف اٹھایا گیا۔ وہاں خلائق اور ملائکۃ کے انوار تھے۔ یہ انوار درخت پر پڑ رہے تھے۔ اس کے ہر ہر پتے پر ایک ایک فرشتہ تھا۔ اس پر ہر رنگ کا بادل چھا رہا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبرائیل نے کہا: "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رب تسبیح بیان کر رہا

ہے۔" حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: "وہ کیا کہہ رہا ہے؟" انہوں نے کہا: "وہ کہہ رہا ہے:
"سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح سبقت رحمتی غضبی۔" پھر حضرت جبرائیل پیچھے رہ گئے۔ پھر آپ ﷺ کو سیر کرائی گی۔ حتیٰ کہ آپ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے قلموں کے چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے ایک شخص دیکھا جو نورِ عرش میں غوطہ زن تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "یہ کون ہے؟ کوئی فرشتہ ہے؟" جواب دیا گیا: "نہیں!" آپ ﷺ نے پوچھا: "نبی ہے؟" جواب دیا گیا: "نہیں!" آپ ﷺ نے پوچھا: "پھر کون ہے؟" آپ ﷺ سے عرض کی گئی: "یہ وہ شخص ہے جو ہر وقت دنیا میں ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا دل مساجد کے ساتھ معلق ہوتا تھا۔ اور جو اپنے والدین کو گالیوں کے لیے پیش نہیں کرتا تھا۔"

آپ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ کی زیارت کی۔ آپ ﷺ سجدہ ریز ہو گئے۔ اس وقت رب تعالیٰ نے آپ ﷺ سے کلام فرمایا۔ اس نے کہا: "اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) آپ ﷺ نے عرض کی: "لبیک یارب!" رب تعالیٰ نے فرمایا: "مانگو!" آپ ﷺ نے عرض کی: "مولا! تو نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنالیا۔ انہیں عظیم ملک عطا کیا ہے۔ تو نے موسیٰ سے کلام کیا ہے۔ تو نے حضرت داؤد کو عظیم سلطنت بخشی ہے۔ حضرت سلیمان کے لیے جن و انس اور شیاطین کو مسخر کیا۔ ان کے لیے ہوا مسخر کی۔ انہیں اتنی عظیم سلطنت بخشی جو کسی اور کے لیے نہ ہو گی۔ تو نے حضرت عیسیٰ کو تورات اور انجیل سکھائی۔ انہیں اس طرح بنایا کہ وہ مادر زاد کوڑھیوں اور برص کے مریضوں کو درست کر دیتے تھے۔ وہ تیرے حکم سے مردے زندہ کرتے تھے۔ انہیں اور ان کی والدہ ماجدہ کو مردود شیطان سے پناہ دی۔ اسے ان پر کوئی تسلط حاصل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں نے آپ ﷺ کو اپنا حبیب بنالیا ہے۔" (راوی کہتے ہیں: "تورات میں آپ ﷺ کا اسم گرامی حبیب مکتوب ہے) میں نے آپ ﷺ کو سارے لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا سینہ کھولا۔ آپ ﷺ سے آپ ﷺ کا بوجھ کم کیا۔ آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کا ذکر بلند کیا۔ جہاں میرا ذکر ہو گا وہاں آپ ﷺ کا ذکر ہو گا۔ میں نے آپ ﷺ کی امت کو بہترین امت بنایا ہے۔

اس کا اخراج لوگوں کے لیے کیا ہے۔ انہیں اول و آخر بنایا ہے۔ آپ ﷺ کی امت کے لیے خطبہ جائز نہیں حتیٰ کہ وہ یہ گواہی دے دیں کہ آپ ﷺ میرے بندے اور رسول ہیں۔ میں نے آپ کی امت میں سے ایسے لوگ بھی بنائے جن کے سینے ان کے انجیل ہیں۔ میں نے آپ ﷺ کو خلق کے اعتبار سے سارے انبیاء سے اول اور بعثت کے اعتبار سے آخر بنایا ہے۔ میں نے آپ ﷺ کو سات ایسی آیات بخشی ہیں جنہیں بار بار پڑھا جاتا ہے۔ میں نے آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو یہ عطا نہیں کیا۔ میں نے آپ ﷺ کو اپنے عرش کے خزانہ کے نیچے سے سورۃ البقرۃ کی آخری آیات عطا کیں۔ میں نے آپ ﷺ سے قبل کسی نبی کو یہ عطا نہیں کیں تھیں۔ میں نے آپ ﷺ کو کوثر عطا کی۔ میں نے آپ ﷺ کو اسلام، ہجرت، جہاد، صدقہ، رمضان المبارک، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عطا کیا۔ میں نے جس دن آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس دن سے آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی امت پر پچاس نمازیں فرض کیں ہیں۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت انہیں قائم کریں۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "رب تعالیٰ نے مجھے یوں فضیلت بخشی ہے۔ اس نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ اس نے مجھے سارے لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ ایک ماہ کی مسافت سے میرے دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا۔ میرے لیے مالِ غنیمت حلال کیا۔ مجھ سے قبل یہ کسی کے لیے حلال نہیں تھیں۔ ساری زمین کو میرے لیے مسجد اور پاکیزگی بنا دیا گیا ہے۔ مجھے فواتح الکلم، خواتم الکلم اور جوامع الکلم عطا کیے گئے ہیں۔ مجھ پر میری امت پیش کی گئی۔ مجھ پر تابع اور متبوع مخفی نہ رہے۔ میں نے انہیں ایسی قوم پر دیکھا جو بالوں کے جوتے پہنیں گے۔ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ ایسی قوم کے پاس آئے ہیں جن کے چہرے چوڑے ہیں آنکھیں چھوٹی ہیں گویا کہ ان کی آنکھوں میں سوئی سے شگاف کیا گیا ہے۔ مجھ پر کچھ مخفی نہ رہا جس پر وہ تھے۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ مجھے پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا۔" آپ ﷺ کو یہ تین اسمائے گرامی عطا کیے گئے: سید المرسلین، امام المتقین، قائد الغر المحجلین۔

حضرت ابن مسعود کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو پانچ نمازیں، سورۃ البقرہ

کی آخری آیات اور اس شخص کی بخشش کا مژدہ سنایا گیا جس نے شرک نہ کیا۔

پھر آپ ﷺ سے بادل چھٹ گیا۔ حضرت جبرائیل نے آپ ﷺ کا دست اقدس تھام لیا۔ آپ ﷺ جلدی سے واپس آ گئے۔ آپ ﷺ حضرت ابراہیم کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے کچھ نہ کہا۔ پھر آپ ﷺ حضرت موسیٰ کے پاس سے گزرے۔ آپ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا: ''وہ تمہارے لیے بہت اچھے صاحب تھے۔'' انہوں نے پوچھا: ''محمد عربی ﷺ! آپ ﷺ نے کیا کیا۔ آپ ﷺ کے رب تعالیٰ نے آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی امت پر کیا فرض کیا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ نے مجھ پر اور میری امت پر دن میں اور رات میں پچاس نمازیں فرض کیں۔'' انہوں نے عرض کی: اپنے رب تعالیٰ کے پاس لوٹ جائیں اور تخفیف کا سوال کریں۔ آپ ﷺ کی امت میں اتنی طاقت نہیں۔ میں آپ ﷺ سے پہلے تجربہ کر چکا ہوں۔ میں بنو اسرائیل کو آزما چکا ہوں۔ میں اس سے بھی کم فریضہ کی وجہ سے ان کی طرف سے شدت کا سامنا کر چکا ہوں۔ انہوں نے کمزوری کا اظہار کیا اور اسے ترک کر دیا۔ آپ ﷺ کی امت تو جسم، بدن، بصارت اور سماعت کے اعتبار سے کمزور ہے۔'' حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل امین کی طرف دیکھا گویا کہ مشورہ لے رہے ہوں۔ حضرت جبرائیل نے کہا: ''ضرور! اگر آپ ﷺ پسند کرتے ہیں۔ آپ ﷺ جلدی سے واپس آئے۔ درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ بادل نے آپ ﷺ کو ڈھانپ لیا اور آپ ﷺ سجدہ ریزی کرتے ہوئے گر پڑے۔

آپ ﷺ نے عرض کی: ''مولا! ہم سے تخفیف فرما۔'' دوسرے الفاظ میں ہے: ''میری امت سے تخفیف فرما۔ وہ ساری امتوں سے کمزور امت ہے۔'' اس نے فرمایا: ''میں نے پانچ نمازوں کی تخفیف کر دی ہے۔'' آپ ﷺ حضرت کلیم اللہ کے پاس آئے فرمایا: ''مجھ سے پانچ نمازوں کی تخفیف کر دی گئی ہے۔'' انہوں نے کہا: ''اپنے رب تعالیٰ کے پاس لوٹ چلیں تخفیف کا سوال کریں۔ آپ ﷺ کی امت یہ طاقت نہیں رکھتی۔'' آپ ﷺ اسی طرح اپنے رب تعالیٰ اور حضرت کلیم اللہ کے مابین آتے جاتے رہے۔ رب تعالیٰ پانچ پانچ نمازیں کم کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے فرمایا: ''محمد!'' آپ ﷺ نے عرض کی: ''لبیک و

سعدیك۔ اس نے فرمایا: ''یہ شب و روز میں پانچ نمازیں ہیں۔ ہر نماز کا اجر دس گنا ہے۔ یہ پچاس نمازیں ہیں۔ میرے ہاں قول کو تبدیل نہیں کیا جاتا۔ جس نے نیکی کا ارادہ کیا مگر اس پر عمل نہ کیا میں اس کے لیے ایک نیکی لکھ دوں گا۔ اگر اس نے اس پر عمل کیا تو میں دس نیکیاں لکھوں گا۔ جس نے برائی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کے لیے کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ اگر اس نے برائی کر دی تو اس کے لیے صرف ایک برائی لکھی جائے گی۔'' آپ ﷺ نیچے اترے۔ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام تک پہنچے انہیں بتایا۔ انہوں نے کہا: ''اپنے رب تعالیٰ کے پاس جائیں اور تخفیف کا سوال کریں۔ آپ ﷺ کی امت میں یہ طاقت نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اتنی بار تخفیف کے لیے حریم ناز میں گیا ہوں کہ اب مجھے اس مقصد کے لیے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لیکن میں راضی ہوں۔ میرا سر تسلیم خم ہے۔'' ایک صدا دینے والے نے صدا دی۔ میں نے اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ سے عرض کی: ''اللہ تعالیٰ کا نام لے کر نیچے تشریف لے آئیں۔'' آپ ﷺ فرشتوں کے جس گروہ کے پاس سے گزرتے وہ یہی کہتا: ''آپ ﷺ پچھنے لگوایا کریں۔'' دوسری روایت میں ہے: ''اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ پچھنے لگوائے۔ پھر آپ ﷺ نیچے تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل سے فرمایا: ''میں اہلِ آسمان میں سے جس کے پاس سے بھی گزرا اس نے مجھے مرحبا کہا۔ میرے لیے مسکرایا سوائے ایک ہستی کے۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے مجھے سلام کا جواب دیا۔ مجھے مرحبا کہا۔ میرے لیے دعا کی۔ لیکن وہ مسکرایا نہیں۔'' حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ''وہ مالک آگ کا نگران تھا۔ جب سے اس کی تخلیق ہوئی ہے وہ نہیں ہنسا۔ اگر وہ کسی کے لیے ہنستا تو آپ ﷺ کے لیے ضرور ہنستا۔'' جب آپ ﷺ آسمان دنیا تک پہنچے تو آپ ﷺ نے نیچے دیکھا تو آپ ﷺ کو دھواں اور غبار نظر آیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''اے جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ شیاطین ہیں جو بنو آدم کی آنکھوں کے سامنے حائل ہوتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کے ملکوت میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو وہ عجائب دیکھتے۔''

پھر آپ ﷺ سوار ہو کر واپس لوٹ آئے۔آپ ﷺ قریش کے کارواں کے پاس سے گزرے وہ فلاں جگہ تھا۔ان میں سے ایک اونٹ کے اوپر دو بورے تھے۔ایک سیاہ بورا اور دوسرا بورا سفید تھا۔جب آپ ﷺ اونٹوں کے پاس سے گزرے تو اونٹ ڈر گئے۔وہ بھاگ نکلے۔ایک اونٹ گر پڑا اور اس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔پھر آپ ﷺ ایسے کارواں کے پاس سے گزرے جس کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔آپ ﷺ نے انہیں سلام کیا ان میں سے ایک نے کہا:"یہ آواز تو محمد عربی ﷺ کی ہے۔"پھر آپ ﷺ صبح سے کچھ دیر پہلے مکہ مکرمہ میں واپس آ گئے۔وقتِ صبح آپ ﷺ پر گراں گزرا کہ لوگ آپ ﷺ کی تکذیب کریں گے آپ ﷺ غمزدہ ہو کر بیٹھ گئے۔اللہ تعالیٰ کا دشمن ابوجہل آپ ﷺ کے پاس سے گزرا وہ آ کر آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گیا۔اس نے از روئے مذاق کہا:"کیا نیا واقعہ رونما ہوا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا:"ہاں!" اس نے پوچھا:"وہ کیا؟" آپ ﷺ نے فرمایا:"مجھے آج رات سیر کرائی گئی ہے۔"ابوجہل:"کہاں تک؟" آپ ﷺ نے فرمایا:"بیت المقدس تک۔" اس نے کہا:"وقتِ صبح آپ ﷺ ہمارے سامنے آ جائیں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں!اس نے اس خدشہ سے آپ ﷺ کی تکذیب نہ کی کہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ اس کی قوم کو یہ بات نہ بتائیں جب وہ اسے بلائے۔"اس نے کہا:"آپ ﷺ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں آپ ﷺ کی قوم کو بلاؤں تو کیا آپ ﷺ اسے وہ کچھ بتانا پسند کریں گے جو کچھ مجھے بتایا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا:"ہاں!اس نے یوں صدا لگائی:"اے بنو کعب کے قبیلے!لوگ اٹھ کر اس کے پاس آنے لگے حتیٰ کہ وہ آ کر بیٹھ گئے۔ابوجہل نے کہا:"اپنی قوم کو وہی بات بتائیں جو مجھے ابھی بتائی ہے۔"حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:"مجھے آج رات سیر کرائی گئی ہے۔"لوگوں نے پوچھا:"کہاں تک؟" آپ ﷺ نے فرمایا:"بیت المقدس تک۔" انہوں نے پوچھا:"پھر آپ ﷺ صبح کے وقت ہمارے پاس آ گئے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں!" ان میں سے بعض تالیاں بجانے لگے۔بعض نے تعجب کرتے ہوئے اپنے ہاتھ اپنے سروں پر رکھ لیے۔وہ شوروغل کرنے لگے۔انہوں نے اس امر کو عجیب سمجھا۔مطعم بن عدی نے کہا:"آج سے پہلے تک آپ ﷺ کا ہر معاملہ واضح تھا لیکن آپ ﷺ کا آج کا

قول واضح نہیں ہے۔میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ جھوٹے ہیں (نعوذ باللہ منہ) ہم ایک ماہ جاتے ہوئے اور ایک ماہ وہاں سے آتے ہوئے اپنے اونٹوں کے جگر پگھلاتے ہیں۔ آپ ﷺ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ ﷺ ایک رات میں وہاں سے ہو کر آ گئے۔لات وعزیٰ کی قسم! میں آپ کی تصدیق نہیں کروں گا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مطعم سے کہا: ''تو نے اپنے محترم بھتیجے کے ساتھ کتنی بری بات کی ہے۔ان کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ان کی تکذیب کی ہے۔میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ صادق و صدیق ہیں۔'' قریش نے کہا: ''محمد مصطفیٰ ﷺ! ہمارے لیے بیت المقدس کے اوصاف بیان کریں۔اس کی عمارت اور ہیئت کیسی ہے۔وہ پہاڑ سے کتنا قریب ہے۔'' آپ ﷺ مسجد اقصیٰ کے اوصاف بیان کرنے لگے۔آپ ﷺ پر کچھ وصف ملتبس ہو گیا جس کی وجہ سے آپ ﷺ پریشان ہونے لگے کہ مسجد اقصیٰ کو آپ ﷺ کے سامنے لایا گیا۔آپ ﷺ اس کی طرف دیکھنے لگے۔اسے عقیل یا عقال کے گھر کے پاس رکھ دیا گیا۔ قریش نے پوچھا: ''اس کے کتنے دروازے ہیں۔'' آپ ﷺ نے اس کے دروازے نہیں گنے تھے۔آپ ﷺ اس مسجد کی طرف دیکھ کر ایک ایک دروازہ دیکھ کر بتانے لگے۔حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ عرض کرتے رہے: ''آپ ﷺ سچ کہتے ہیں۔آپ ﷺ سچ فرماتے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔'' قریش نے کہا: ''بخدا! آپ ﷺ نے اس مسجد کے اوصاف تو سچ بیان فرمائے ہیں۔''

پھر انہوں نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا آپ ﷺ ان کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ ایک رات میں بیت المقدس گئے اور صبح سے قبل واپس آ گئے۔'' انہوں نے کہا: ''ہاں! میں آپ ﷺ کی اس سے بھی دور کی باتوں کی تصدیق کرتا ہوں۔میں صبح و شام آپ ﷺ کے پاس آنے والی خبروں کی تصدیق کرتا ہوں۔'' اسی وجہ سے ان کا نام ابو بکر صدیق پڑ گیا۔قریش نے کہا: ''محمد مصطفیٰ ﷺ! ہمیں ہمارے کارواں کے بارے بتائیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں فلاں کارواں سے روحاء کے مقام پر ملا۔ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔وہ اس کی جستجو میں تھے۔وہاں کوئی بھی نہ تھا۔وہاں پانی کا پیالہ تھا میں نے اس میں

سے پانی پیا۔ پھر میں نے فلاں کارواں کو تنعیم کے مقام پر دیکھا۔ اس کارواں کے آگے آگے سیاہی مائل سفید اونٹ ہے۔ اس پر سیاہ ٹاٹ تھا۔ اس پر دو سیاہ بورے تھے۔ یہ کارواں ابھی ابھی ثنیہ سے تمہارے پاس آنے ہی والا ہے؟" قریش: "وہ کارواں کب آئے گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "بدھ کے روز کو۔" جب بدھ کا دن آیا تو قریش اس کارواں کا انتظار کرنے لگے۔ دن ختم ہونے والا تھا مگر ابھی تک کارواں نہیں پہنچا تھا۔ حضور ﷺ نے دعا فرمائی۔ آپ ﷺ کے لیے دن کی ایک ساعت میں اضافہ کر دیا گیا۔ سورج آپ ﷺ کے لیے روک دیا گیا۔ حتیٰ کہ کارواں آ گیا۔ رات کے وقت قریش ان کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا: "کیا تمہارا اونٹ گم ہوا تھا؟" انہوں نے کہا: "ہاں!" انہوں نے دوسرے کارواں سے پوچھا: "کیا تمہاری سرخ اونٹنی کی ہڈی ٹوٹی تھی؟" انہوں نے بھی ہاں میں جواب دیا۔ قریش نے پوچھا: "کیا تمہارے پاس پانی کا پیالہ تھا؟" ایک شخص نے کہا: "ہاں! بخدا! میں نے ہی اسے رکھا تھا۔ اس میں سے کسی نے نہیں پیا تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید اسے زمین پر انڈیل دیا گیا ہے۔" قریش نے آپ ﷺ پر جادوگر ہونے کا الزام لگایا۔ انہوں نے کہا: "ولید نے سچ کہا ہے۔" اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ (الاسراء:٦٠)

ترجمہ: "اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لیے۔"

فائدہ:

ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: "جب حضور اکرم ﷺ معراج سے واپس تشریف لائے تو آپ ﷺ سے بہت عمدہ خوشبو آنے لگی جو دلہنوں سے آنے والی خوشبو سے عمدہ تھی۔" اس شاعر پر رب تعالیٰ رحم کرے جس نے یہ اشعار لکھے ہیں:

ساد الانام محمد خیر الورٰی
بفضائل جلت عن الاحصاء

ترجمہ: "حضور اکرم ﷺ خیر الوریٰ ان فضائل کی وجہ سے سارے لوگوں کے سردار

بن گئے جو حد و شمار سے ماوراء ہیں۔"

و جوامع الکلم التی ما نالھا
احد من الفصحاء والبلغاء

ترجمہ: "اور ان جوامع الکلم کی وجہ سے سردار بن گئے جنہیں فصحاء اور بلغاء میں سے کوئی بھی حاصل نہ کرسکا۔"

و الی الخلائق کلھم ارسالہ
فشفی القلوب الجمّۃ الادواء

ترجمہ: "آپ کو ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ دلوں نے ساری مرضوں سے شفاء پائی۔"

و لہ الشفاعۃ والوسیلۃ فی غد
و مقامہ السامی علی الشفعاء

ترجمہ: "کل روزِ حشر شفاعت اور وسیلہ آپ کا ہی مقام ہے۔ آپ کا مقام سارے شفاعت کرنے والوں سے بلند ہے۔"

و یجی یومئذ کما قد قالہ
انا راکب والرسل تحت لوائی

ترجمہ: "کل روزِ حشر آپ اسی طرح آئیں گے جس طرح آپ نے فرمایا: "میں سوار ہوں گا اور رسلانِ عظام میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔"

و لقد دنا من ربہ لمّا دنا
فی لیلۃ المعراج والاسراء

ترجمہ: "جب آپ شب معراج کو قریب ہوئے تو آپ اپنے رب تعالیٰ کے بہت قریب ہو گئے۔"

سمع الخطاب بحضرۃ قدسیۃ
ما حلھا بشر من العظماء

ترجمہ: "آپ نے حریمِ ناز سے خطاب سماعت فرمایا۔ جو بڑے بڑے عظیم انسانوں کو

نصیب نہ ہوا تھا۔"

و بروٴیۃ الجبار فازو نالھا
من نعمۃ عظمت علی النعماء

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کا دیدار کر کے آپ کامیاب ہو گئے اور ایسی نعمت حاصل کر لی جو بڑی بڑی نعمتوں سے عظیم ہے۔"

مَا نَال مُوسٰی والخلیل و مجتبی
ما نلتہ یا سید الشفعاء

ترجمہ: "اے شفاعت کرنے والوں کے سردار! جو کچھ آپ نے پایا ہے اسے حضرت موسیٰ اور حضرت خلیل علیہما السلام بھی نہ پا سکے۔"

یا کنز مفتقر و ملجاء عائذٍ
یا افضل الاجواد و الکرماء

ترجمہ: "اے فقیر کے خزانہ اور پناہ طلب کرنے والے کی پناہ! اے وہ ذات والا جو سارے کریموں اور سخیوں سے افضل ہیں۔"

انت الوسیلۃ للاِلہ فسل لنا
عفوا عن الزلات والھواء

ترجمہ: "رب تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارا وسیلہ آپ ہی ہیں۔ آپ ہمارے لیے سوال کریں کہ وہ ہماری خطائیں اور لغزشیں بخش دے۔"

و دخولنا الجنات اول وھلۃ
و شفاعۃ للمفسد الخطّاء

ترجمہ: "وہ ہمیں سب سے پہلے جنت میں داخل کر دے اور فسادی اور خطا کار کے لیے شفاعت فرمائیں۔"

بك نستغیث و نستجیر و نلتجی
من ذی البلاء و فتنۃ الاھواء

ترجمہ: ''ہم آپ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں آپ سے ہی پناہ کرتے ہیں خواہشات کے فتنہ اور مصیبت میں آپ سے ہی پناہ کے طالب ہوتے ہیں۔''

و لزوم فضلاً من جنابك سیّدی
و شفاعة یا سید العشفعاء

ترجمہ: ''اے شفاعت کرنے والوں کے سردار! میں آپ کی جناب سے فضل اور شفاعت کی التجاء کرتا ہوں۔''

فالیك ساق الله سحب صلوته
و جزاك رب الناس خیر جزاء

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ آپ پر سلام اور درود کا ابر کرم بھیجے اور لوگوں کا پروردگار آپ کو عمدہ جزائے خیر دے۔''

و علی صحابك الرضی متعددا
والآل والاتباع والعلماء

ترجمہ: ''آپ کے پسندیدہ صحابہ کرام پر سلام ہو اور آپ کی اولاد پاک پر، اتباع کرنے والوں پر اور علماء پر سلام ہوں۔''

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے کیا خوب کہا ہے:

سریت الی حرم لیلاً الی حرم
کما سری البدر فی داج من الظلم

ترجمہ: ''آپ رات کے مختصر حصہ میں ایک حرم پاک سے دوسرے حرم پاک کی طرف اس طرح تشریف لے گئے جس طرح تاریک رات میں ماہِ تمام چلتا ہے۔''

و بت ترقی الی ان نلت منزلة
من قاب قوسین لم تدرك ولم ترم

ترجمہ: ''آپ مسلسل رفعت حاصل کرتے گئے حتیٰ کہ آپ نے قربِ الٰہی کی وہ منزل پالی جو نہ پائی جاسکتی ہے نہ ہی جس کا قصد کیا جاسکتا ہے۔''

و قدّمتك جميع الانبياء بها

والرسل تقديم مخدوم على خدمٖ

ترجمہ: ''سارے انبیاء کرام نے وہاں آپ کو اپنا اس طرح امام بنالیا جس طرح مخدوم اپنے خادموں کا پیشوا بنایا جاتا ہے۔''

و انت تخترق السبع الطباق بهم

فی مو کب کنت فیہ صاحب العلم

ترجمہ: ''آپ نے اس کارواں میں ساتوں آسمانوں کو چیرا جس کارواں کے علمبر دار آپ ہی تھے۔''

حتی اذا لم تدع شأوً المستبق

من الدنو ولا مرقً لمستنم

ترجمہ: ''آپ چلتے چلتے وہاں پہنچ گئے کہ آگے بڑھنے والے کے لیے کوئی درجہ نہ رہا اور اوپر جانے والے کے لیے رفعت کا کوئی مقام نہ رہا۔''

خفضت كل مقام بالاضافة اذ

نوديت بالرفع مثل المفرد العلم

ترجمہ: ''آپ نے اس وقت اپنے مقام کی وجہ سے سارے انبیاء کرام کے مقامات کو پست کر دیا جب آپ کو رفعت کے لیے مفرد علم کی طرح بلایا گیا۔''

كيما تفوز بوصل ایّ مستتر

عن العيون و سر ای مكتتم

ترجمہ: ''تا کہ آپ ایسے وصال سے شاد کام ہوں جو کسی مقرب کی آنکھ کو دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اور ایسے راز سے آگاہ ہوں جن سے کوئی عارف آگاہ نہ ہو سکا۔''

فخرت كل فخار غير مشتركٍ

و حزت كل مقام غير مزدحم

ترجمہ: ''آپ ہر قسم کی عزت کا بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔ اور ہر مقام سے

مزاحمت کے بغیر گزر گئے۔"

و جل مقدار ما ولیت من رتب
و عز مقدار ما اولیت من نعم

ترجمہ: "جو رفیع مناصب آپ کو دیے گئے ان کی منزلت بہت بڑی ہے۔ جو نعمتیں آپ کو عطا کی گئی ہیں وہ بہت عظیم ہیں۔"

بشری لنا معشر الاسلام ان لنا
من العنایة رکنا غیر منهدم

ترجمہ: "اے گروہِ اسلام! ہمارے لیے بشارت! عنایت ربانی سے آپ ہمارے لیے ایسا ستون ہیں جو کبھی نہیں گر سکتا۔"

لمّا دعا الله داعینا لطاعته
یا اکرم الرسل کنا اکرم الامم

ترجمہ: "جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "یا اکرم الرسل" کہہ کر مخاطب کیا تو ہم معزز امت بن گئے۔"

❀❀❀❀

معراج کے بارے کچھ تنبیہات

1. ابن المنیر نے لکھا ہے کہ یہ حضور اکرم ﷺ کی عزت و اکرام ہے کہ آپ ﷺ کو فوراً سیر کے لیے بلایا گیا۔ جیسے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسی اثناء میں کہ میں سویا ہوا تھا۔'' جبکہ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کے لیے ایک مدت مقررہ کی گئی۔ انہیں اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا۔ آپ ﷺ سے انتظار کی اذیت کو ختم کر دیا گیا۔ اس سے یہی علم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ مقام مرید پر اور حضور اکرم ﷺ مقام مراد پر فائز تھے۔

2. ابن دحیہ نے آپ ﷺ کے فرمان ''میرے گھر کی چھت کو چیرا گیا'' کے زمرہ میں لکھا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام دروازہ سے کیوں داخل نہ ہوئے۔ حالانکہ ارشادِ ربانی ہے:

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (البقرۃ:۱۸۹)

اس میں حکمت یہ ہے تاکہ مناجات میں مبالغہ ہو۔ یہ اس امر پر تنبیہ تھی کہ یہ کرامات اور عزت وعدہ کے بغیر تھی۔ شاید یہ آپ ﷺ کے شق صدر کی طرف اشارہ ہو۔ یہ اس کی تمہید ہو۔ فرشتے نے چھت میں سوراخ کر کے آپ ﷺ کو دکھایا ہو۔ چھت فوراً مل گیا ہو۔ اس طرح فرشتے نے آپ ﷺ کو وہ کیفیت دکھائی ہو جو آپ ﷺ کے ساتھ ہونا تھا۔ آپ ﷺ کے حق میں لطف اور بصارت کے عیاں کرنے کے لیے آپ ﷺ کے گھر میں اس کا مشاہدہ آپ ﷺ کو کرا دیا ہو۔ اگر فرشتہ حسبِ معمول دروازے سے آتا۔ وہ پہلے صحن میں آتا پھر اس کمرہ میں جاتا۔ جس میں آپ جلوہ افروز تھے۔ حافظ نے لکھا ہے: ''فرشتہ کے چھت سے نیچے آنے میں شاید یہ حکمت ہے کہ اس طرح فرشتہ اچانک آپ ﷺ کے پاس آجائے۔ نیز اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ یہ سفر بلندی کی طرف ہوگا۔

3. وہ دو افراد جن کے مابین حضور ﷺ لیٹے ہوئے تھے وہ حضرت حمزہ اور حضرت جعفر

رضی اللہ عنہما تھے۔ ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع اور حسنِ خلق ہی تھا۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری مخلوق سے افضل ہیں اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے ساتھ لیٹ جاتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ اپنے نفس کے لیے کسی فضیلت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ ایک گروہ کو ایک جگہ سو جانا چاہیے لیکن شرط یہ ہے ہر ایک کے پاس اتنا کپڑا ہو جس سے وہ اپنے ساتھی سے اپنے جسم کو ڈھانپ سکے۔

◆ ۴ شق صدر، خاتم النبوۃ، طشت، سونے اور آبِ زمزم کے بارے پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔

◆ ۵ جبرائیل کے بارے گفتگو۔ اس میں کئی فوائد ہیں:

◇ ۱ اس اسم کے بارے۔ اس اسم میں کئی لغات ہیں۔ یہ کل لغات ۲۱ ہیں: (۱) جِبریل (۲) جَبریل (۳) جَبرءِل (۴) جَبرَئیل (۵) جَبرائیل (۶) جبرائِیل (۷) جَبرائِل (۸) جبرایل (۹) جبرییل (۱۰) جبرَئِیل (۱۱) جبرءِلَّ (۱۲) جَبرَئِیل (۱۳) جبرال (۱۴) جبرال (۱۵) جَبرال (۱۶) جَبرین (۱۷) جَبرین (۱۸) جبرئین (۱۹) جِبرین (۲۰) جَبرائیل (۲۱) جبراییل

◇ ۲ الروض الانف میں ہے ''جبرائیل کا معنی عبدالرحمان یا عبدالعزیز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مرفوعاً روایت مروی ہے۔ موقوف روایت زیادہ صحیح ہے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس اسم کا آخری لفظ ''ایل'' عجمی ہے۔ حضرت ابن عربی علیہ الرحمۃ کا مؤقف یہ ہے کہ ان اسماء میں اضافہ مغلوبہ ہے۔ عجمیوں کے کلام میں کہا جاتا ہے غلام زید، زید غلام۔ اس اعتبار سے ایل کا معنی عبد ہوگا۔ اس اسم کا پہلا حصہ رب تعالیٰ کے اسماء میں سے ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرائیل کا نام عبداللہ اور میکائیل کا نام عبیداللہ ہے۔ ہر وہ چیز جو ''ایل'' کی طرف راجع ہو وہ رب تعالیٰ کی بندگی کرنے والی ہوتی ہے۔ علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے یہ اضافہ کیا ہے ''اسرافیل کا معنی عبدالرحمان ہے''۔ عکرمہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ایل کا معنی اللہ تعالیٰ ہے۔ علامہ ماوردی نے لکھا ہے ''اس روایت میں کسی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی

مخالفت نہیں کی۔" امام سہیلی نے لکھا ہے کہ یہ اکثر کا قول ہے۔ امام شہاب الدین حلبی نے لکھا ہے۔ "اس اسم کے بارے علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مشتق ہے یا نہیں۔" جمہور کا مؤقف یہ ہے کہ یہ مشتق نہیں ہے کیونکہ عجمی اسماء کا اشتقاق نہیں ہوتا۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ جبروت اللہ سے مشتق ہے۔ اسی طرح اس میں یہ اختلاف بھی ہے کہ یہ اسم بسیط ہے یا مرکب ہے؟ کیونکہ جبر کا معنی ہے عبد اور ایل اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ اسرافیل کے بارے بھی اسی طرح کہا گیا ہے۔ پھر اس کی ترکیب میں اختلاف ہے کہ کیا مرکب اضافی ہے یا مرکب مزجی ہے۔ بعض نے پہلا مؤقف اختیار کیا ہے۔ پہلا مؤقف رد کر دیا گیا ہے کیونکہ اس طرح چاہیے کہ انہیں مضاف اور مضاف الیہ کا اعراب دیا جاتا۔ پہلے اسم کو محل کے مطابق اعراب دیا جاتا، جبکہ دوسرے اسم کو تنوین اور جر دی جاتی۔ کیونکہ یہ غیر منصرف نہیں ہے۔ جیسے کہ اس فرمان میں "ال" ہے یہ اس شخص کے نزدیک ہے جس نے اسے رب تعالیٰ کا اسم بنایا ہے۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ (التوبۃ:۱۰)

ترجمہ: "وہ نہیں لحاظ کرتے کسی مومن کے حق میں کسی رشتے داری کا اور نہ کسی وعدے کا۔"

یہ ایسے ہوگا جیسے تم کہو: جاء عبداللہ، رائیت عبداللہ، مررت بعبداللہ۔ بعض علماء مثلاً ابو عباس مہدوی نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ یہ مرکب مزجی ہے جیسے بعلبک، حضر موت۔ یہ مؤقف درست لگتا ہے لیکن بعض نے اس کا رد اس طرح کیا ہے کہ اس طرح لازمی تھا کہ پہلا حصہ مبنی بر فتحہ ہوتا۔ لیکن بعض اہلِ لغت اسے کسرۃ دیتے ہیں۔ بعض نے یہ رد اس طرح کیا ہے کہ اگر یہ مرکب مزجی ہوتا تو یہ روا تھا کہ اسے مضاف اور مضاف الیہ کا اعراب دیا جاتا۔ یا اسے مبنی بر فتحہ رکھا جاتا جیسے احد عشر، یہ مرکب مزجی ہے۔ اس میں یہ وجوہات جائز ہیں۔ اس کے بارے نہ تو یہ سنا گیا ہے کہ یہ مبنی ہے نہ ہی اسے مضاف اور مضاف جیسا اعراب دیا جاتا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرکب مزجی نہیں ہے۔ لیکن یہ رد بھی مردود ہے۔ کیونکہ یہ دونوں جواز میں سے ایک پر آتا ہے۔ اور اتفاق ہے کہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔"

امام سہیلی نے لکھا ہے ”حضرت جبریل علیہ السلام کے اسم میں اتفاق ہے کہ یہ جہت عربی کے موافق ہے۔ اگرچہ یہ عجمی ہے۔ جبر کا معنی اس چیز کی اصلاح کرنا ہے جو فاسد ہوگئی ہو۔ حضرت جبرائیل وحی پر موکّل ہیں۔ وحی میں اس چیز کی اصلاح ہوتی ہے جو خراب ہو جائے۔ یہ اسم مبارک مکہ مکرمہ اور عرب میں معروف نہیں تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو بتایا تو وہ عداس، نسطورا اور ورقہ سے اس کے بارے پوچھنے گئیں۔ انہوں نے کہا: ”قدوس قدوس! ان شہروں میں حضرت جبرائیل کا تذکرہ کیوں کیا جاتا ہے۔“

۞ ۳ حضرت جبرائیل کے بعض فضائل۔ رب تعالیٰ نے قرآن پاک میں ۳۵ مقامات پر اِن کا تذکرہ صراحت وغیرہا کے ساتھ کیا ہے۔ تین مقامات پر رب تعالیٰ نے ان کا نام علَم کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ دو بار سورۃ البقرہ میں ذکر فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ۔ (البقرۃ:۹۷)

ترجمہ: ”آپ فرمائیے جو دشمن ہو جبرئیل کا۔“

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ۔ (البقرۃ:۹۸)

ترجمہ: ”جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل کا۔“

سورۃ التحریم میں ہے:

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ۔ (التحریم:۴)

ترجمہ: ”اور اگر تم نے ایکا کر لیا آپ کے مقابلہ میں تو اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار ہے اور جبریل۔“

چار مقامات پر از روئے تعظیم جمع کے صیغے کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا۔ جیسے کہ آلِ عمران میں فرمایا:

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ (آلِ عمران:۳۹)

ترجمہ: ”پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اپنی عبادت گاہ میں۔“

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ۔ (آلِ عمران:۴۲)

ترجمہ: ''اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم بیشک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں۔''

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (آلِ عمران:۴۵)

ترجمہ: ''جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے۔''

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ أَمْرِهٖ۔

یعنی جبرائیل امین اور روح سے مراد وحی ہے۔ آٹھ مقامات پر لفظ روح کے ساتھ تذکرہ کیا ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ إِلَيْهِ۔ (المعارج:۴)

ترجمہ: ''عروج کرتے ہیں فرشتے اور جبریل اللہ کی بارگاہ میں۔''

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا۔ (القدر:۴)

ترجمہ: ''اترتے ہیں فرشتے اور روح القدس اس میں۔''

فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوْحَنَا۔ (مریم:۱۷)

ترجمہ: ''پھر ہم نے بھیجا اس کی طرف اپنے جبرئیل کو۔''

وَأَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط (البقرۃ:۸۷)

ترجمہ: ''اور ہم نے انہیں تقویت دی جبرئیل سے۔''

إِذْ أَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (المائدۃ:۹)

ترجمہ: ''جب میں نے تمہاری روح القدس کے ذریعے مدد کی۔''

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (النحل:۱۰۲)

ترجمہ: ''فرمایئے نازل کیا ہے اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ۔''

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

(الشعراء:۱۹۳،۱۹۴)

ترجمہ: ''اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبرائیل)۔''

رب تعالیٰ نے انہیں ایک مقام میں سات خوبصورت صفات کے ساتھ یاد فرمایا۔ وہ صفات

یہ ہیں۔رسالت، کرم، قوت، مکانہ، قربۃ، طاعۃ الملائکۃ اور امانت۔سورۃ التکویر میں فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾

(التکویر:۱۹ تا ۲۱)

ترجمہ:"یہ (قرآن) معزز قاصد کا (لایا ہوا) قول ہے، جو قوت والا ہے، مالک عرش کے ہاں عزت والا ہے (سب فرشتوں کا) سردار اور وہاں کا امین ہے۔"

ابوالشیخ نے "العظمۃ" میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"مخلوق میں سے رب تعالیٰ کے قریب حضرات جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل ہیں۔وہ رب تعالیٰ سے ایک ہزار سال کی مسافت سے دور ہیں۔" ابوالشیخ نے حضرت وہب سے روایت کیا ہے۔انہوں نے کہا:"یہ چار فرشتے ہیں۔حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت مالک الموت، رب تعالیٰ نے انہیں سب سے پہلے تخلیق کیا اور سب سے آخر میں ان پر موت طاری کرے گا۔سب سے پہلے انہیں زندہ کرے گا۔یہ منتظمین ہیں۔خالد بن ابی عمران سے روایت ہے۔انہوں نے کہا:"حضرت جبرائیل اللہ تعالیٰ کے رسلانِ عظام کی طرف سے اس کے امین ہیں۔حضرت میکائیل لوگوں کے وہ اعمال حاصل کرتے ہیں جو بلند ہوتے ہیں۔حضرت اسرافیل نگران کی طرح ہیں۔"

ابوالشیخ نے عکرمہ بن خالد سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عرض کی:"یارسول اللہ! رب تعالیٰ کی مخلوق میں سے اس کے ہاں معزز کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"مجھے علم نہیں۔" حضرت جبرائیل امین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"جبرائیل! اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے اس کے ہاں سب سے زیادہ معزز کون ہے؟" انہوں نے کہا:"میں نہیں جانتا۔" حضرت جبرائیل اوپر گئے۔پھر نیچے آئے۔اور عرض کی:"جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور فرشتۂ اجل۔" حضرت جبرائیل انبیاء پر وحی لانے اور جنگ میں ان کی مدد کرنے پر مؤکل ہیں۔حضرت میکائیل ہر اس قطرہ پر یا پتے پر نگران ہیں جو نیچے

کرتا ہے۔فرشتۂ اجل تری اور خشکی میں ہر بندے کی روح قبض کرنے پر مؤکل ہیں۔
اسرافیل رب تعالیٰ کے امین ہیں۔

- ۶ میکائیل میں درج ذیل لغات ہیں: (۱) میکال (۲) مکائیل (۳) میکائیل (۴) میکئیل (۵) میکئل (۶) میکائییل (۷) میکاءیل۔

- ۷ براق، البریق سے مشتق ہے۔اس کے رنگ کے بارے روایت ہے کہ وہ سفید ہے۔ یا یہ البرق سے مشتق ہے۔تیز رفتاری کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ یا یہ شاۃ برقاء سے مشتق ہے۔ایسی بکری مراد ہے جس کی سفید اون میں کالے بال ہوں۔حدیث پاک میں اس کا جو وصف اس کی سفیدی سے بیان کیا گیا ہے وہ اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ ایسی بکری سفید بکریوں میں ہی شمار کی جاتی ہے۔امام احمد اور حارث نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ابرقوا فانّ دم عفراء ازکی عند اللہ من دم سودوین" اس حدیث پاک میں سفید بکری کو دو سیاہ بکریوں کے مقابلہ میں رکھا گیا جس سے سفید رنگ کی فضیلت عیاں ہوتی ہے۔اس اعتبار سے براق کی رنگت سارے رنگوں سے افضل ہوگی۔ یہ بھی روا ہے کہ دونوں معانی کو اکٹھا کیا جائے۔اس کی رنگت اور تیز رفتاری کی وجہ سے اسے براق کہا جاتا ہو۔اس صورت میں اس کا اعتبار ایسے مجمل الفاظ میں ہوگا جو بیک وقت دو معانی کا احتمال رکھتا ہو۔یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مشتق نہ ہو۔"

ابن ابی جمرہ نے لکھا ہے کہ براق پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوار ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت ہے کیونکہ کسی سے یہ نقل نہیں کہ وہ کسی ایسے جانور کا مالک بنا ہو جو اس کی جنس کے خلاف ہو۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ طاقت بھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم براق کے بغیر اوپر تشریف لے جاتے۔لیکن براق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و رفعت کی بشارت تھی۔کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اوپر چڑھ جاتے تو یہ چلنے والے کی شکل میں ہوتا۔ سوار پیدل چلنے والے کے برعکس ہوتا ہے۔

ابن دحیۃ نے لکھا ہے" کبھی کبھی خرق عادت اور عادت کو ساتھ ملا دیا جاتا ہے تا کہ انس

حاصل ہو۔'' حق تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ وہ حضور اکرم ﷺ کو براق کے بغیر سیر کرائے۔لیکن سواری کرانا آپ ﷺ کے عظیم مقام کے پیشِ نظر تھا۔ براق پر آپ ﷺ کو سیر کرانا آپ ﷺ کی عزت و کرامت کے اظہار کے لیے تھا۔جب عظیم شہنشاہ اپنے کسی خاص دوست کو اپنے ہاں بلاتا ہے تو اس کے لیے خصوصی سواری بھیجتا ہے جو اسے اٹھا کر اس کے پاس لے آتی ہے۔براق کی شکل گھوڑے سے نہیں بلکہ خچر سے ملتی تھی تا کہ یہ اشارہ ملے کہ یہ سواری حالت امن میں ہے۔جنگ اور خوف کی حالت نہیں ہے۔یا اس کی تیز رفتاری سے اس معجزہ کا اظہار تھا کہ یہ تیز رفتار جانور اس جانور کے مشابہ ہے جو عموماً تیز رفتار نہیں ہوتا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضور اکرم ﷺ جنگ میں خچر پر سوار ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت کی تحقیق کے لیے تھا کہ آپ ﷺ شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے مقام پر ایسے جانور پر سوار ہوتے ہیں جو سریع رفتار نہیں۔ یہ دشمن کی شکست کی طرف اشارہ تھا۔کیونکہ رب تعالیٰ نے آپ کو شجاعت اور قوت عطا کی تھی۔کیونکہ عام طور پر امن اور سکون کے مقام پر خچر پر سوار ہوا جاتا ہے۔اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ جنگ آپ ﷺ کے نزدیک حالت امن کی طرح تھی۔آپ ﷺ قوت قلب، شجاعت نفس، توکل اور اعتماد کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔فرشتوں نے جنگ کی حالت میں گھوڑوں پر سواری کی۔ کیونکہ عرف میں اس حالت میں عمومی طور پر گھوڑوں پر ہی سواری کی جاتی ہے۔براق کی شکل خچر کی شکل سے لطیف تھی۔ایسی سواری یقیناً خچر سے بہت عمدہ اور اچھی ہوگی۔وہ پھولے ہوئے جسم سے اچھی ہوگی۔لیکن گھوڑے کی کیفیت اس کے برعکس ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی اس سیر کو طیران (پرواز) نہیں کہا بلکہ سیر ہی کہا ہے۔کیونکہ عرب رات کو چلنے کو سُریٰ کہتے ہیں۔اس سے یہی آشکارہ ہوتا ہے کہ جب کسی ولی کامل کے لیے بعید مسافت کو سمیٹ دیا جائے تو اس پر مسافر کے لفظ کا ہی اطلاق ہوگا۔ اور اس پر مسافر کے احکام ہی لاگو ہوں گے۔رب تعالیٰ نے واپسی کے سفر میں براق

ذکر نہیں کیا کیونکہ اوپر چڑھتے وقت اس کا تذکرہ کر دیا تھا۔ جیسے کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ۔ (النحل:۸۱)

ترجمہ: ''اور تخلیق کیا تمہارے لیے وہ لباس جو تمہیں گرمی سے بچاتا ہے۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لباس سردی سے بھی بچاتا ہے۔

فتح الصفا میں ہے: ''یہ سیر فرشتوں کے پروں پر یا ہوا کے دوش پر کیوں نہ ہوئی جیسے ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت اٹھا کر لے جاتی تھی؟ یا ایک قدم میں فاصلہ سمیٹ کیوں نہ دیا گیا جیسے طئی زمان ہوتا ہے؟ میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں تا کہ آپ ﷺ خلافِ عادت نشانیوں سے آگاہ ہو سکیں اور عجیب امر سے آگاہ ہو سکیں۔ اگر ملائکہ اٹھا کر لے جاتے یا یہ مسافت ہوا کے ذریعہ طے کی جاتی تو اس میں زیادہ تعجب نہ ہوتا۔ اتنی عظیم براق پر سفر کرنے میں تعجب ہے۔ اس میں فرشتوں کی ایسی تعظیم منقول ہے جو ان کے پروں پر اٹھانے سے زیادہ ہے۔ حضرت جبرائیل امین نے آپ ﷺ کی رکاب تھام رکھی تھی۔ حضرت میکائیل نے لگام پکڑ رکھی تھی۔ ان کا تعلق اکابر فرشتوں سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ براق پر سوار تھے۔ یہ شرف بہت زیادہ ہے۔

براق کی صورت کیسی تھی اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس سے اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ صاحب الاحتفال نے لکھا ہے کہ خچر سے کم اور گدھے سے بڑا تھا۔ اس کا چہرہ انسان کے چہرے کی طرح تھا۔ اس کا جسم گھوڑے کے جسم کی طرح تھا۔ اس کے پائے بیل کے پاؤں کی طرح تھے۔ اس کی دم ہرن کی دم کی طرح تھی۔ ایک اور شخص نے لکھا ہے ''اس کا جسم انسان کے جسم کی طرح تھا۔ اس کی دم اونٹ کی دم کی طرح تھی۔ اس کے بال گھوڑے کے بالوں کی طرح تھے۔ اس کے پاؤں اونٹ کے پاؤں کی طرح تھے۔ اس کے سم گائے کے سم کی طرح تھے۔ اس کا سینہ سرخ یاقوت کی طرح تھا۔ اس کی کمر سفید موتی کی طرح تھی۔ اس کی رانوں کے پاس دو پر تھے۔'' لیکن یہ سارا حلیہ صحیح نہیں ہے۔ پروں کے رانوں میں ہونے میں راز یہ ہے کہ سواری کا پچھلا حصہ بوجھل ہو سکے۔ یا اسے خرقِ عادت امر پر محمول کیا جا سکے۔ یا اس

لیے کہ اس سے سوار کو سہولت میسر آسکے۔ کیونکہ اگر یہ پر پہلوؤں میں ہوتے تو یہ سوار کی رانوں کے نیچے یا اس کے اوپر ہوتے۔ جب یہ سکیڑتی یا پھیلاتی تو اس سے سوار کو تکلیف ہوتی۔

بعض روایت میں ہے کہ یہ نہ مذکر تھی نہ ہی مونث تھی۔ اس کا تقاضا ہے کہ یہ خلقت میں منفرد ہو۔ اور یہ تولید کے بغیر ہی پیدا ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ۔ (الذاریات:۴۹)

ترجمہ: ''اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے۔''

شیخ سعدالدین نے لکھا ہے کہ معزز فرشتے نہ مذکر ہیں نہ ہی مؤنث ہیں۔ ایک اور اثر میں ہے کہ حضرت جبرائیل اسے مؤنث کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔ براق پر لرزہ کیوں طاری ہوا؟ اس کی حکمت میں اختلاف ہے۔ ابن بطال نے لکھا ہے کہ کیوں کہ انبیاء کو اس پر سواری کیے کافی مدت گزر چکی تھی۔ اس لیے وہ اچھلنے لگا۔

المبتداء میں ابن اسحاق نے اسی طرح لکھا ہے: ''براق اچھلنے لگا۔ مجھ سے پہلے انبیاء اس پر سواری کرتے تھے۔'' انبیاء کی سواری کو کافی مدت گزر چکی تھی۔ فترت کے زمانہ میں اس پر کوئی سوار نہ ہوا تھا۔

ابن دحیہ اور ابن منیر نے لکھا ہے کہ براق خوشی سے جھوما تھا کہ اس پر حضور نبی اکرم ﷺ تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ حضرت جبرائیل نے اسے زبان حال سے یوں فرمایا تھا۔ ان کا مقصد یہ نہ تھا۔ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی وجہ سے جھوما تھا۔ اس وجہ سے اس کو پسینہ آگیا تھا۔ گویا کہ اس نے زبانِ حال سے یہ جواب دیا تھا۔ اس نے اچھلنے سے برأت کا اظہار کیا تھا۔ عتاب کی ندامت سے اسے پسینہ آگیا تھا۔ یہ اس پہاڑ کے لرزہ کے قریب ہے جسے آپ نے فرمایا تھا: ''ٹھہر جا۔ تجھ پر ایک نبی ایک صدیق اور ایک شہید سوار ہے۔'' یہ خوشی سے جھومنا تھا۔ غصہ سے اچھلنا نہیں تھا۔ شیخ قاسم بن قطلو بغا حنفی نے لکھا ہے کہ ''یہ بعید نہیں کہ یوں کہا جائے کہ وہ جانور ہمارے نبی کریم ﷺ کی ہیبت کی وجہ سے کانپا ہو۔''

۸ حافظ نے لکھا ہے کہ عجیب وغریب حکایات میں سے یہ بھی ہے کہ جب حضرت جبرائیل نے براق کو عتاب کیا تو براق نے ان کے سامنے عذر پیش کیا کہ آپ ﷺ نے آج صفراء کو مس کیا تھا۔ صفراء سے مراد وہ بت ہے جو خانہ کعبہ کے پاس نصب تھا۔ حضور اکرم اس کے پاس سے گزرے تو فرمایا ''اس کے لیے ہلاکت ہے جو تیری پوجا کرے۔'' آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کو منع فرما دیا تھا کہ وہ اسے مس نہ کریں۔ فتح مکہ کے روز اسے توڑ دیا گیا تھا۔ ''الزھر'' میں ہے اس روایت کا تذکرہ کرنا بھی درست نہیں ہے۔ اسے حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنا بھی درست نہیں ہے حضرت امام احمد کے فرزند حضرت عبداللہ نے روایت کیا ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ انہوں نے اس کا شدت سے انکار کیا ہے۔

۹ عجیب وغریب روایات میں سے وہ روایت بھی ہے جسے ماوردی، ثعلبی اور قرطبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ موت اور حیات دو جسم ہیں۔ موت کی بو جو بھی سونگھتا ہے وہ مر جاتا ہے۔ حیات سیاہ وسفید داغوں والی گھوڑی کی مانند ہے۔ حضرت جبرائیل امین اور دیگر انبیاء اسی پر سوار ہوتے تھے۔ یہ کسی چیز کے پاس سے نہیں گزرتی نہ ہی کوئی چیز اس کی بو سونگھتی ہے مگر اسے زندگی نصیب ہو جاتی ہے۔

۱۰ اس میں اختلاف ہے کہ کیا حضرت جبرائیل امین حضور اکرم ﷺ کے ساتھ براق پر سوار ہوئے تھے یا نہیں۔ اگر سوار ہوئے تھے تو حضور اکرم ﷺ کے آگے یا پیچھے سوار ہوئے تھے۔ امام احمد نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے پاس براق لایا گیا۔ حضور اکرم ﷺ اور حضرت جبرائیل امین اس پر سوار ہی رہے حتیٰ کہ بیت المقدس پہنچ گئے۔ ابن حبان نے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرائیل امین نے آپ ﷺ کو اپنے آگے سوار کر لیا اور وہ انہیں لے کر چلے۔ ابو یعلیٰ کی روایت میں ہے کہ حضرت جبرائیل براق لے کر آئے اور حضور اکرم ﷺ کو اپنے آگے سوار کر لیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس براق لایا گیا۔ میں حضرت جبرائیل امین کے پیچھے بیٹھ گیا۔ صحیح موقف یہ ہے کہ یہ براق

حضور کریم ﷺ سے قبل انبیائے کرام علیہم السلام کی سواری کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ امام فاکہی نے حسن سند کے ساتھ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام براق پر سوار ہو کر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل رضی اللہ عنہما کی ملاقات کے لیے آتے تھے۔" حضرت ابوسعید کی روایت میں ہے: "مجھ سے قبل انبیائے کرام علیہم السلام اس پر سواری کرتے تھے۔" حضرت انس سے روایت ہے "مجھ سے پہلے انبیائے کرام کے لیے اسے مسخر کر دیا گیا تھا۔" حضرت سعید بن مسیب اور ابوسلمہ عبدالرحمان سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کو براق پر سیر کرائی گئی۔ یہ حضرت ابراہیم کی سواری تھی۔ جس پر سوار ہو کر وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔

⓫ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بچپن میں چار بچوں نے گفتگو کی۔ ابن ماشطہ، حضرت یوسف علیہ السلام کا گواہ، جریج کا صاحب اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ "پنگھوڑے میں صرف تین بچوں نے گفتگو کی ہے۔" امام مسلم نے اصحاب اخدود کی داستان میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت کو آگ میں پھینکنے کے لیے لایا گیا تاکہ وہ رب تعالیٰ کا انکار کر دے۔ اس کے پاس ایک شیر خوار بچہ تھا۔ وہ عورت تھوڑی سی پیچھے ہٹی۔ اس بچے نے کہا: "امی جان! صبر کریں۔ آپ حق پر ہیں۔" ابن قطیبہ نے اس بچے کی عمر سات ماہ لکھی ہے۔ ثعلبی نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے پنگھوڑے میں گفتگو کی تھی۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے پنگھوڑے میں گفتگو کی تھی۔ امام واقدی کی سیر میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ولادت کے ابتدائی ایام میں گفتگو کی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے عہد ہمایوں میں مبارک الیمامہ نے گفتگو کی تھی۔ جب یہ علم ہو گیا تو پھر آپ ﷺ کے فرمان کے بارے کہا جائے گا کہ یہ اس وقت کا ہے جب آپ ﷺ کو زیادہ افراد کا علم نہیں ہوا تھا۔

⓬ روایات میں ہے کہ آپ ﷺ براق سے نیچے تشریف لائے اور متعدد مقامات پر نماز ادا کی۔ جبکہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ براق پر ہی رہے

حتیٰ کہ آپ ﷺ بیت المقدس پہنچ گئے۔ حافظ نے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا۔ ممکن ہے انہوں نے اپنے اجتہاد سے کہا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس مؤقف کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے براق باندھنے اور بیت المقدس میں نماز پڑھنے کا انکار کیا ہے حالانکہ صحیح احادیث میں صحابہ کرام کی ایک جماعت سے یہ امور منقول ہیں۔

- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے براق باندھنے کا انکار کیا ہے۔ امام ترمذی اور امام احمد نے روایت کیا ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ براق باندھی گئی تو انہوں نے فرمایا: ''کیا یہ خدشہ تھا کہ براق بھاگ جائے گا۔ حالانکہ آپ ﷺ کے لیے عالم الغیب والشہادۃ مسخر کر دیا گیا تھا۔'' امام بیہقی اور امام سہیلی نے لکھا ہے ''مثبت نافی پر مقدم ہوتا ہے۔ یعنی جس نے بیت المقدس میں براق باندھنے کا مؤقف اختیار کیا ہے اس کے پاس اس سے زیادہ علم ہے جس نے اس کی نفی کی ہے۔ اسے قبول کرنا اولیٰ ہے۔'' امام نووی نے لکھا ہے ''براق باندھنے میں امور میں احتیاط سے کام لینے اور اسباب ترک نہ کرنے پر عمل کیا گیا تھا۔ اس طرح توکل پر زد نہیں پڑتی جبکہ اعتماد رب تعالیٰ کی ذات پر ہو۔'' امام سہیلی نے لکھا ہے ''اس میں توکل کی صحت کے ساتھ ساتھ احتیاط کو لازم پکڑنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔ نیز یہ کہ تقدیر پر ایمان کامل ہو۔'' جیسے کہ ابن منبہ سے روایت ہے جو ہلاکتوں سے بچا اس نے احتیاط کا دامن نہ چھوڑا۔ انہوں نے کہا: ''میں نے اللہ تعالیٰ کی سابقہ ستر کتب میں پڑھا ہے۔ یہ آپ ﷺ کے اس فرمان کی طرح ہے ''پہلے سواری کو باندھو پھر توکل کرو۔'' آپ ﷺ کو یقین تھا کہ آپ ﷺ کے لیے کائنات مسخر کر دی گئی ہے۔ آپ ﷺ کو تقدیرِ الٰہی پر بھی ایمان تھا۔ آپ ﷺ کو یہ بھی یقین تھا کہ جو کچھ ہونا ہے وہ کتاب میں لکھا جا چکا ہے۔ پھر بھی آپ ﷺ نے سفروں میں زادِ راہ لیا۔ جنگوں میں ہتھیار استعمال کیے۔ غزوۂ احد میں دو زرہیں پہنیں۔ براق باندھنے کا تعلق بھی اسی باب سے ہے۔

۱۴ بیت المقدس کے فضائل

۱ اس کی تعمیر کے بارے

ابوبکر واسطی نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''زمین پر پانی تھا۔ رب تعالیٰ نے ہوا بھیجی جس نے پانی کو چھوا۔ سطح زمین پر جھاگ نمودار ہوئی۔ رب تعالیٰ نے اسے چار حصوں میں منقسم کیا۔ ایک حصہ سے مکہ مکرمہ، دوسرے سے مدینہ طیبہ، تیسرے سے بیت المقدس اور چوتھے حصے سے کوفہ کو بنایا۔''

امام احمد، امام نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس تعمیر کیا تو اس کے درمیان میں تین دعائیں مانگیں۔ رب تعالیٰ نے انہیں یہ عطا فرمادیں۔ یہ دعا مانگی کہ ان کا فیصلہ اس کے فیصلہ کے موافق ہو جائے۔'' رب تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ انہوں نے یہ التجا کی کہ وہ انہیں ایسی مملکت عطا کرے جو ان کے بعد کسی کو نصیب نہ ہو۔ رب تعالیٰ نے یہ التجاء بھی قبول کر لی۔ انہوں نے التجاء کی کہ جو شخص بھی بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نیت سے اس کی طرف سفر کرے وہ گناہوں سے اس طرح پاک صاف ہو جائے گویا ابھی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہم امید کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ان کی یہ التجاء قبول کر لی ہوگی۔''

ابن ابی شیبہ اور واسطی نے حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بیت المقدس سارے آسمانوں تک اور اسی کی مقدار زمین تک مقدس ہے۔ واسطی نے حضرت عطاء خراسانی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''جب حضرت سلیمان بیت المقدس کو بنانے سے فارغ ہوئے رب تعالیٰ نے ''باب الرحمۃ'' کے نزدیک دو درخت اگائے۔ ایک سے سونا اور دوسرے سے چاندی اگی۔ ان میں سے ہر ایک سے ہر روز ایک رطل سونا اور ایک رطل چاندی اٹھائی جاتی تھی۔ مسجد میں فرش لگایا گیا۔ ایک ٹائل سونے کی اور دوسری ٹائل چاندی کی لگائی گئی۔ جب بخت نصر آیا تو اس نے بیت المقدس کو گرادیا۔ سونے اور چاندی کی اسی

ٹائلیں اٹھا کر لے گیا۔ انہیں بحیرہ روم میں پھینک دیا۔

واسطی نے حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہوں نے بنو اسرائیل کے دس ہزار قاری مختص کیے۔ پانچ ہزار دن کے وقت پانچ ہزار رات کے وقت عبادت کرتے تھے۔ شب و روز کی ہر ساعت میں اس میں عبادت ہوتی تھی۔ واسطی نے حضرت کعب الاحبار سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام مسجد اقصیٰ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ ریز ہو گئے۔ انہوں نے یہ دعا مانگی: ''مولا! جو اس میں ڈرتا ہوا داخل ہوا اسے امن عطا فرما۔ جو اس میں دعا کرے اس کی دعا کو قبول فرما۔ جو مغفرت طلب کرے اس کی بخشش فرما۔'' رب تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی ''میں نے آلِ داؤد کی دعائیں قبول کر لیں ہیں۔'' انہوں نے چار ہزار گائیں، سات ہزار بکریاں ذبح کیں۔ بہت سا کھانا تیار کیا اور بنو اسرائیل کی دعوت کی۔ اس ضمن میں بہت سے آثار ہیں۔ مؤرخین نے اس کی عمارت، جواہر، معادن، یاقوت، چھت، زمین اور دیواروں کے بارے ایسی باتیں لکھیں ہیں کہ دنیا کے ملوک اور شہنشاہ جن سے عاجز ہیں۔ جب بخت نصر آیا تو اس نے بیت المقدس کو ویران کر دیا۔ وہ عمدہ چیزیں لے لیں جو اس میں تھیں۔

۴ اس کے بعض فضائل:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔ (الاسراء:۱)

ترجمہ: ''پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔ بابرکت بنا دیا ہم نے جس کے گرد و نواح کو۔''

یہ آیت طیبہ اس کی شان کو آشکارا کر رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آسمانوں کی سیر کرانے سے قبل اس کی سیر کرائی گئی۔ رب تعالیٰ نے اس برکت کا تذکرہ کیا جو اس کے ارد گرد ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا:

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:۷۱)

ترجمہ: ''اور ہم نے نجات دی آپ کو اور لوط کو اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا تمام جہان والوں کے لیے۔''

مقدسی نے اس کے فضائل میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''جنت بیت المقدس کی مشتاق ہے۔ بیت المقدس کی چٹان جنت الفردوس میں سے ہے۔'' واسطی نے حضرت مکحول سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ''جس نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں بیت المقدس میں پڑھیں پھر نماز صبح اس میں ادا کی وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہوگیا کہ گویا کہ اس کی ماں نے اسے ابھی جنم دیا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''بیت المقدس میں ایک دن ایک ہزار دن کی طرح اور اس میں ایک ماہ ایک ہزار ماہ کی طرح اور اس میں ایک سال ایک ہزار سال کی طرح ہے۔ جو اس میں وصال کر گیا گویا کہ اس نے آسمان پر وصال کیا۔'' حضرت کعب سے روایت ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ہر روز دو بار بیت المقدس کی طرف دیکھتا ہے۔'' بیت المقدس کی فضیلت میں بہت سی آثار روایت ہیں۔

۳ بیت المقدس کے اسماء

(۱) مسجد اقصیٰ (۲) مسجد ایلیاء (۳) بیت المقدس (۴) بیت مقدس۔

اس سے مراد پاکیزہ گھر یا پاک کر دینے والا گھر ہے۔ یہ گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ ابن سراقہ نے لکھا ہے کہ مقدس سرزمین تین ہیں۔ (۱) فلسطین (۲) اردن (۳) دمشق۔ ان شہروں تک حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نگاہ اس وقت پہنچی تھی جب انہیں پہاڑ پر بلند کیا گیا۔ ان سے کہا گیا ''جہاں تک آپ کی نظر جائے گی وہ آپ کی ملکیت میں ہوگا اور آپ کے بعد آپ کی اولاد کی ملکیت میں ہوگا۔'' (۵) بیت المقدس (۶) مسلم اسے شلم بھی پڑھا گیا ہے۔ طبرانی میں اس کا معنی بیت السلام ہے۔ (۷) حضرت کعب الاحبار سے روایت ہے کہ

جنت ساتویں آسمان پر بالکل بیت المقدس کے اوپر ہے۔ اگر اس سے کوئی پتھر گرے تو وہ عین صخرۃ کے اوپر گرے گا۔ اسی لیے اس کا نام 'اوری شلم' اور جنت کو دار السلام کہا جاتا ہے (۸) اُوری شلم (۹) کورہ الیا (۱۰) اوراۍ سلم (۱۱) بیت ایل یعنی بیت اللہ (۱۲) صِہیَون (۱۳) مصرث (۱۴) بابوش (۱۵) کورشیلاہ (۱۶) صلعون (۱۷) سلیم (۱۸) فسط مصر (۱۹) ارض المحشر والمنشر (۲۰) المحفوظہ (۲۱) المفرقہ (۲۲) مدینۃ الجنۃ۔

۴ اس کے خصائص کے بارے

نماز کا کئی گنا اجر ملنا۔ اس میں نماز ادا کرنے کا اجر کتنے گنا ہے اس کے بارے مختلف روایات ہیں:

(۱) پانچ سو نمازوں کا ثواب۔ امام احمد، ابن ماجہ، بزار اور ابن عساکر نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بیت المقدس میں ایک نماز کا ثواب پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔''

(۲) ایک ہزار نمازوں کا ثواب۔ ابن ماجہ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ میں نے عرض کی: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ہمیں بیت المقدس کے بارے بتائیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ حشر کی زمین ہے۔ اس میں جاؤ۔ وہاں نماز ادا کرو۔ وہاں ایک نماز کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔'' امام نووی لکھتے ہیں ''اس کی سند میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام ذہبی نے اسے منکر لکھا ہے۔

(۳) پچاس ہزار نمازوں کا ثواب۔ ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''گھر میں کسی شخص کی ادا کی ہوئی ایک نماز کا ثواب ایک نماز کے برابر ہے۔ قبیلہ کی مسجد میں ادا کی گئی نماز کا ثواب پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔ جبکہ مسجد اقصیٰ میں ادا کی گئی نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ جبکہ مسجد حرام میں ادا کی گئی نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔

(۴) دوسو پچاس نمازوں کا ثواب۔ امام طبرانی نے اپنی معجم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں نماز ادا کرنا بیت المقدس میں نماز ادا کرنے سے چار گنا فضیلت رکھتی ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس میں ایک نماز کا ثواب دوسو پچاس نمازوں کے برابر ہے۔

(۵) بیس ہزار نمازوں کے برابر ثواب۔ یہ حضرت ابن عباس کی روایت ہے۔ اس کی مزید تفصیل مدینہ طیبہ کے فضائل کے ابواب میں آئے گی۔

دوسرا فائدہ

اس کی زیارت کے لیے سفر کرنا مستحب ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تین مساجد کے علاوہ کسی اور طرف رخت سفر نہ باندھا جائے۔ (۱) میری مسجد (۲) مسجد حرام کی طرف (۳) مسجد اقصیٰ کی طرف۔''

تیسرا فائدہ

اس میں قرآن پاک ختم کرنا مستحب ہے۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں ابومجلہ سے روایت کیا ہے کہ علماء مستحب سمجھتے ہیں کہ جو ان مساجد میں سے کسی مسجد میں جائے تو وہ باہر نکلنے سے قبل قرآن پاک ختم کرے۔

چوتھا فائدہ

اس میں ٹھہرنا مستحب ہے۔ حضرت مکحول سے روایت ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت اور شداد بن اوس رضی اللہ عنہما بیت المقدس میں قیام کرتے تھے۔'' بہت سے صحابہ کرام اس میں قیام کرتے تھے۔

پانچواں فائدہ

اس میں روزہ رکھنا مستحب ہے۔ روایت ہے کہ بیت المقدس میں روزہ رکھنا آگ سے نجات ہے۔

چھٹا فائدہ

اس سے عمرہ اور حج کا احرام باندھنا مستحب ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے عمرہ یا حج کا احرام مسجد اقصیٰ سے باندھا اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔

ساتواں فائدہ

اس کے لیے زیتون کا تیل بطور تحفہ بھیجنا مستحب ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے عرض کی: "یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ہمیں بیت المقدس کے بارے بتائیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یہ حشر کی سرزمین ہے۔ وہاں جاؤ اور نماز ادا کرو۔ اس میں نماز ادا کرنے کا ثواب کسی اور جگہ نماز پڑھنے سے ایک ہزار گنا درجہ رکھتا ہے۔" انہوں نے عرض کی: "یارسول اللہ! اگر میں وہاں جانے کی استطاعت نہ رکھوں تو؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اس کے لیے زیتون کا تیل بطور تحفہ بھیجو۔ تاکہ اس میں روشنی ہو سکے۔ جس نے اس طرح کیا گویا وہ وہاں خود گیا۔"

آٹھواں فائدہ

بعض اسلاف نے لکھا ہے کہ اس میں گناہوں کا عذاب بھی دوگنا ہوتا ہے۔ حضرت کعب سے روایت ہے کہ جب وہ حمص سے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کے لیے آئے۔ جب ایک میل کی مسافت تک پہنچے تو وہ ذکر، تلاوت اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ وہ مسجد اقصیٰ سے ایک میل باہر بھی اسی طرح نکلے۔ انہوں نے کہا: "اس میں گناہوں کا عذاب بھی کئی گنا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی مقدس جگہوں پر گناہ کرنے والا زیادہ جرأت کرتا ہے اور وہ رب تعالیٰ سے کم خوف کھاتا ہے۔" واسطی نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: "مجھے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "ہمارے ہمراہ اس مسجد کی طرف نکلو۔ اس میں برائی کی سزا اس طرح دوگنی ہے جس طرح اس میں نیکیوں کی جزاء دگنی ہے۔"

نواں فائدہ

دجال بیت المقدس میں داخل نہیں ہوسکتا۔ ابن ابی شیبہ نے المصنف میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ساری زمین پر غالب آجائے گا۔ مگر وہ حرم پاک اور بیت المقدس میں داخل نہیں ہوسکے گا۔ وہ اہلِ ایمان کو بیت المقدس میں محصور کر دے گا۔ رب تعالیٰ اسے اور اس کے لشکر کو شکست دے دے گا۔ حتیٰ کہ دیوار کے اندر سے اور درخت کے تنے سے آواز آئے گی: ''اے مومن! کافر اس جگہ چھپا ہے۔ آؤ اسے قتل کر دو۔''

دسواں فائدہ

مسجد اقصیٰ کی چٹان مسجد حرام میں حجر اسود کی طرح ہے۔ ابونعیم نے حضرت وھب سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کی چٹان سے فرمایا: ''میں اپنا عرش تجھ پر ضرور رکھوں گا۔ میں اپنی مخلوق کو تیرے پاس ضرور جمع کروں گا۔ اس روز حضرت داؤد علیہ السلام سوار ہو کر تیرے پاس ضرور آئیں گے۔''

امام واسطی اور ابن عساکر نے حضرت یزید بن جابر سے رب تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے لکھا ہے:

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ (ق:۴۱)

ترجمہ: ''اور کان لگا کر سنو اس دن کے بارے میں جس دن پکارنے والا قریب سے پکارے گا۔''

حضرت اسرافیل بیت المقدس کی چٹان پر کھڑے ہوں گے۔ وہ صور پھونکیں گے۔ وہ کہیں گے۔ ''اے بوسیدہ ہڈیو! اے پارہ پارہ جلدو! اے ٹکڑے ٹکڑے بالو! رب تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم فیصلے کے لیے جمع ہو جاؤ۔''

ابن جریر اور واسطی نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''ہم بیان کرتے تھے کہ وہ بیت المقدس کی چٹان سے یہ صدا لگائیں گے۔ وہ زمین کے وسط میں

ہے۔" حضرت کعب سے روایت ہے کہ یہ جگہ دوسری زمین سے اٹھارہ میل آسمان کے قریب ہے۔

گیارھواں فائدہ

بیت اللہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنا مکروہ ہے۔

بارھواں فائدہ

روایت ہے کہ جسے بیت المقدس میں دفن کیا گیا اسے قبر کے فتنہ اور منکر نکیر کے سوالات سے بچا لیا گیا۔ جسے ایلیاء میں دفن کیا گیا اسے آسمان دنیا میں دفن کیا گیا۔ ابونعیم نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو بیت المقدس میں فوت ہوا گویا کہ وہ آسمان پر فوت ہوا۔"

تیرھواں فائدہ

خطیب نے الموضح میں لکھا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "پہلے انبیائے کرام علیہم السلام جنت میں داخل ہوں گے۔ پھر بیت اللہ کے مؤذن، پھر بیت المقدس کے مؤذن، پھر میری مسجد کے مؤذن، پھر سارے مؤذنین۔"

چودھواں فائدہ

بیت المقدس، مسجد حرام اور مسجد نبوی میں جھوٹی قسم اٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس کی سزا جلد مل جاتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سلیمان بن عبدالملک کے گورنر کو صخرۃ کی طرف لے جانے کا حکم دیا تاکہ وہ اس کے پاس قسم اٹھائیں۔ سوائے ایک کے سب نے قسمیں اٹھا دیں۔ اس نے اپنی قسم کا فدیہ ایک ہزار دینار ادا کر دیا۔ ایک سال میں دیگر سارے عمال مر گئے تھے۔

پندرھواں فائدہ

ابن جریر نے حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کا ایک گروہ حق کے ساتھ غالب رہے گا۔ ان کا مخالف انہیں نقصان نہ دے سکے گا۔'' عرض کی گئی: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! وہ کہاں ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''بیت المقدس میں یا بیت المقدس کے اطراف میں۔'' ابویعلی نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کا ایک گروہ دمشق کے دروازوں پر، بیت المقدس کے دروازوں پر اور اس کے اردگرد مصروف جنگ رہے گا۔ رسواء کرنے والوں کی رسوائی انہیں نقصان نہیں دے گی۔ وہ حق کے ساتھ غالب رہیں گے۔ حتیٰ کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔''

سولھواں فائدہ

ابوالمعالی نے روایت کیا ہے کہ جس نے حج کیا اور ایک ہی سال میں مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی وہ اس طرح پاک ہوگیا کہ گویا کہ اس کی ماں نے اسے ابھی جنم دیا ہو۔ لیکن امام نووی نے فرمایا ہے: ''اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔'' اس میں اعتراض کی گنجائش ہے۔

سترھواں فائدہ

دارمی نے لکھا ہے کہ بیت المقدس کے محراب میں دائیں بائیں اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ انہوں نے اسے مسجد نبوی کے ساتھ ملایا ہے۔

اٹھارھواں فائدہ

صیدلانی، ماوردی، رویانی، بغوی اور بندنیجی، امام غزالی اور امام کراسانی نے لکھا ہے کہ بیت المقدس میں نماز عید ادا کرنا مستحب ہے۔ اس میں نماز عید ادا کرنا، عید گاہ میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

انیسواں فائدہ

ابن سراقہ نے کتاب المداد میں لکھا ہے "اسلام کی بڑی بڑی مساجد میں سے ایک مسجد بیت المقدس ہے۔" کہا جاتا ہے کہ عید یا جمعۃ المبارک کے روز اس کی ایک صف بھی مکمل نہیں ہوتی۔

بیسواں فائدہ

وہ مقامات جو انبیائے کرام علیہم السلام کے آثار کی وجہ سے مشہور ہیں۔ان کی زیارت کرنا مستحب ہے۔خصوصاً اس جگہ کی زیارت کرنا مستحب ہے جہاں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ادا کی۔

اکیسواں فائدہ

خانہ کعبہ کا بیت المقدس کی طرف جانا۔ واسطی نے فضائل بیت المقدس کو خالد بن معدان سے روایت کیا ہے۔انہوں نے کہا: "اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی حتیٰ کہ خانہ کعبہ سج کر صخرہ کی طرف جائے گا۔سارے حاجی اور عمرہ کرنے والے اس کے ساتھ معلق ہوں گے۔جب چٹان اسے دیکھے گی تو وہ اس کی زیارت کرنے والوں کو مرحبا کہے گی۔حضرت کعب سے روایت ہے۔انہوں نے فرمایا ہے کہ اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی۔حتیٰ کہ بیت اللہ کو سجا کر بیت المقدس کی طرف لے جایا جائے گا۔انہیں جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔اس کے ساتھ حاجی اور عمرہ کرنے والے معلق ہوں گے۔ابن مردویہ، اصفہانی اور دیلمی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "روزِ حشر خانہ کعبہ سج کر میری قبر انور کی طرف آئے گا۔وہ عرض کرے گا: "السلام علیك یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)" میں کہوں گا: علیك یا بیت اللہ! میرے بعد میری امت نے کیا کیا؟ وہ کہے گا: "جو میرے پاس آگیا میں اسے کافی ہو جاؤں گا۔میں اس کی شفاعت کروں گا۔اور جو میرے پاس نہیں آئے گا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے لیے کافی ہو جائیں گے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے شفیع ہوں گے۔"

⑮ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے انکار کیا ہے کہ اس رات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت المقدس میں نماز ادا کی ہو۔ انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ادا کی ہوتی تو تمہارے لیے بھی اس میں نماز ادا کرنا فرض کر دیا جاتا۔ امام بیہقی اور امام ابن کثیر نے کہا ہے کہ مثبت کو نافی پر مقدم کیا جائے گا۔ یعنی جس نے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت المقدس میں نماز ادا کی اس کی بات مان لی جائے گی۔ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی مؤقف ہے۔ انکا علم اس سے زیادہ ہے جس نے اس نماز کی نفی کی ہے۔ لہٰذا اس زیادتی کو قبول کرنا بہتر ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نماز میں تلازم سے منع کیا گیا ہے۔ اگر نماز پڑھنا مشروع قرار دینا ہوتو آپ نے اس میں نماز پڑھنے کو مشروع قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مسجد حرام اور مسجد نبوی کے ساتھ ملایا ہے۔

⑯ روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عروج سے قبل انبیائے کرام کو نماز پڑھائی۔ حافظ نے لکھا ہے کہ یہی مؤقف ظاہر ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپسی سے دوبارہ انبیائے کرام کو نماز پڑھائی۔ حافظ ابن کثیر نے اس مؤقف کو درست قرار دیا ہے۔ صاحب السراج نے لکھا ہے کہ اس امر سے کوئی مانع نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دوبار نماز پڑھائی ہو۔

⑰ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انبیائے کرام کو کیسے نماز پڑھائی حالانکہ وہ وصال کے بعد دار آخرت میں ہیں۔ وہ دار عمل نہیں ہے۔ قاضی اور امام بکی نے اس کے دو جوابات دیے ہیں؛ (۱) ہم کہتے ہیں کہ انبیائے کرام شہداء کی طرح ہیں بلکہ ان سے افضل ہیں۔ شہداء اپنے رب تعالیٰ کے ہاں زندہ ہیں۔ بعید نہیں کہ وہ حج کرتے ہوں اور نماز پڑھتے ہوں۔ جیسے کہ روایت میں اس امر کا تذکرہ ہے۔ وہ حسبِ استطاعت رب تعالیٰ کا قرب اختیار کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا وصال ہو چکا ہے۔ وہ اسی دنیا میں ہیں جو دار العمل ہے۔ جب اس کی مدت ختم ہوگئی تو اس کے بعد آخرت آ جائے گی جو دار الجزاء ہے۔ تو عمل منقطع ہو جائے گا۔ لب لباب یہ ہے ان کے کثیر

اعمال اور زیادہ اجر کی وجہ سے انکے برزخ پر دنیا کا حکم لگایا جائے گا۔(۲) امام بکی لکھتے ہیں "ہم کہتے ہیں کہ آخرت میں منقطع ہونے والی چیز تکلیف ہے۔کبھی کبھی اعمال تکلیف کے بغیر از روئے تلذذ اور رب تعالیٰ کے لیے خشوع وخضوع کے لیے بھی ہوتے ہیں۔لہٰذا روایت ہے کہ انبیائے کرام تسبیح بیان کرتے ہیں۔قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔شفاعت کے وقت حضور سرورِ عالم ﷺ کے سجدۃ کی طرف دیکھو کیا یہ عبادت اور عمل نہیں ہے۔ان دونوں جوابات پر برزخ کی مدت میں ان اعمال کا حصول ممتنع نہیں ہے۔

حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح روایت سے ثابت ہے کہ انہوں نے یہ دعا مانگی: "مولا! اگر تو نے کسی کو قبر میں نماز پڑھنے کی توفیق دی ہے تو مجھے یہ توفیق دینا۔"انہیں اس کے وصال کے بعد دیکھا گیا۔وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔یہی کافی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو دیکھا۔وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے۔کیونکہ حضور اکرم ﷺ اور دیگر سارے انبیاء کرام علیہم السلام کا وصال نہیں ہوا حتیٰ کہ انہیں دنیا میں باقی رہنے اور آخرت کے مابین اختیار دیا گیا۔انہوں نے آخرت کو اختیار کیا۔بلاشبہ اگر وہ دنیا میں اور رہتے تو ان کے اعمال صالحہ میں اضافہ ہو جاتا۔پھر وہ جنت میں تشریف لے جاتے۔اگر وہ یہ نہ جانتے کہ رب تعالیٰ کے حریمِ ناز میں ان کا جانا افضل ہے تو وہ اسے اختیار نہ کرتے۔اگر اس دنیا سے ان کا انتقال قربِ الٰہی میں کمی کرتا تو وہ اسے منتخب نہ کرتے۔اس کی مزید تفصیل باب حیات النبی ﷺ میں آئے گی۔"

۱۸ یہ کون سی نماز تھی جو حضور اکرم ﷺ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو پڑھائی تھی؟ صحیح موقف یہ ہے کہ وہ مشہور نماز ہی تھی۔کیونکہ لغت کے اعتبار سے نص کو اس کی شرعی حقیقت پر ہی محمول کیا جائے گا الا یہ کہ اسے شریعت پر محمول کرنا مشکل ہو۔اس جگہ ایسا کوئی عذر نہیں۔اس لیے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ نماز عشاء کی یا صبح کی نماز تھی۔

میں کہتا ہوں "برابر ہے کہ خواہ ہم کہیں کہ آپ ﷺ نے عروج سے قبل یا بعد میں انبیاء

کرام کو نماز پڑھائی۔ کیونکہ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے نمازِ ظہر ادا فرمائی۔ جو امر ظاہر ہے وہ یہی ہے کہ یہ نفلی نماز تھی۔ یا شب معراج سے قبل فرض نماز تھی۔ امام نووی کا فتویٰ دوسرے مؤقف کی تائید کرتا ہے۔

۱۹ بعض علماء کرام نے لکھا ہے کہ آسمان پر آپ ﷺ کا انبیاء کو دیکھنا ان کی ارواح کو دیکھنے پر محمول کیا جائے گا۔ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ کیونکہ صحیح یہ ہے کہ ان کو جسم اقدس کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے بھی اسی طرح کہا گیا ہے۔ البتہ جنہوں نے آپ ﷺ کے ہمراہ بیت المقدس میں نماز پڑھی اسے خاص ارواح پر محمول کیا جائے گا۔ امام حاکم اور امام بیہقی نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے انبیائے کرام کی ارواح سے ملاقات کی۔" اس میں یہ دلیل ہے کہ ارواح اپنے اجسام میں متشکل ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ارواح اجسام کے ساتھ ہوں۔ وہ روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے جسے امام بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ سارے انبیائے کرام کو آپ ﷺ کے لیے جمع کیے۔ بزار اور طبرانی نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے لیے انبیائے کرام علیہم السلام کو جمع کیا گیا۔ جن کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے یا ذکر نہیں فرمایا، وہ سارے انبیاء وہاں جمع تھے۔ میں نے انہیں نماز پڑھائی۔"

۲۰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "اس نے مجھے عظیم مملکت عطاء کی ہے۔" ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے کسی عرفی سلطنت کا وعدہ نہ تھا۔ یا تو مملکت کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہوگی اور اس سے مراد ان کا بڑے بڑے بادشاہوں پر غالب آجانا ہے بطور مثال نمرود ہی کافی ہے۔ رب تعالیٰ نے اسے اپنے خلیل کے لیے مغلوب کر دیا تھا۔ وہ ان کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ عظیم بادشاہ کا مغلوب ہو جانا عظیم مملکت کے مغلوب کے مانند ہے۔ قاہر مقہور سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اضافت ان کی اولاد اور بیٹوں کی طرف ہو۔ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی

سلطنت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی سلطنتیں مراد ہوں ۔ارشادِ باری ہے:

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ (النساء:۵۴)

ترجمہ:''ہم نے مرحمت فرمادی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب وحکمت اور عظیم الشان سلطنت عنایت فرمادی ہے۔''

اس جگہ آپ کی ذریت اور اولاد کی طرف ہی اشارہ ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہے انہیں اپنے نفس پر پورا کنٹرول تھا۔ اضطراب کے مقامات پر بھی ان کے نفس پر ان کا قبضہ رہا جیسے کہ جب حضرت جبرائیل نے ان سے پوچھا:''کیا کچھ حاجت ہے؟'' انہوں نے فرمایا:''تمہاری طرف تو نہیں۔''

۲۱ اس میں اختلاف ہے کہ برتن کب پیش کیے گئے۔ کیا وہ عروج سے پہلے تھے یا بعد میں؟ ان کی تعداد کتنی تھی؟ اکثر روایات میں ہے کہ عروج سے قبل برتن پیش کیے گئے۔ امام احمد، شیخین، امام نسائی اور ترمذی نے حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔''پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیت المعمور کی طرف اٹھایا گیا...... پھر میرے پاس دو برتن لائے گئے۔ ایک میں شراب جبکہ دوسرے میں دودھ تھا۔'' امام بخاری نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کیا ہے''مجھے سدرۃ المنتہیٰ لے جایا گیا۔ وہاں چار نہریں تھیں...... مجھے تین پیالے پیش کیے گئے۔ ابن عائذ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی:''پھر ہم روانہ ہوئے۔ ہمیں تین ڈھانپے ہوئے برتن پیش کیے گئے۔'' امام سہیلی، ابن دحیۃ، ابن منیر، ابن کثیر اور حافظ نے لکھا ہے''شاید یہ برتن دو دفعہ پیش کیے گئے تھے۔'' تاکہ ساری روایات کو جمع کیا جاسکے۔'' ابن کثیر اور حافظ نے لکھا ہے کہ برتنوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اسکو اس امر پر محمول کیا جائے گا کہ بعض راویوں نے ان امر کا تذکرہ کر دیا جس کا ذکر دوسرے نے نہ کیا۔ چار برتن تھے جنہیں دو بار پیش کیا گیا۔ چار نہریں تھیں جو سدرۃ المنتہیٰ کی اصل سے نکلتی تھیں۔

۲۲ اگر ہم یہ کہیں کہ برتن دو بار پیش کیے گئے تھے تو شراب پیش کرنے اور آپ ﷺ کے اعراض اور حضرت جبرائیل کا درست قرار دینے کا مدعا یہ ہے کہ اس سے بہت زیادہ اجتناب کیا جائے۔ کیا یہ شراب جنت کی شراب تھی یا دنیا کی؟" اگر یہ جنت کی شراب تھی تو اس سے اجتناب اس لیے تھا کیونکہ یہ اس شراب کے صورۃً مشابہ تھی جو حرام تھی۔ یہ تقویٰ کی انتہاء ہے۔ اگر اس سے مراد دنیا کی شراب ہے تو پھر اس سے اجتناب کا سبب واضح ہے۔ اگر پہلا امر مراد لیا جائے تو اس سے ایک فائدہ سمجھ آتا ہے وہ یہ کہ جس نے مشروبات کی ایسی کیفیت بنائی جو شراب سے ملتی ہو اور اس شکل میں پیش کیا جس میں اہلِ شہوات پیش کرتے ہیں تو اس نے برا کام کیا اگرچہ اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ ہمارے اصحاب نے ذکر کیا ہے کہ پانی کا گلاس اس طرح پھرانا جس سے شراب نوشی کی مشابہت پیدا ہو جائے ایسا کرنے والے پر تعزیر لگائی جائے گی۔

۲۳ ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ اختیار کبھی تو دو واجبوں کے مابین ہوتا ہے جیسے کفارہ، یا دو مباح اشیاء میں ہوتا ہے۔ لیکن واجب اور ممنوع اور مباح اور ممنوع میں اختیار محال ہے۔ ذرا دودھ اور شراب پیش کرنے کے بارے غور کرو۔ کیا ارادہ یہ تھا کہ ان دونوں کو مباح قرار دیا جائے اور ان کا اذن دیا جائے؟ جیسے تم کسی مہمان کو دو کھانے پیش کرو تو تم اس کے لیے دونوں مباح قرار دو گے؟ ان میں سے ایک کو اختیار کرنے کا کیا مفہوم ہے؟ حضرت جبرائیل کے اس قول کا کیا مفہوم ہے" آپ ﷺ نے فطرت کو اختیار کیا ہے یا آپ ﷺ نے صحیح مؤقف اختیار کیا ہے۔ اگر مراد یہ ہو کہ ان میں سے ایک میں اذن دیا جائے اس طرح کہ دوسرے کو ممنوع قرار دیا جائے تو پھر ممنوع اور مباح میں اختیار لازم آئے گا۔ یہ متصور نہیں ہو سکتا۔ وہ امر جس سے یہ اشکال اٹھ جائے گا وہ یہ ہے کہ حرام امر کی حرمت اور حلال امر کی حلت کو حضور اکرم ﷺ کے اجتہاد کے سپرد کیا جاتے۔ آپ ﷺ کی معصوم نگاہِ ناز کے سپرد کیا جائے۔ جب آپ ﷺ نے انہیں دیکھا تو اجتہاد نے شراب کی حرمت اور دودھ کی حلت کا فتویٰ دے دیا۔ وہ رب تعالیٰ کے علم کے ساتھ موافقت پا گیا۔ اس لیے جبرائیل امین نے کہا:" آپ ﷺ

نے درست کام کیا ہے" اگر یہ مقدر مانا جائے کہ شاید شراب حرام نہ ہو کیونکہ اسے مدینہ طیبہ میں حرام کیا گیا تھا۔ تو آپ ﷺ کا اجتناب از روئے تقویٰ ہوگا کہ اسے عنقریب حرام کر دیا جائے گا۔

◈ ابوخطاب کلبی نے لکھا ہے "فطرۃ کا اطلاق اسلام پر اور اصل خلقت پر ہوتا ہے۔ پہلے معنی کے اعتبار سے آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے" رب تعالیٰ کے اس فرمان کا دوسرا معنی ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ (الروم: ۳۰)

ترجمہ: "(مضبوطی سے پکڑو) اللہ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے۔"

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (فاطر: ۱)

ترجمہ: "(سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں) جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔"

یعنی ان کی تخلیق کا مبداء ہے۔ حضرت جبرائیل کا قول "آپ ﷺ نے فطرت کو اختیار کیا ہے۔" کی مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے وہ دودھ اختیار کیا ہے جس پر تخلیق کی بنیاد ہے۔ اسی سے گوشت بنتا ہے۔ یا آپ ﷺ نے اسے اس لیے اختیار کیا ہے کہ دین اسلام میں ہمیشہ کے لیے حلال ہے۔ جبکہ شراب کو حرام کر دیا جائے گا۔ تعبیر کے علم کی رو سے دودھ سے مراد علم ہوتا ہے۔ جیسے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے دیکھا کہ مجھے دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔ میں نے اسے پیا حتیٰ کہ میں سیر ہو گیا۔ وہ میرے ناخنوں سے نکلنے لگا۔ میں نے بقیہ دودھ حضرت عمر کو پکڑا دیا۔" صحابہ کرام نے عرض کی: "یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! آپ ﷺ نے اس کی کیا تعبیر کی ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "علم"

اگر یہ سیر عالم بیداری میں ہو تو بعض اوقات عالم بیداری میں بھی ایسے اشارات پائے جاتے ہیں جو تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ عمدہ فال کو پسند کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ کا قلب انور ایمان اور حکمت سے بھر گیا تو اس کے مطلق

علم اس میں ڈالا گیا۔ رب تعالیٰ نے اس دودھ کو علم اور قلب انور کی تقویت کا سبب بنایا تاکہ وہ اس کے انوار کو برداشت کر سکے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ شاید دودھ کو فطرت اس لیے کہا گیا ہو کیونکہ یہ وہی خوراک ہے جو سب سے پہلے بچے کے پیٹ میں داخل ہوتی ہے اور اس کی آنتیں کھولتا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا میلان اس کی طرف تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے اسے پسند فرمایا۔ اس لیے بھی کہ اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر آپ شراب کو اختیار فرما لیتے تو یہ لغزش ہوتی۔ حضور اکرم ﷺ لغزش سے معصوم ہیں۔ اس وقت یہ مسئلہ اجتہادی ہوتا۔ کیونکہ شراب کو بعد میں حرام کیا گیا۔

﴿۲۵﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر سیڑھی لائی گئی۔ اگلا سفر براق پر نہیں ہوا تھا۔ اس میں اختلاف ہے حضرت مالک بن صعصعۃ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ براق پر ہی سوار رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ کو آسمان کی سیر کرا دی گئی۔ ابوجمرۃ اور ابن دحیۃ نے یہی مؤقف اختیار کیا ہے لیکن دیگر علماء کا مؤقف ہے کہ روایات آشکارا کرتی ہیں کہ اگلا سفر براق پر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ سیڑھی کے ذریعے ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے ''پھر میرے پاس سیڑھی لائی گئی''۔ ابن کثیر نے لکھا ہے ''جب آپ ﷺ بیت المقدس سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ کے لیے سیڑھی نصب کی گئی۔ آپ ﷺ اس پر چڑھ کر آسمان پر تشریف لے گئے۔ یہ چڑھنا براق پر نہیں تھا جیسے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ بلکہ براق تو مسجد اقصیٰ کے ساتھ بندھی رہی تاکہ آپ ﷺ اسی پر مکہ مکرمہ لوٹ چلیں''۔ شیخ نے لکھا ہے کہ یہی مؤقف درست ہے جس پر احادیث صحیحہ دلالت کرتی ہیں۔

﴿۲۶﴾ ابن دحیہ نے معراج کو دس اقسام میں تقسیم کیا ہے جتنے ہجرت کے سال ہیں۔ سات معراج ساتوں آسمانوں تک تھے۔ آٹھواں معراج سدرۃ المنتہیٰ تک تھا۔ نواں معراج اقلام کی آواز سننے تک تھا جبکہ دسواں معراج عرش اور رفرف تک تھا۔

﴿۲۷﴾ روایت ہے کہ جنت کے ایک درجہ سے دوسرے درجہ تک پانچ سو سال کا سفر ہے۔ ایک درجہ نیچے آتا ہے تاکہ ولی اللہ اس پر چڑھے۔ پھر وہ اپنے مقام پر چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ معراج کا زینہ بھی اسی طرح تھا۔

۴۸ معراج کے قصے میں چڑھنے اور اترنے سے یہ نہ سمجھا جائے رب تعالیٰ اور اس کے بندے کے مابین مسافت ہے یہ کفر ہے۔ ہم اس سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں یہ چڑھنا اور اترنا بندے کی نسبت سے ہے اللہ تعالیٰ کی نسبت سے نہیں۔ حضور اکرم ﷺ انتہائی قرب کے باوجود اس رات مقام عبودیت سے آگے نہیں گئے تھے۔ آپ ﷺ اور حضرت یونس علیہ السلام اس وقت جب مچھلی نے انہیں نگل لیا تھا اور انہیں لے کر سمندر میں چلی گئی تھی وہ پھر انہیں لے کر سمندر کی تہ میں اتر گئی تھی، عدم جہت، تحیز، حد اور احاطہ کے اعتبار سے برابر تھے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے چھ ہزار سال کی مسافت طے کی تھی۔ جب تمہیں یہ علم ہو گیا تو پھر آپ ﷺ کی یہ مسافت اور سفر اس لیے تھا تا کہ اہلِ آسمان کے نزدیک آپ ﷺ کی رفعت کا اظہار ہو سکے۔ نیز یہ علم ہو سکے کہ آپ ﷺ ساری مخلوقات سے افضل ہیں۔ اس مقصد کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ آپ ﷺ کو براق پر سوار کرایا گیا۔ آپ ﷺ کے لیے سیڑھی نصب کی گئی۔ آپ ﷺ کو انبیائے کرام اور ملائکہ کا امام بنایا گیا۔ حالانکہ رب تعالیٰ قادر تھا کہ آپ ﷺ کو براق اور سیڑھی کے بغیر ہی سیر کراتا۔

اصحابِ جہت سے کہا جائے گا "تمہیں اس چیز نے حق کا عقیدہ رکھنے سے روکا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ ہر موجود کا کسی نہ کسی جہت میں ہونا ضروری ہے۔ ہمیں عرش اور اس سے اوپر کی اشیاء کے بارے بتائیں کہ کیا وہ قدیم ہیں یا حادث ہیں۔ اگر کہیں کہ قدیم ہیں تو انہوں نے عالم کے قدیم ہونے کا قول کیا۔ اس نے دو محال امور کی طرف دعوت دی۔ (ا) ازل میں رب تعالیٰ کے علاوہ اس کے ہمراہ اور بھی تھا۔ دو قدیموں میں سے ایک دوسرے کے قائم مقام نہیں ہو سکتا جو اس سے افضل ہو۔ جہت اور مکان یا تو جسم ہوں گے۔ یہ سارے اجسام کے وجود کی طرف دعوت دیتی ہے۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے کہا ہے کہ عالم قدیم ہے نعوذ باللہ منہ۔ اگر وہ کہیں کہ عالم حادث ہے تو کہو کہ تم نے سچ کہا ہے کہ رب تعالیٰ پہلے موجود تھا حالانکہ اس وقت جہت نہیں تھی۔ محال جائز یا واجب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قدیم حادث کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ اس کے ہونے سے

قبل اس سے مستغنی تھا۔ وہ ماضی میں اس سے مستغنی تھا اور مستقبل میں اسی طرح مستغنی رہے گا۔ یہ محال ہے کہ کل کا خالق اپنی ہی بعض مخلوق کا محتاج ہو۔ استواء اور نزول وغیرہ کے وہ الفاظ اور صفات جن کو ظاہری طور پر جاری کرنا مشکل ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس کے معنی کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ ہم اسے اس کی کسی مخلوق سے مشابہت نہیں دیتے۔ نہ ہی کسی اس صفت کا انکار کرتے ہیں جو اس ذات نے اپنے لیے ثابت کی ہے یا حضور اکرم ﷺ نے اس کے لیے ثابت کی ہے۔

ابن حبیب سے روایت ہے کہ زمین اور آسمان کے مابین ایک سمندر ہے جسے مکفوف کہا جاتا ہے۔ اس کے سامنے اس دنیا کے سمندر اسی طرح ہیں جس طرح بحرِ بے کراں کے سامنے ایک قطرہ ہو۔ اس سمندر کو ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے شق کیا گیا۔ یہ حضرت موسیٰ کے لیے شق بحر سے بڑا معجزہ ہے۔

آسمان اور زمین کے مابین فیصلہ

امام احمد، ابو داؤد، امام ترمذی، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''ہم حضور اکرم ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر تھے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ آسمان اور زمین کے مابین کتنا فیصلہ ہے؟'' ہم نے کہا: ''اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مکرم ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''ان کے مابین پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ ہر آسمان کے مابین پانچ سو سال جتنی مسافت ہے۔ ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال مسافت جتنی ہے۔ ساتوں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے۔ وہ اوپر سے نیچے تک اتنا بڑا ہے جتنا زمین اور آسمان کے مابین فاصلہ ہے۔ ان کے اوپر آٹھ فرشتے ہیں جن کے پاؤں سے لے کر گھٹنوں تک کا فاصلہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی مسافت جتنا ہے۔ اس کے اوپر عرش ہے۔ اس کی موٹائی اتنی ہے جتنی ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا فاصلہ ہے۔ اس کے اوپر اللہ تعالیٰ ہے۔

ابن راھویہ اور بزار نے صحیح سند سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم

ﷺ نے فرمایا: ''آسمان اور زمین کے مابین پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ ہر آسمان پانچ سو سال کی مسافت جتنا موٹا ہے۔ ساتوں آسمانوں تک اسی طرح ہے۔ اسی طرح زمینیں ہیں۔ ساتویں آسمان سے لے کر عرش تک اسی طرح ہے۔''

ابن جریر اور ابن منیر نے حضرت ابن مسعود اور دیگر صحابہ کرام سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''رب تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ اس نے جو کچھ تخلیق کیا تھا اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ جب اس نے خلق کو بنانے کا ارادہ کیا تو پانی سے دھواں نکالا وہ پانی کے اوپر پھیلا۔ اس لیے اس کا نام سماء رکھ دیا۔ پھر اس نے پانی کو خشک کر دیا۔ ایک زمین بنا دی۔ پھر اسے چیر کر دو دنوں میں سات زمینیں بنا دیں۔ زمین کو مچھلی پر بنایا۔ رب تعالیٰ نے اس فرمان میں اسی کا تذکرہ ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝١ (نون:۱)

ترجمہ: ''ن، قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔''

مچھلی پانی میں ہے۔ پانی پتھر پر ہے۔ پتھر فرشتے کی پشت پر ہے۔ فرشتہ چٹان پر ہے۔ چٹان ہوا میں ہے۔ لقمان نے اسی چٹان کا ذکر کیا ہے جو نہ آسمان میں اور نہ زمین پر ہے۔ مچھلی نے حرکت کی جس سے لرزہ پیدا ہوا۔ زمین پر زلزلہ آیا۔ رب تعالیٰ نے اس پر پہاڑ گاڑھ دیے۔ زمین قرار پذیر ہو گئی۔ اس نے اس میں پہاڑ تخلیق کیے۔ اس کے باسیوں کے لیے رزق اور اس کے درخت پیدا کیے۔ دو دن منگل اور بدھ میں یہ امور مکمل کیے۔ پھر آسمان کی طرف توجہ فرما ہوا۔ یہ دھوئیں کی طرح تھا۔ یہ دھواں پانی کے سانس لینے سے پیدا ہوا تھا۔ رب تعالیٰ نے اسے ایک آسمان بنا دیا۔ پھر اسے چیر کر سات آسمان بنا دیے۔ دو دن جمعرات اور جمعہ میں یہ کام مکمل ہوئے۔ روز جمعہ کو اسی لیے جمعۃ کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دن آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو جمع کیا۔ ہر آسمان کے امور اس کے سپرد کیے۔ یعنی اس کے ملائکہ، سمندر، پہاڑ اور برد وغیرہا تخلیق کیے۔ آسمانِ دنیا کو ستاروں سے سجایا۔ انہیں شیاطین سے تحفظ اور باعث زینت بنایا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش

پر ہے۔عرش آسمانوں پر ہے۔آسمان اس کی زمین کے اوپر ہیں۔" انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا کہ وہ قبہ کی طرح ہیں۔ابن ابی حاتم نے قاسم بن بزۃ سے روایت کیا ہے کہ آسمان مربع شکل میں نہیں۔وہ گول گنبد دار ہے جو لوگوں کو سبز نظر آتا ہے۔طبرانی اور ابن منذر نے حضرت ربیع بن انس سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ آسمان دنیا گول موج سے، دوسرا آسمان سفید زمرد سے، تیسرا آسمان لوہے، سے چوتھا آسمان تانبے سے اور پانچواں آسمان چاندی سے چھٹا، آسمان سونے سے اور ساتواں آسمان سرخ یاقوت سے بنایا گیا ہے۔ابن ابی حاتم نے یہ اضافہ کیا ہے" اس کے اوپر نور کا صحرا ہے۔اس کے اوپر کیا ہے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔پردوں پر ایک فرشتہ نگران ہے جسے میطاطروس کہا جاتا ہے۔" حضرت کعب سے روایت ہے کہ آسمان دودھ سے زیادہ سفید اور کوہِ قاف سے زیادہ سبز ہے۔

◆ حضرت جبرائیل امین نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ممکن ہے انہوں نے دروازے پر دستک دی ہو یا آواز دی ہو۔حافظ نے لکھا ہے کہ پہلی بات زیادہ قرین صواب ہے۔کیونکہ معروف صدا یہی ہے۔میں کہتا ہوں کہ حضرت ثابت بنانی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ حضرت جبرائیل امین نے آسمان کے دروازے کھولنے کے لیے کہا کیونکہ انہوں نے یہ دروازے بند پائے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے سے قبل دروازے کھولے نہیں گئے تھے۔اگرچہ زیادہ اکرام اسی میں تھا۔کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر انہیں کھلا دیکھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ گمان کرتے کہ یہ اسی طرح رہتے ہیں۔اس طرح اس لیے کیا گیا تاکہ آپ کو علم ہو سکے کہ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہی کیا گیا ہے۔نیز رب تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتانا چاہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہلِ آسمان میں معروف ہیں۔حضرت جبرائیل سے جب پوچھا گیا "کون؟" تو انہوں نے "جبرائیل" کہا۔اپنا نام لیا تاکہ کسی اور کے ساتھ التباس لازم نہ آئے۔انہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔کیونکہ وہ نیچے اترتے رہتے تھے اوپر چڑھتے رہتے تھے۔اسی لیے انہوں نے اپنے اسم گرامی کو مقدم کیا۔کیونکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لانے کے لیے قاصد بن کر گئے تھے۔فرشتے کے جواب مرحبا سے ابن دحیہ

اور ابن منیر نے یہ استنباط کیا ہے کہ سلام کا جواب اس لفظ کے علاوہ کسی اور لفظ سے دینا جائز ہے۔ لیکن ان کی گرفت یوں کی گئی ہے کہ فرشتے کا قول "مرحبا" سلام کا جواب نہیں ہے کیونکہ اس نے دروازے کھولنے سے قبل آپ ﷺ کو خوش آمدید کہا تھا۔ ابن ابی جمرۃ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ جب بھی کسی نبی کے پاس سے گزرے تو حضرت جبرائیل نے کہا: "آپ ﷺ انہیں سلام کریں۔" آپ ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔

◈ اذن طلب کرنے والے سے اگر کہا جائے کہ وہ اپنا نام بتائے تو لازمی ہے کہ وہ محمد شامی کہے۔ صرف محمد پہ اکتفاء نہ کرے۔ کیونکہ محمد نامی افراد بہت سے ہوتے ہیں۔ اس سے اشتباہ لازم آتا ہے نہ ہی "انا" "میں" کہے۔ بلکہ اپنا نام لے۔ کیونکہ حضرت جبرائیل نے "میں" نہیں کہا تھا بلکہ جبرائیل کہا تھا۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ سے ایک شخص نے اجازت طلب کی آپ ﷺ نے پوچھا: "کون؟" جواب آیا: "میں۔" آپ ﷺ نے اس کا انکار فرماتے ہوئے فرمایا: "انا انا" کیا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے دو وجہوں سے اس لفظ کا انکار فرمایا۔ (۱) اس میں عظمت کا احساس ہے۔ سب سے پہلے یہ لفظ شیطان نے استعمال کیا تو وہ مردود ہو گیا۔ اس نے کہا:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (الاعراف: ۱۲)

ترجمہ: "میں اس سے بہتر ہوں تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور تو نے پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے۔"

فرعون نے بھی کہا تھا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ (النازعات: ۲۴)

ترجمہ: "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔"

نیز یہ مبہم ہے کہ ضمیر کس طرف راجع ہے۔ یہ بیان ناکافی ہے۔ جب ضمیر کا مضمر متعین ہو تو سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اجازت طلب کرنے والا اس سے پردہ میں ہوتا ہے جس سے اجازت طلب کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لیے متعین نہیں ہوتا۔ گویا کہ اس نے اسے

جاہل رکھ کر ذلیل کیا ہے۔

۲۳ خازن کا قول ''کیا انہیں پیغام دے کر بھیجا گیا ہے؟ یہ دراصل یوں عبارت تھی: ''اَوَ قَدْ بُعِثَ اِلَیْہِ'' علماء نے کہا ہے کہ اس بعثت سے مراد رسالت نہیں ہے۔ آپ ﷺ ملکوت اعلیٰ میں معروف تھے۔ بلکہ اس سے مراد معراج کے لیے بلانا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اس نعمت الٰہیہ پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے یا خوش ہوتے ہوئے اس طرح کہا تھا۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ کوئی بشر اذنِ الٰہی کے بغیر اس قدر رفعت پر گامزن نہیں ہوسکتا۔ حضرت جبرائیل اسے لے کر نہیں جاتے جس کے لیے انہیں نہ بھیجا گیا ہو۔ خازن نے کہا: ''آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہے؟'' اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ حازن کو علم ہوگیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی ہستی ہے ورنہ سوال اس طرح ہوتا ''کیا آپ ﷺ کے ہمراہ کوئی ہے؟ یہ علم یا تو مشاہدہ سے ہوا تھا کیونکہ آسمان شفاف ہیں۔ یا امر معنوی کی وجہ سے تھا یعنی انوار زیادہ ہوگئے تھے۔ لہٰذا لازم تھا کہ حضرت جبرائیل کو اذن دیا جاتا اور دروازہ کھول دیا جاتا۔ خازن نے اتنا انتظار نہ کیا کہ اس پر دروازہ کھولنے کے لیے وحی کی جائے۔ کیونکہ اس کے لیے لازم تھا کہ جب آپ ﷺ کو سیر کے لیے بلایا گیا ہے تو دروازہ فوراً کھول دیا جائے۔ خازن نے کہا ''مرحبا'' اس میں یہ دلیل ہے کہ اگر ماتحتوں کو علم ہو جائے کہ ان کا سردار اور آقا کسی کی عزت کرنا چاہتا ہے تو ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اسے اس کی بشارت دے دیں۔ اگرچہ اس نے انہیں اس کا اذن نہ بھی دیا ہو۔ نہ ہی اس طرح راز افشاء ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ خازن خوب جانتا تھا کہ آپ ﷺ کو عزت واکرام کے لیے بلایا گیا ہے۔ اس نے آپ ﷺ کو جلدی بشارت دی۔ سچی فراست سے اسی طرح علم حاصل ہوتا ہے بشرطیکہ یہ اپنے اہل اور محل میں ہو جیسے اسے وحی سے علم حاصل ہوتا ہے۔

خازن نے آپ ﷺ کو غائب کے صیغہ سے مخاطب کیا۔ آپ ﷺ کو مخاطب کے صیغہ سے مرحبا نہ کہا۔ کیونکہ اس نے دروازہ کھولنے سے قبل آپ ﷺ کو مرحبا کہا تھا۔ حضور ﷺ کے مخاطب کرنے سے پہلے کہا تھا۔ اس لیے اس نے حضرت جبرائیل سے کہا

تھا'' آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہے؟ انہیں خطاب کے صیغہ سے مخاطب کیا۔ کیونکہ انہوں نے فرشتے کو خطاب کیا تھا۔ جانبین سے تخاطب کی وجہ سے غیب کا حکم اٹھ گیا تھا۔ شاید اس نے آپ ﷺ کو خطاب کے صیغہ کے بغیر آپ ﷺ کی تعظیم کرتے ہوئے آپ ﷺ کو خطاب کیا ہو۔ غائب کی ہاء بعض اوقات خطاب کے کاف سے زیادہ تعظیم کا اظہار کرتی ہے۔

﴿۳۲﴾ حضرت جبرائیل سے جب پوچھا گیا: ''آپ ﷺ کے ہمراہ کون ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا: ''(جانِ عالم، راحتِ جاں) محمد ﷺ۔ اس سے یہی علم ہوتا ہے کہ اسم کنیت سے زیادہ مقام رکھتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کا نام لیا تھا۔ کنیت نہیں کہی تھی۔ کیونکہ حضور ﷺ علوی اور سفلی سارے عالمین میں معروف تھے۔ اگر کنیت اسم سے زیادہ معزز ہوتی تو حضرت جبرائیل آپ ﷺ کی کنیت سے بتاتے۔

﴿۳۳﴾ ملائکہ نے کہا: ''وقد ارسل الیہ'' اس کے استفہام کے بارے ابن ابی جمرہ لکھتے ہیں: ''عالم علوی آپ ﷺ کی رسالت اور عظمت سے آگاہ تھے۔ کیونکہ رسالت کے وقت کے بارے سوال کیا۔ رسالت کے بارے سوال نہیں کیا۔ اسی لیے انہوں نے یہ جواب دیا: ''خوش آمدید! آنے والے کتنی شان کے مالک ہیں۔'' ان کا اس طرح کہنا یہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ فرشتے آپ ﷺ کی شانِ جلالت اور عظیم رفعت سے آشنا تھے۔ کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کو حسنِ خطاب سے مخاطب کیا تھا۔ علماء کرام نے رب تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر میں لکھا ہے۔

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ (النجم: ۱۸)

ترجمہ: ''یقیناً انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

آپ نے ملکوت میں اپنی مبارک صورت (سراپا) دیکھا تھا۔ وہ عالمین کا دلہا تھے۔

﴿۳۴﴾ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ آپ ﷺ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔'' یقیناً آپ ﷺ کا یہ سوال حضرت آدم علیہ السلام کے مرحبا کہنے کے بعد میں ہوگا'' حضرت مالک بن صعصعۃ کی

روایت اس کے برعکس ہے۔ وہی قابل اعتماد ہے۔ اسے اسی پر محمول کیا جائے گا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ترتیب نہیں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں استقبال کیا تھا "مرحبا بالابن الصالح"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باپ ہونے پر فخر تھا۔ بنو آدم کی ارواح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کی جاتی ہیں۔ اس سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ نار کی ارواح آسمان میں ہیں۔ قاضی نے اسے مشکل کہا ہے۔ کیونکہ احادیث میں ہے کہ مؤمنین کی ارواح جنت میں نعمتوں سے شادکام ہوتی ہیں۔ جبکہ کفار کی سجین میں ہوتی ہیں۔ وہ آسمان میں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ بعض اوقات یہ ارواح پیش کی جاتی ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت گزرے ہوں جب یہ ارواح پیش کی جارہی ہوں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا یہ فرمان ظاہر کرتا ہے کہ انہیں کسی وقت (صبح وشام) آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ (مومن:۴۶)

ترجمہ: "دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح وشام۔"

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ کفار کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے جیسے کہ نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ احتمال ہے کہ جنت حضرت آدم کے دائیں طرف اور آگ بائیں طرف ہو دونوں طرف سے ان کے لیے عیاں کر دیا جاتا ہو۔"

حافظ نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ نظر آنے والی ارواح ابھی تک اجسام میں داخل نہ ہوئی ہوں۔ انہیں اجسام سے قبل تخلیق کر دیا گیا ہو۔ ان کا ٹھکانہ حضرت آدم کے دائیں اور بائیں طرف ہو۔ انہیں بتایا گیا کہ عنقریب ان کا ٹھکانہ کیا ہوگا۔ اس لیے جب وہ اپنی دائیں طرف دیکھتے تو خوش ہو جاتے۔ جب بائیں طرف دیکھتے تو غمزدہ ہو جاتے۔ وہ ارواح جو اجسام میں ہیں۔ وہ قطعاً مراد نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ مراد ہیں جو اجسام سے جنت یا دوزخ کی طرف منتقل ہو چکی ہیں۔ یہ مراد بھی ختم ہوگئی۔ اس سے یہی عیاں ہوتا ہے

کہ ان سے عام مخصوص ارواح ہیں۔ یا ان سے خصوصی ارواح مراد لی گئی ہیں۔
الفتح میں معراج کے باب میں ہے: "اب میرے لیے ایک اور احتمال عیاں ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ارواح ہیں جو جسموں سے نکل چکی ہیں۔ وہ مستقر نہیں ہیں۔ آسمان دنیا میں حضرت آدم کا انہیں دیکھنا اس کو لازم نہیں کرتا کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہوں اور وہ اس میں داخل ہوتی ہوں۔ ابن اسحاق کی یہ روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ "میں حضرت آدم علیہ السلام کے پاس تھا۔ ان پر ان کی مؤمن اولاد کی ارواح پیش کی جارہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے "یہ پاکیزہ روح اور پاکیزہ نفس ہے۔ اسے علیین میں رکھ دو۔" پھر ان پر فاجروں کی ارواح پیش کی گئیں۔ انہوں نے کہا: "یہ خبیث روح اور خبیث نفس ہے۔ اسے سجین میں رکھ دو۔" حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے "ان کے دائیں طرف ایک دروازہ تھا جس سے عمدہ خوشبو آرہی تھی۔ ان کے بائیں طرف ایک دروازہ تھا جس سے خبیث بو آرہی تھی۔" اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کو اپنا لینا سب سے بہتر ہے۔ لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ لہٰذا اسے متقدم پر لازم نہیں کیا جاسکتا۔"

امام سہیلی نے لکھا ہے "اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ انہوں نے اپنے دائیں طرف اصحابِ یمین کو کیسے دیکھ لیا حالانکہ اس وقت ان کی تعداد قلیل تھی۔ شاید اس رات ان میں سے ایک بھی نہ مرا ہو۔ حالانکہ حدیث پاک کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ وہ پوری جماعت تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ سیر دل کی آنکھ کے ساتھ تھی تو اس کی تاویل یہ ہے کہ عنقریب ایسا ہوگا۔ اگر آنکھ کے مشاہدہ سے سیر ہو تو اس سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ایمان کی ارواح کو وہاں دیکھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی نیند کی وجہ سے اس پر موت طاری کر دیتا ہے۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (الزمر:۴۲)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا (ان کی روحیں) حالت نیند میں پھر روک لیتا ہے ان روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے اور واپس بھیج دیتا ہے دوسری روحوں کو مقررہ میعاد تک۔''

وہ ارواح اوپر چلی گئیں تھیں پھر اپنے اجسام میں واپس آ گئیں۔ ابن دحیہ نے لکھا ہے ''اگر کہا جائے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سارے سعادت مندوں کی ارواح آسمانوں میں ہوں۔ حالانکہ اس وقت کثیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دنیا میں موجود تھے۔ وہ سب سعادت مند تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں زمین میں ان کے مقامات پر دیکھ لیا تھا۔ لیکن انہیں اپنی دائیں سمت میں دیکھا۔ تقیید نظر کے لیے ہے۔ منظور کے لیے نہیں۔

حضرت جبرائیل امین نے کہا: ''یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باپ ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں سلام کریں۔ اس کا تقاضا یہ ہے آنے والا مقیم کو پہلے سلام کرے۔''

۳۷ شریک کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسمانِ دنیا میں دو رواں نہریں دیکھیں۔ یعنی نیل اور فرات۔ ان کی اصل ایک تھی۔ حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت میں اس کی مخالفت ہے۔ وہاں سدرۃ المنتہیٰ کے ذکر کے بعد ہے کہ اس کی اصل سے چار نہریں نکل رہی تھیں۔'' ان میں نیل اور فرات کا تذکرہ کیا۔ ان روایات کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ ان نہروں کا منبع سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے ہے۔ ان کا مقر آسمان دنیا ہے۔ وہ وہاں سے نیچے زمین پر نازل ہوتی ہیں۔

۳۸ شریک کی روایت میں ہے ''پھر حضور تاجدار حرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان دنیا پر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں ایک اور نہر ملاحظہ کی۔ وہاں موتی اور زبرجد کے محلات تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں دست اقدس مارا اس کی مٹی مشک اذفر کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''جبرائیل! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ''یہ وہ کوثر ہے جو رب تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کی ہے۔'' شریک کی روایت میں یہ اشکال ہے۔ کوثر جنت میں ہے جبکہ جنت ساتویں آسمان پر ہے۔ امام احمد نے حضرت انس سے روایت کیا

ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں جنت میں داخل ہوا۔ وہاں ایک نہر تھی۔ جس کے دونوں کناروں پر موتیوں کے خیمے تھے۔ میں نے پانی کے نیچے ہاتھ مارا تو اس کی تہ مشک اذفر کی تھی۔ حضرت جبرائیل امین نے عرض کی: ''یہ وہ کوثر ہے جو رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا کی ہے۔'' اس روایت کی اصل بخاری میں ہے انہوں نے اسے اپنی تفسیر میں حضرت انس سے روایت کیا ہے لیکن اس میں جنت کا ذکر نہیں ہے۔ ابوداؤد نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضور سیاح لامکان ﷺ کو سیر کرائی گئی تو جنت میں آپ ﷺ کو ایک نہر دکھائی گئی۔ حافظ نے لکھا ہے کہ شاید کچھ عبارت محذوف ہو۔ وہ یوں ہو'' پھر آپ آسمان دنیا سے سیر کرتے کرتے ساتویں آسمان تک جا پہنچے۔ وہاں ایک نہر ملاحظہ کی۔'' ان کے شاگرد حافظ قطب الدین الخیضری نے الخصائص میں لکھا ہے'' یہ بعید ہے کیونکہ پہلے آسمان اور ساتویں آسمان کے مابین دوسرے پانچ آسمان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے اوصاف دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ ان کے دروازے جداگانہ ہیں۔ ان کے خدام جداگانہ ہیں لیکن یوں کہا جا سکتا ہے کہ نہر کوثر کی اصل جنت میں ہے۔ رب تعالیٰ نے اس کی ایک شاخ کو آسمان دنیا میں رواں کر دیا تاکہ حضور اکرم ﷺ اسے جلدی دیکھ کر مسرور ہوں۔ کیونکہ یہ مراتب علویہ میں سے پہلا مرتبہ ہے۔ حضرت جبرائیل کی یہ عرض بھی اسی کی تائید کرتی ہے'' یہ آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کو عطا کی ہے۔''

- حضرت آدم علیہ السلام نے آپ ﷺ کا یوں استقبال کیا'' صالح فرزند اور صالح نبی کو خوش آمدید! یہ آپ ﷺ کی بہت خوبصورت تعریف ہے۔ صلاح کا دوبار تذکرہ نبوت کے ساتھ کیا۔ یعنی سارے انبیائے کرام علیہم السلام کے ہمراہ آپ ﷺ صالح ہیں۔ اس میں صلاح کی فضیلت اور اس کے بلند منصب کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ کا اس کے ساتھ وصف بیان کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ انبیائے کرام کی صلاح خاص صلاح ہوتی ہے جو صالحین کی عمومیت کو شامل نہیں ہوتی۔ بہت سارے انبیاء نے یہ تمنا کی ہے کہ وہ انہیں صالحین کے زمرہ میں شامل کر دے۔ اعلیٰ ادنیٰ

کے زمرہ میں آنے کی تمنا نہیں کرتا۔اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ امم کے صالحین کی صلاح سے نبوت اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صلاح جس کی نسبت انبیاء کی طرف کی جاتی ہے وہ اس صلاح سے علیحدہ ہے جس کی نسبت امم کی طرف کی جاتی ہے۔انبیاء کی صلاح کامل صلاح ہوتی ہے۔کیونکہ اس سے سارے فساد ختم ہو جاتے ہیں۔ان کے لیے مکمل صلاح ہوتی ہے۔ان سے کم مرتبہ لوگوں میں درجہ بہ درجہ صلاح ہوتی ہے۔اس سے جس قدر فساد زائل ہوگا۔اسی قدر صلاح کے لفظ کا اس پر اطلاق ہوگا۔انبیائے کرام نے آپ ﷺ کا وصفِ صلاح کا تذکرہ کیا کیونکہ یہ خیر کی ساری خصلتوں کو شامل ہے۔اسی لیے ہر ہر نبی نے آپ ﷺ کو اسی وصف سے یاد کیا۔صالح وہ ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کو پورا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا جامع مانع کلمہ ہے جو سارے اچھے خصائل کو شامل ہے اسی لیے کسی نے آپ ﷺ کو نبی صادق یا نبی امین کے ساتھ یاد نہیں کیا۔

◈ آپ ﷺ نے سود خوروں کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کے پیٹ پھولے ہوئے تھے یہ سزا گناہ کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔سود خور اپنا پیٹ اسی طرح بڑھاتا ہے جس طرح وہ حرام امور سے اپنا پیسہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔اس کے مال سے برکت اٹھادی جاتی ہے۔اس کے پیٹ میں ہوا بھر دی جاتی ہے۔وہ اس طرح کھڑا ہوتا ہے۔

كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ (البقرۃ:۲۷۵)

ترجمہ:"جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے چھو کر۔"

انہیں آلِ فرعون کے راستہ میں اس لیے رکھا گیا۔وہ ان پر سے صبح و شام گزرتے ہیں کیونکہ دیگر کفار کی بنسبت انہیں سخت عذاب ہو رہا ہے۔وہ ٹھہرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ان کے جہنم کے راستے میں ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس حیثیت سے کفار ان پر سے گزرتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے انہیں اس امر کے مابین رکھا ہے کہ وہ رک جائیں تو ان کے لیے بہتر ہو۔یا وہ زیادہ اصرار کریں اور انہیں جہنم کے سپرد کر دے۔یہ اس شخص کی صفت ہے جو آگ کے راستہ میں ہوگا۔ارشادِ ربانی ہے:

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ (البقرۃ:۲۷۵)

ترجمہ: ”پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے تو وہ (سود سے) رک گیا تو جائز ہے اس کے لیے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے پیٹ دیکھے جو گھروں کی طرح تھے جن میں سانپ تھے جو باہر سے نظر آتے تھے۔

۞ اگر یوں کہا جائے کہ سود خوروں کے یہ احوال جن کا تذکرہ آپ ﷺ نے کیا ہے اگر انہیں ان کے آخرت کے احوال سے تعبیر کیا جائے تو آل فرعون کو تو شدید عذاب میں داخل کر دیا گیا ہے۔ برزخ میں صبح و شام انہیں آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر حالت وہی ہو جس پر آپ ﷺ نے انہیں دیکھا ہے تو ان کے پیٹ کون سے تھے؟ حالانکہ وہ صرف ہڈیاں رہ گئے ہیں وہ بوسیدہ ہو چکے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں برزخ میں دیکھا۔ یہ ان کی ارواح کی حالت تھی۔ اس میں اس شخص کے موقف کی تصحیح ہے جو کہتا ہے کہ ارواح لطیف اجسام ہیں جو نعمتوں اور عذاب کے قابل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح میں ایسے آلام اور درد پیدا کر دیے ہیں جو پیٹ پھولنے سے ہوتا ہے حتیٰ کہ انہیں قدموں سے روندھا جاتا ہے۔ وہ کھڑے ہونے پر قادر نہیں ہیں۔ اس میں یہ دلیل نہیں ہے کہ انہیں آلِ فرعون سے شدید عذاب دیا جاتا ہے۔ البتہ اس میں یہ دلیل ہے کہ انہیں آلِ فرعون وہ کفار روندھتے ہیں جو سود خور نہیں تھے۔ وہ برزخ میں اسی طرح رہیں گے۔ حتیٰ کہ وہ روز حشر جب اٹھیں گے تو اس طرح ہوں گے جس طرح شیطان نے چھو کر انہیں مخبوط الحواس کر دیا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کا منادی یہ اعلان کرے گا۔

اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ (غافر:۴۶)

ترجمہ: ”داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں۔“

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان عورتوں کو دیکھا جو پستانوں کے بل لٹکائی گئی تھیں۔ یہ روا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی ارواح کو دیکھا ہو۔ ان میں ایسے درد پیدا کر دیے گئے ہوں جو اس حالت سے پیدا ہوتے ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے ان کی آخرت کے حالات کو مثالی شکل میں پیش کیا گیا ہو۔

◆ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَّرَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا۝ (مریم:۵۷)

ترجمہ: ''اور ہم نے بلند کیا تھا انہیں بڑے اونچے مقام تک۔''

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو دیکھا وہ ان سے بلند رتبہ تھے۔ حضرت کعب سے روایت کی گئی ہے کہ حضرت ادریس کو یہ خصوصیت دی گئی ہے کہ انہیں انکے وصال سے قبل چوتھے آسمان پر اٹھالیا گیا تھا۔ وہ فرشتہ انہیں اٹھا کر لے گیا تھا جو ان کا دوست تھا۔ وہ فرشتہ سورج کا نگران تھا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے انہیں کہا کہ وہ انہیں جنت کی سیر کرائیں۔ رب تعالیٰ نے اسے یہ اذن دے دیا۔ چوتھے آسمان پر انہوں نے موت کا فرشتہ دیکھا جسے دیکھ کر انہیں تعجب ہوا۔ اس نے کہا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ابھی حضرت ادریس علیہ السلام کی روح قبض کرلوں۔'' انہیں زندہ ہی اس بلند مقام تک لے جایا گیا جو ان کے ساتھ مختص تھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔

◆ علماء نے فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا یہ رونا حسد کی وجہ سے نہیں تھا۔ اس عالم میں کسی ایک عام مؤمن کے بارے حسد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے چیدہ چیدہ لوگوں کے بارے یہ تصور کیسے ہوسکتا ہے؟ بلکہ ان کا یہ گریہ اس اجر کی وجہ سے تھا جو ان کی امت کے اجر کے کم ہونے کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ ان کی امت نے بہت سے ایسے اعمال کیے تھے جن کی وجہ سے ان کا اجر کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہر نبی کو اس کے متبعین کا اجر بھی دیا جائے گا۔ ان کے پیروکار حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیروکاروں سے کم تھے۔ اگرچہ ان کی عمریں اس امت کی عمروں سے قلیل تھیں۔ ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے ''اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام علیہم السلام کے دلوں میں ان کی امتوں کے بارے رحم ڈال

دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ گریہ بار ہوئے۔ آپ ﷺ سے اس گریہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رحم کرنے والوں بندوں پر رحم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو اس کی رحمت سے وافر حصہ نصیب ہوا ہے۔ ان کے دلوں میں بندگانِ خدا کے لیے کثیر رحمت ہوتی ہے۔ اس لطف اور رحمت کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام رونے لگے تھے۔ یہ امت پر رحم کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ یہ فضل اور جود و کرم کا وقت تھا۔ انہوں نے امید کی کہ شاید قبولیت کے اس وقت کے طفیل رب تعالیٰ ان کی امت پر رحم کرے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ان کی امت دو حصوں میں منقسم ہے: (۱) وہ قسم جو ایمان پر مری ہے (۲) وہ امت جو کفر پر مری تھی۔ جو ایمان پر مرے تھے وہ لازماً جنتی تھے۔ جو کفر پر مرے تھے جنت ان کے لیے حرام تھی۔ جو وجہ تم نے ذکر کی ہے اس کی وجہ سے ان کا رونا درست نہیں۔ کیونکہ ان کے بارے حکم گزر چکا ہے۔ وہ نافذ ہو چکا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں اسی طرح دو حصوں میں منقسم کیا ہے جیسے کہ اس کی حکمت کا منشاء تھا ایک ایسی تقدیر تھی جو ہر حال میں نافذ ہو چکی تھی۔ دوسری تقدیر کا نفاذ نہیں ہوا تھا۔ جو کسی کی دعا یا صدقہ کے سبب نافذ ہونا تھی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کے لیے تین دعائیں مانگیں۔ وہ یہ دعائیں ہیں۔ (۱) اُن کا دشمن ان پر غالب نہ ہو۔ (۲) وہ انہیں قحط سالی سے ہلاک نہ کرے۔ یہ دونوں دعائیں قبول ہو گئیں۔ آپ نے تیسری دعا یہ مانگی کہ وہ ان کے مابین باہم خونریزی نہ کرے۔ یہ دعا قبول نہ ہوئی۔ آپ ﷺ سے کہا گیا ''یہ امر ایسا ہے جس کا نفاذ ہو چکا ہے۔'' پہلی دو دعائیں ایسی تھیں جن کا نفاذ آپ ﷺ کی دعا کے طفیل ہونا تھا۔ جبکہ تیسری دعا کا نفاذ ہر حال میں ہونا تھا۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اپنی امت پر بڑے شفیق اور لطیف تھے۔ انہوں نے سوچا کہ شاید رب تعالیٰ اس وقت دعا اور آہ زاری کے صدقہ ان کی امت کے مقدر کو تبدیل کر دے۔ کیونکہ وہ وقت لطف و احسان کا وقت تھا۔ کیونکہ یہ اس کے حبیب مکرم ﷺ کی سیر کا وقت تھا۔ تا کہ وہ انہیں

قرب اور فضل عمیم کی خلعتیں زیبِ تن کرے۔ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے سوچا کہ شاید ان کی امت کو بھی اس وقت کچھ حصہ مل جائے۔

اس کی ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے وہ یہ کہ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر مسرور ہوئے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے تو وہ رونے لگے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریب ہی تھے۔ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سماعت فرمالیں۔ اگر اس گریہ کا تعلق صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تو وہ اس وقت روتے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے دور چلے جاتے۔ کیونکہ ان کا رونا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سماعت فرمانے میں ان کے لیے آسانی تھی۔ کیونکہ اس سے اس بشارت کو عیاں کرنا تھا جو ان کے رونے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سماعت کرنے میں تھی۔ وہ بشارت حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا یہ فرمان ہے: ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میری امت سے زیادہ جنت میں داخل ہوگی۔'' نماز کے بارے بھی اس امت کے حق میں اس رعایت کا ظہور ہوا جو کسی اور سے نہ ہوا۔ حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے۔ ''جب میں حضرت موسیٰ کے پاس سے گزرا تو وہ مجھ پر بڑے شدید تھے۔ جب میں ان کے پاس آیا تو وہ میری امت کے لیے بہت بہتر ثابت ہوئے۔'' حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں واپس آیا میں موسیٰ کے پاس سے گزرا۔ وہ تمہارے لیے بہترین ساتھی ثابت ہوئے۔''

◆ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان کہ ایک لڑکا...... از روئے تنقیص نہ تھا۔ بلکہ یہ رب تعالیٰ کے عظیم کرم اور قدرت کا اظہار تھا۔ کیونکہ اس عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ کچھ عطا کیا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل کسی نبی کو بھی عطا نہیں کیا گیا تھا جس کی عمر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک عمر سے زیادہ تھی۔ علامہ خطابی نے لکھا ہے ''آدمی کو اس وقت غلام کہا جاتا ہے جب بڑھاپے کے باوجود قوت پائی جائے۔'' ابن جمرہ نے لکھا ہے ''اہلِ عرب آدمی کو اس وقت غلام کہتے تھے جب وہ ان میں سردار ہوتا تھا۔ لہٰذا اس لفظ میں افضلیت کے دیگر الفاظ سے زیادہ اختصاص پایا جاتا ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہی لفظ

استعمال کیا۔ حافظ نے لکھا ہے "ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے اس نعمت کی طرف اشارہ کیا تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک زیادہ ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد اطہر میں بڑھاپا داخل نہ ہوا۔ نہ ہی قوت میں کمی واقع ہوئی۔ حتیٰ کہ جب ہجرت کے وقت اہلِ مدینہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو آپ کو جوان اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بوڑھا کہا۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عمر سے زیادہ تھی۔

- ۲۵ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے کہا: "میرا گمان نہیں تھا کہ رب تعالیٰ نے کسی اور کو مجھ سے بلند مرتبت کیا ہوگا۔" اس کے بارے ابن بطال نے لکھا ہے "حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے یہ اس لیے سمجھا تھا کیونکہ رب تعالیٰ نے دنیا میں ان کے ساتھ کلام فرمایا تھا۔" ارشاد فرمایا:

إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي (اعراف: ۱۴۴)

ترجمہ: "میں نے سرفراز کیا ہے تجھے تمام لوگوں پر اپنی پیغامبری سے اور اپنے کلام سے۔"

اس جگہ "الناس" سے مراد سارے انسان ہیں۔ وہ اس وجہ سے مستحق تھے کہ کسی کو ان سے بلند مرتبہ نہ دیا جاتا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مقام محمود عطا کیا تو آپ حضرت کلیم سے بلند مرتبہ ہو گئے۔

- ۲۶ ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے "ظاہر ہے کہ وہ ذات جس نے حضرت موسیٰ سے پوچھا تھا "ابکاك" رب تعالیٰ کی ذات تھی۔ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کا جواب اسی پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے عرض کی: "مولا! اس ہستی کو تو نے میرے بعد بھیجا ہے۔ میری امت سے زیادہ ان کی امت جنت میں داخل ہوگی۔"

- ۲۷ اکثر روایات میں ہے کہ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام ساتویں آسمان پر تھے۔ یہ رب تعالیٰ کے اس فرمان سے مطابقت رکھتا ہے۔

إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي (اعراف: ۱۴۴)

ترجمہ: "میں نے سرفراز کیا ہے تجھے تمام لوگوں پر اپنی پیغامبری سے اور اپنے کلام سے۔"

یہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ حضرت شریک نے کہا ہے کہ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام سے

آپ کی ملاقات ساتویں آسمان پر ہوئی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ان کی موافقت کرتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''آپ نے آسمانوں میں حضرت آدم، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام سے ملاقات کی۔ انہوں نے ان کی ملاقات کی جگہ کا تعین نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت آدم نے آپ سے آسمان دنیا پر اور حضرت ابراہیم سے چھٹے آسمان پر ملاقات کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ملاقات متعدد بار ہوئی تھی تو پھر تو کوئی اشکال نہیں۔ اگر یہ مؤقف اختیار نہ کیا جائے تو پھر ان روایات کو اس طرح جمع کیا جائے گا کہ حضرت موسیٰ حالت عروج میں چھٹے آسمان پر تھے اور حضرت ابراہیم ساتویں آسمان پر تھے۔ جبکہ واپسی پر حضرت کلیم اللہ ساتویں آسمان پر تھے۔ کیونکہ اس طرح کی کوئی روایت نہیں جس میں تذکرہ ہو کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نماز کے بارے گفتگو کی ہو جس طرح حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے گفتگو کی تھی۔ واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے پہلے ساتویں آسمان پر آئے۔ اس آسمان پر ہی حضرت کلیم اللہ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت کلیم اللہ سے چھٹے آسمان پر ملاقات کی ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ انہیں ساتویں آسمان پر لے جایا گیا ہو۔ کیونکہ وہ کلامِ الٰہی سے مشرف ہو چکے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امت مرحومہ کی نماز کے بارے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کر لی۔

٢٨ حضرت شریک نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''ہر آسمان پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کسی نہ کسی نبی سے ہوئی۔ حضرت انس نے سب کے نام لیے تھے مگر مجھے صرف یہ یاد رہا کہ دوسرے آسمان پر حضرت ادریس سے اور چوتھے آسمان پر حضرت ہارون سے، پانچویں آسمان پر نہ جانے کس سے جبکہ چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں آسمان پر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت انس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''تذکرہ کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسمانوں میں حضرات آدم، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم

علیہم السلام سے ملاقات کی۔''لیکن انہوں نے ان کے مقامات کو ثابت نہیں کیا۔سوائے اس کے کہ حضرت آدم کو آسمان دنیا پر پایا۔حضرت ابراہیم سے چھٹے آسمان پر ملاقات کی۔'' یہ روایت شریک کی روایت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔لیکن یہ دونوں اس روایت کی مخالفت کرتے ہیں جو قتادہ نے حضرت انس سے اور انہوں نے حضرت ابن صنصعہ سے روایت کی ہے۔اکثر نے ان کی موافقت کی ہے۔سیاق بھی ان کی روایت کے رجحان پر دلالت کرتا ہے۔انہوں نے ہر اس نبی اور اس کے مقام کا نام لیا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی۔حضرت ثابت نے حضرت انس سے اسی طرح روایت کی ہے۔امام مسلم نے ان سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''پھر مجھے اوپر لے جایا گیا۔حتیٰ کہ دوسرا آسمان آگیا۔وہاں حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام موجود تھے۔یہ دونوں خالہ زاد تھے۔انہوں نے تذکرہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیسرے آسمان پر حضرت یوسف سے،چوتھے پر حضرت ادریس سے،پانچویں پر حضرت ہارون سے۔چھٹے پر حضرت موسیٰ سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہم السلام سے ملاقات کی۔لیکن حضرت انس نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے۔لیکن انہوں نے ان کے نام نہیں لیے۔شریک کی روایت میں ان کے مقامات کا تعین نہیں۔بلاشبہ جنہوں نے اسماء اور مقامات کا تذکرہ کیا ہے ان کی روایت بہتر ہے۔حضرت قتادہ اور حضرت ثابت کی روایت میں اتفاق بھی ہے۔

یزید بن ابی مالک نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔البتہ انہوں نے حضرات ادریس اور ہارون علیہما السلام کے بارے ان کی مخالفت کی ہے۔انہوں نے کہا:''حضرت ہارون چوتھے جبکہ حضرت ادریس نے پانچویں آسمان پر ملاقات کی۔حضرت ابوسعید خدری نے اسی طرح روایت کیا ہے۔لیکن انہوں نے کہا ہے:''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت یوسف کو دوسرے آسمان پر اور حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کو تیسرے آسمان پر دیکھا۔پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے ارجح روایت ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر تھے۔کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا کہ

وہ بیت المعمور کے ساتھ ٹیک لگائے تھے۔ بیت المعمور ساتویں آسمان پر ہی ہے۔ جو روایت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ بیت المعمور چھٹے آسمان پر شجرۃ طوبیٰ کے پاس ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو اسے اس بیت المعمور پر محمول کیا جائے گا۔ جو چھٹے آسمان پر شجرۃ طوبیٰ کے پاس ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ ہر آسمان پر ایک بیت اللہ ہے جو عین خانہ کعبہ کے اوپر ہے۔ ہر بیت اللہ فرشتوں سے بھرا رہتا ہے۔ حضرت ربیع بن انس سے روایت ہے کہ بیت المعمور آسمان پر ہے۔

۴۹ متکلمین نے ان انبیاء اور ان کے مقامات کے بارے گفتگو کی ہے جنہوں نے مختلف آسمانوں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی۔ بعض علماء نے اس پر بالکل گفتگو نہیں کی۔ بعض نے ان کے بارے گفتگو کی ہے۔ پھر انہوں نے باہم اختلاف کیا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ جن انبیاء کرام کا ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی ان کا تذکرہ لوگوں کے عرف کے مطابق کیا گیا ہے۔ جب وہ کسی آنے والے کا استقبال کریں اور جلدی جلدی اس کی ملاقات کے لیے جائیں۔ یقیناً ان میں سے بعض دوسروں پر سبقت لے جائیں گے۔ بعض نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کر لی اور بعض نے ملاقات نہ کی۔ ابن بطال کا یہی رجحان ہے۔ امام سہیلی نے ان کا یہ موقف باطل قرار دیا ہے۔ ابن بطال کے علاوہ دیگر علماء نے لکھا ہے کہ یہ ان خاص حالات پر تنبیہ ہے جو ان انبیاء کرام کے ساتھ مختص ہیں کہ ایسے حالات کا عنقریب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی سامنا کرنا پڑے گا جیسے کہ رب تعالیٰ نے ان کا تذکرہ کلام مقدس میں کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمدہ فال کو پسند کرتے تھے۔ نیند میں خواب کی مثال عالم بیداری میں فال کی طرح ہے۔ اہلِ تعبیر کہتے ہیں کہ جس نے خواب میں کسی نبی کی زیارت کی تو اس کی شدت یا نرمی یا دیگر امور میں اس کی کیفیت بالکل اسی طرح ہوگی جیسے کہ قرآن پاک اور احادیثِ طیبہ میں ان کا تذکرہ ہے۔

ابن ابی جمرۃ نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے آسمانِ دنیا پر ملاقات کی۔ کیونکہ وہ اول الانبیاء اور اول آباء ہیں۔ وہ اصل ہیں۔ وہ اولی میں سے اول ہیں۔ اس لیے

انہوں نے نبوت کو ابوت کے ساتھ ملایا۔

امام سہیلی نے لکھا ہے: ''حضرت آدم علیہ السلام کی ملاقات میں یہ تنبیہ ہے انہیں جنت سے نکال کر زمین میں بھیجا گیا۔ عنقریب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے جانا تھا۔ اس میں یہ مشقت اور کراہت مشترک ہے۔ جو ان حضرات قدسیہ کو وطن کے فراق میں برداشت کرنا پڑی۔ پھر ان میں سے ہر ایک اپنے اس وطن لوٹ آیا جس سے اسے نکالا گیا تھا۔

ابن دحیۃ نے لکھا ہے: ''یہ اس بات پہ تنبیہ ہے کہ ہجرت کے ابتدائی سالوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت آدم جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ حضرت آدم نے اپنی اولاد کے ساتھ دنیا کو آباد کیا تھا۔ اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے پہلے سال اسلام کو ترقی دی۔ اہلِ اسلام کی تربیت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کے ساتھ اتحاد کیا تاکہ اس دین کے ساتھ اس ساری زمین کو آباد کریں جس کو رب تعالیٰ نے سارے ادیان پر غلبہ دینا تھا۔ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے زمین کو سمیٹ دیا گیا۔ حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین کے مشارق اور مغارب کو دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی سلطنت اس جگہ تک پہنچے گی جو میرے لیے سمیٹی گئی۔ یہ بشارت ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں پوری ہوئی حتیٰ کہ شرق و غرب کا خراج اس کے پاس آتا تھا۔ جب بادل چھاتا تو وہ کہتا ''جہاں چاہو برسو۔ تمہارا اخراج میرے پاس ہی آئے گا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات کی۔ یہودی ان کی آزمائش بنے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی۔ انہیں شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اوپر اٹھا لیا۔ حضرت یحییٰ کو انہوں نے شہید کر دیا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسری آزمائش سے گزرنا یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہاں یہودیوں کے ساتھ آزمایا گیا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غالب آنے کی کوشش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پتھر گرانے کی کوشش کی تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

اسی طرح بچالیا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچایا تھا۔انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بکری کے گوشت میں زہر دینے کی کوشش کی۔ وہ لقمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمیشہ اذیت دیتا رہا حتیٰ کہ تادم وصال اس کی اذیت ہوتی رہی جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصال کے وقت فرمایا تھا۔ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے کہ یہ دونوں انبیاء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد ہمایوں کے قریب ہی گزرے تھے۔

ابن دحیہ نے لکھا ہے ”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حالت یہ تھی کہ وہ بنواسرائیل کے ساتھ مصروف جہاد رہے۔ان کی اذیتوں، حیلوں اور مکروفریب پر صبر کیا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے خلاف یوں مدد مانگی۔

مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِؕ (آلِ عمران:۵۱)

ترجمہ:”کون میرے مددگار ہیں اللہ کی راہ میں۔“

قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِۚ (آلِ عمران:۵۱)

ترجمہ:”(یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی۔“

ہجرت کے دوسرے سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے حالات سے گزرنا پڑا۔اس سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کو غزوہ بدر کی طرف نکلنے کی دعوت دی۔انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کی۔ دوسرے آسمان پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی۔یہ اس امر پر تنبیہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عنقریب ان جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کی۔یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیسری حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات کے مشابہ ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں گھر سے نکال دیا۔پھر وہ اپنے بھائیوں پر فتح یاب ہوئے۔انہوں نے انہیں یہ کہہ کر معاف کر دیا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ٘ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۝۹۲

(یوسف:۹۲)

ترجمہ: ''نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرمادے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں کو) وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔''

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کو ان کی قوم نے وطن سے باہر نکالا۔ غزوۂ فتح کے روز ان پر غلبہ پالیا اور انہیں معاف کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں اسی طرح کہتا ہوں جس طرح میرے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا: ''لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ...''

ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ان کی صورت میں جنت میں داخل ہوگی۔ ابن اقرص نے لکھا ہے کہ اس میں یہ اشارۃ بھی ہے کہ رب تعالیٰ آپ ﷺ کو زمین کے خزانوں کا مالک بنا دے گا۔ ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کرنے میں یہ مناسبت بھی ہے کہ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد رونما ہوا۔ مسلمانوں کو اس جیسی آزمائش نہ اس سے قبل اور نہ بعد میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ غم اور حزن کی داستان تھی۔ اہلِ تعبیر کہتے ہیں: ''جس شخص نے خواب میں اپنا نام یوسف دیکھا تو اسے دکھ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ مادۂ اشتقاق کی حیثیت سے ہے۔ ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا انجام بہت عمدہ تھا۔ ان کا ہر اگلہ لمحہ پہلے لمحہ سے عمدہ تھا۔ غزوۂ احد میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ حضور ﷺ شہید ہو چکے ہیں جسے سن کر مسلمانوں کو بہت زیادہ دکھ ہوا۔ جیسے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے مفقود ہونے پر دکھ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ طویل مدت کے بعد انہوں نے اس کی خوشبو پائی۔ ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مکر و فریب کیا گیا۔ انہیں تاریک کنویں میں پھینک دیا گیا حتیٰ کہ رب تعالیٰ نے انہیں بچالیا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی جبین اطہر پر پتھر لگا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ پہلو کے بل اس گڑھے میں گر پڑے جو ابو عامر فاسق نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے کھودے تھے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ حضرت طلحہ نے آپ ﷺ کا سر اقدس اپنی گود میں رکھا حتیٰ کہ آپ ﷺ سو گئے۔

امام سہیلی نے لکھا ہے"چوتھے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوئی۔ اسی جگہ کو رب تعالیٰ نے "مکانًا علیًا" سے تعبیر فرمایا ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ذریعے لکھا۔ اس سے آپ ﷺ کی چوتھی حالت سے آگہی ہوتی ہے۔ وہ آپ ﷺ کی علو شان ہے۔ حتیٰ کہ بادشاہ بھی آپ ﷺ سے ڈرنے لگے۔ آپ ﷺ نے ان کی طرف خطوط لکھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف دعوت دی۔ حتیٰ کہ ابوسفیان نے اس وقت کہا جب وہ ہرقل کے پاس تھا۔ جب اس کے پاس آپ ﷺ کا گرامی نامہ پہنچا اور اس نے ہرقل کا خوف دیکھا "ابن ابی کبشہ (حضور اکرم ﷺ) کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے حتیٰ کہ بنواصفر کا بادشاہ بھی اس سے ڈرنے لگا ہے۔ آپ ﷺ نے قلم کے ذریعے ساری زمین کے بادشاہوں کو خطوط لکھے۔ بعض نے آپ ﷺ کی اتباع کر لی جیسے نجاشی اور عمان کا بادشاہ۔ بعض نے آپ ﷺ کے ساتھ صلح کر لی۔ آپ ﷺ کو تحائف بھیجے جیسے ہرقل اور مقوقس۔ جس نے نافرمانی کی رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس پر غلبہ عطا فرما دیا۔ یہ بلند مرتبت مقام ہے۔ آپ ﷺ نے قلم کے ساتھ اس طرح لکھا (لکھوایا) جیسے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نے لکھا تھا۔

پانچویں آسمان پر آپ ﷺ نے حضرت ہارون علیہ السلام سے ملاقات کی۔ وہ اپنی قوم کے محبوب تھے۔ اس سے قریش کی اور سارے عرب کی آپ ﷺ کے لیے محبت عیاں ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ پہلے آپ ﷺ سے بغض رکھتے تھے۔ ابن ابی جمرۃ لکھتے ہیں "حضرت ہارون علیہ السلام نے پانچویں آسمان پر آپ ﷺ سے ملاقات کی۔ کیونکہ انہیں حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کا قرب حاصل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلامِ الٰہی سے مشرف ہونے کی وجہ سے بلند منصب پر فائز تھے۔" ابن دحیہ نے لکھا ہے "حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی قوم سے اذیتیں برداشت کیں۔ ان سے انتقام لیا۔ ان کی توبہ کے لیے انہیں ایک دوسرے کو قتل کرنا لازم قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کلیم اللہ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو بنواسرائیل کے پاس چھوڑ گئے اور مناجات کے لیے کوہِ طور پر تشریف لے

گئے۔انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام سے اختلاف کیا۔مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ انہیں قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔انہوں نے عہد توڑا۔وعدہ خلافی کی۔انہیں کمزور کیا۔ان سے بہت بڑا قصور سرزد ہو گیا۔انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی۔رب تعالیٰ نے صرف قتل کے ساتھ ان کی توبہ قبول کی۔ایک ساعت میں ان کے ستر ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ میں اس کی مثال وہ امور ہیں جن کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر کے یہودیوں سے کرنا پڑا۔انہوں نے عہد کو توڑا۔مختلف پارٹیاں بنائیں۔انہیں جمع کیا۔لوگوں کو اکٹھا کیا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عداوت کا اظہار کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا۔اس واقعہ سے کچھ مدت قبل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس گئے تاکہ آپ دو مقتولوں کی دیت میں ان سے تعاون کے لیے کہیں۔ انہوں نے بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت کی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیوار کے نیچے بٹھایا۔پھر آپ پر چکی پھینکنے کا ارادہ کیا۔حضرت جبرائیل نازل ہوئے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے مکروفریب سے آگاہ کیا جو انہوں نے ارادہ کیا تھا۔اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ جنگ کرنے اور انہیں تہ تیغ کرنے کا عزم کیا۔

رب تعالیٰ نے انہیں قتل کر دیا۔بنو قریظہ کو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی ثالثی میں قتل کر دیا گیا۔برے مکر نے انہیں ہی گھیر لیا۔یہودیوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اسی طرح کمزور سمجھا جیسے غزوۂ خندق میں مسلمانوں کو کمزور سمجھا۔

چھٹے آسمان پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے ملاقات کی۔یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حالت کے ساتھ مشابہت ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شام پر حملہ کیا۔جابر بادشاہوں پر غلبہ پالیا۔بنو اسرائیل کو اس شہر میں داخل کر دیا جس سے وہ باہر نکلے تھے۔اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک پر حملہ کیا۔صاحب دومۃ پر غلبہ پالیا۔حتیٰ کہ جزیہ پر اس کے ساتھ صلح کر لی۔اسے قیدی کی شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ چھٹے آسمان پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت کلیم اللہ علیہ السلام سے ملاقات کی۔اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم کی مخالفت کا اشارہ ملتا ہے۔حضرت موسیٰ کلیم

اللہ علیہ السلام کو اپنی قوم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔انہوں نے ان کی اذیتوں پر صبر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کے ساتویں سال جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اس سے قبل اتنی مخالفت کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر، فدک اور یہدیوں کے سارے قلعے فتح کیے۔رب تعالیٰ نے ان کے مقدر میں جلاوطنی لکھ دی۔انہیں مصیبت کے چھانٹے سے مارا۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔انہوں نے سرزمین مقدسہ میں شریعت نافذ کرنے کا ارادہ کیا۔اپنی قوم کو اس پر ابھارا مگر انہوں نے سستی کا مظاہرہ کیا۔انہوں نے کہا:''وہاں جبارین کی قوم ہے۔ہم کبھی بھی اس میں داخل نہیں ہوں گے حتیٰ کہ وہ خود وہاں سے باہر نکل آئیں۔''حتیٰ کہ انہوں نے بالکل مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:''ہم اس میں کبھی بھی داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ وہاں ہیں۔''رب تعالیٰ ان سے ناراض ہوا۔وہ ان کے اور اس زمین کے مابین حائل ہوگیا۔انہیں میدانِ تیہ میں پھینک دیا۔ہجرت کے چھٹے سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارادہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں۔وہاں شریعت مطہرہ اور سنت ابراہیمی کا نفاذ کریں۔قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روک دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سال مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہو سکے۔اس لیے اس جگہ آپ کی ملاقات حضرت کلیم علیہ السلام سے ہوئی۔

ساتویں آسمان پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔اس میں دو حکمتیں کارفرما ہیں۔(۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بیت المعمور کے پاس دیکھا۔وہ اس کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔یہ گھر بالکل خانہ کعبہ کے اوپر ہے۔فرشتے اس کا حج کرتے ہیں۔جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا۔لوگوں میں اعلان کیا کہ وہ آ کر اس کا حج کریں۔(۲) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ ظاہری کے آخری احوال میں سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ کا حج کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ستر ہزار صحابہ کرام تھے۔ اگر کوئی شخص حضرت ابراہیم کو خواب میں دیکھے تو یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ اسے حج کی سعادت نصیب ہوگی۔کیونکہ وہ ہی حج کے داعی ہیں اور بیت اللہ کی بنیادیں انہوں

نے ہی اٹھائی ہیں۔

ابن جمرۃ نے لکھا ہے "آپ ﷺ نے ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی۔ کیونکہ وہ آپ ﷺ کے اب اخیر تھے۔ تاکہ آپ ﷺ ان کے ساتھ ملاقات کر کے انس حاصل کریں۔ کیونکہ اس کے بعد دوسرے عالم کی طرف جانا تھا۔ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے منصب کا تقاضا تھا کہ انہیں بلند مرتبہ نصیب ہو۔ حبیب کا مقام خلیل سے ارفع ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ قاب قوسین کے مقام تک پہنچے۔" ابن دحیہ نے لکھا ہے: "آپ ﷺ نے ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مناسبت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ہجرت کے ساتویں سال عمرۃ قضاء کیا۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام لبیک کا ترانہ الاپتے ہوئے سنت ابراہیمی زندہ کرتے ہوئے اور اس رسم کو قائم کرتے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے۔ جاہلیت نے جس کا تذکرہ بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کا معاملہ تبدیل ہو چکا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابراہیم کو دیکھا کہ وہ ساتویں آسمان پر بیت المعمور سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ آپ ﷺ ساتویں سال بیت اللہ کا طواف کریں گے۔ ہجرت کے بعد آپ ﷺ پہلی بار مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ خانہ کعبہ بیت المعمور کے بالکل نیچے ہے۔ آپ ﷺ نے بیت المعمور کے وصف میں فرمایا: "ہر روز اس میں ستر ہزار ملائکہ داخل ہوتے ہیں۔ جن کی دوبارہ باری نہیں آتی۔" یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوں گے۔ پھر اس کی طرف نہیں لوٹیں گے حتیٰ کہ آپ ﷺ فتح مکہ کے سال اور حجۃ الوداع کے وقت اس میں داخل ہوئے۔

۵۵ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپ ﷺ نے بیت المقدس میں انبیاء کرام کو امامت کرائی۔ انہیں سلام کیا۔ آپ ﷺ نے انہیں پہچان لیا۔ پھر اسی رات انہیں آسمانوں پر دیکھا تو حضرت جبرائیل سے ان کے بارے سوال کیا۔ اگر آپ انہیں دیکھ لیتے اور انہیں پہچان لیتے تو آپ ﷺ کو ضرورت نہ تھی کہ آپ ان کے بارے حضرت جبرائیل سے سوال کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انبیاء کرام آپ ﷺ کے ہمراہ

بیت المقدس میں جمع ہوئے آپ ﷺ نے بیئت بشریہ پر ان کی امامت کرائی۔ تو ان کا وجود زمین پر متحقق ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ علوی ملکوت پر تشریف لے گئے۔ انہیں اس حالت پر نہ پایا جس پر انہیں دیکھا تھا۔ وہ ان روحانی اشکال پر تھے جو رب تعالیٰ نے ملکوت علوی کے مطابق انہیں عطا کیں تھیں۔ یہ ان کے بشری اصل سے انس اور ان کی تکریم و تعظیم کے لیے تھا کہ آپ ﷺ نے پہلے انہیں زمین پر دیکھا پھر آسمان پر انہیں ان کے مقامات پر دیکھا۔ آپ ﷺ نے وثوق کے لیے نہ کہ تعجب کے لیے پوچھا تھا کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ وہ ذاتِ باری تعالیٰ جس نے ایک لمحہ میں آپ ﷺ کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو آنکھ جھپکنے سے قبل آسمانوں پر لے جا سکتی ہے۔

۱۵ اگر اعتراض کیا جائے کہ آپ ﷺ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو آسمانوں پر کیسے دیکھ لیا حالانکہ ان کے اجسام تو ان کی قبور میں تھے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ان کی ارواح نے ان کے اجسام کی صورتوں کی شکلیں بنا لیں تھیں۔ یا انبیاء کرام کے اجسام کو آپ ﷺ کی عزت و تکریم کی خاطر اس رات کو وہاں حاضر کیا گیا۔ امام بیہقی کی یہ روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ ”آپ ﷺ کو حضرت آدم اور ان کے علاوہ سارے انبیاء علیہم السلام کو جمع کیا گیا۔“ ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے کہ ان انبیاء کرام کو دیکھنا کئی وجوہ کا اعتبار رکھتا ہے۔

① آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر نبی کو اس کی قبر انور میں دیکھا۔ اس شکل و صورت میں دیکھا جس کے بارے آپ ﷺ کو بتایا گیا تھا۔ اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو بصر و بصیرت کی اتنی قوت عطا فرمائی تھی جس سے آپ نے ان کا ادراک کر لیا۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان اس پر دلالت کرتا ہے۔ میں نے دیوار کی جانب میں جنت اور آگ کو دیکھا“ یہ دو وجوہ کا احتمال رکھتا ہے: (۱) آپ ﷺ نے انہیں اس جگہ دیکھا ہو جیسے کہا جاتا ہے: ”میں نے اپنے گھر کے طاق سے چاند دیکھا۔ اس سے مراد طاق کی جگہ ہے۔“ (۲) آپ ﷺ کے لیے دیوار کی ایک طرف میں ان کی تمثیل پیش کی گئی۔ قدرت

دونوں امور پر قادر ہے۔

۲ یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انبیائے کرام کی ارواح کو ان کی صورتوں میں دیکھا ہو۔

۳ جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج کرانا چاہا تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت وتوقیر کے لیے انہیں ان کی قبور سے اٹھایا۔ حتیٰ کہ ان کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشارت اور انس حاصل ہو گیا۔ بعض کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے اور بعض کی طرف ہم نے اشارہ نہیں کیا۔ نہ ہی ہم انہیں جانتے ہیں۔ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس قدرت کا اظہار ہو سکے۔ جس پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی۔ نہ ہی وہ کسی امر سے عاجز ہے۔ ان سارے وجوہ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ کسی ایک کو دوسری پر ترجیح نہیں دی جا سکتی کیونکہ قدرت ان سب پر قادر ہے۔

ابن قیم نے کتاب الروح میں لکھا ہے ''ارواح کی دو اقسام ہیں: (۱) وہ روح جسے عذاب دیا جاتا ہے (۲) وہ روح جس پر انعام کیا جاتا ہے۔ وہ روح جسے عذاب دیا جا رہا ہوتا ہے وہ عذاب کی وجہ سے نہ زیارت کر سکتی ہے نہ ہی ملاقات۔ جب کہ وہ روح جس پر انعام ہو رہا ہوتا ہے وہ مقید نہیں ہوتی بلکہ آزاد ہوتی ہے۔ وہ ملاقات کر سکتی ہے، زیارت کر سکتی ہے۔ وہ یاد کر سکتی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوگا اور جو کچھ ہوا۔ اس کے ہمراہ ہر وہ روح ہوتی ہے جس کے اعمال اس جیسے ہوتے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح رفیق اعلیٰ میں ہے ارشاد ربانی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (النساء:۶۹)

ترجمہ: ''اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ کی اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔''

یہ معیت دنیا، دارِ برزخ اور دارِ جزاء میں ثابت ہے۔ انسان اسی کے ہمراہ ہوگا جس

سے محبت کرتا ہے۔ پھر انہوں نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے منقول روایت کا تذکرۃ کیا۔ ”جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات کی۔ انہوں نے قیامت کے بارے گفتگو کی۔ اس نص سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارواح علم کا مذاکرہ کرتی ہیں۔ رب تعالیٰ نے شہداء کے بارے بتایا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں رب تعالیٰ کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔ وہ رب تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل پر مسرور رہو رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ملاقات تین اعتبار سے ہوتی ہے۔

(۱) وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زندہ ہیں۔ جب وہ اس کے ہاں زندہ ہیں تو وہ ملاقات کرتے ہیں۔ (۲) وہ اپنے بھائیوں سے ملاقات کر کے خوش ہوتے ہیں۔ (۳) یَسْتَبْشِرُوْنَ کا لغت میں معنی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بشارت دے رہے ہوتے ہیں...... پھر انہوں نے بہت سی خوابوں کا تذکرہ کیا ہے پھر لکھتے ہیں:

”صریح روایت سے ثابت ہے کہ ارواح باہم ملاقات کرتی ہیں اور باہم پہچانتی ہیں۔ ابن ابی الدنیا نے عبد الرحمان بن ابی انیسہ سے اور انہوں نے اپنے دادا جان سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو ان کی والدہ کو ان کا بڑا صدمہ ہوا۔ انہوں نے عرض کی: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! بنوسلمۃ میں لگا تار افراد کا وصال ہوتا جا رہا ہے۔ کیا مرنے والے ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں کہ میں بشر کو اپنا سلام بھیج دوں۔“ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں! ام بشر! مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ وہ باہم یوں تعارف رکھتے ہیں جیسے درخت کے سروں پر پرندے ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں...... انہوں نے اس زمرۃ میں بہت سے آثار کا تذکرۃ کیا۔ پھر لکھا: ”روح بنفسہا قائم ذات ہے جو اوپر چڑھتی ہے، نیچے اترتی ہے، جو ملتی ہے، جدا ہوتی ہے، جو آتی جاتی ہے، وہ حرکت کرتی ہے، پرسکون ہوتی ہے۔ اس کے ایک سو سے زائد دلائل ہیں جسے ہم نے اپنی کتاب معرفۃ الروح والنفس میں ذکر کر دیا ہے۔ ہم نے وہاں اس شخص کا دعویٰ باطل ثابت کیا ہے جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔ جس نے اس کے علاوہ کسی اور موقف کو اپنایا اس نے اپنا

نفس نہ پہچانا۔ رب تعالیٰ کی ارواح کا وصف دخول، خروج، قبض اور رجوع سے فرمایا ہے۔ ان کے آسمان پر چڑھنے ان کے لیے آسمان کے دروازے کھلنے اور دروازے بند ہونے کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے بارے انہوں نے بہت سی آیات اور احادیث کا تذکرہ کیا۔ پھر لکھا: "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معراج کی شب انبیائے کرام کو دیکھا ہے۔ بعض اہلِ حدیث نے یہ گمان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی اشباح اور ارواح کو دیکھا تھا۔ انہوں نے فرمایا: "وہ اپنے رب تعالیٰ کے ہاں زندہ ہیں انہیں رزق دیا جاتا ہے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو دیکھا وہ بیت المعمور کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ وہ اپنی قبر انور میں نماز ادا کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن انبیائے کرام کو دیکھا ان کا حلیہ بیان فرمایا تو ان کے اجسام کا حلیہ بیان کیا۔

ایک گروہ نے اس میں مخالفت کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ روایت ان کی ارواح کے بارے ہے اجسام کے بارے نہیں۔ ان کے اجسام اسی زمین کے اندر تھے۔ انہیں اس وقت اٹھایا جائے گا جب دیگر اجسام کو اٹھایا جائے گا۔ اس سے قبل نہیں اٹھایا جائے گا۔ اگر اس سے قبل انہیں اٹھایا جائے تو روزِ حشر سے قبل ان کی وجہ سے زمین شق ہو جائے۔ وہ صور پھونکتے وقت پھر موت کا ذائقہ چکھیں تو یہ تیسری بار موت ہوگی۔ یہ قطعی طور پر باطل ہے۔ اگر ان کے اجسام کو قبور سے نکالا جاتا تو رب تعالیٰ انہیں واپس نہ لوٹاتا۔ وہ جنت میں ہوتے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو انبیاء کرام پر حرام قرار دیا ہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت میں تشریف فرما ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے قبل جنت کے دروازے پر دستک دیں گے۔ سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے لیے زمین شق ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل کسی کے لیے زمین شق نہیں ہوگی۔ اس سے لازمی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسدِ اطہر زمین کے اندر رہے۔

آپ ﷺ کے صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے عرض کی: "آپ ﷺ پر ہمارا درود شریف کیسے پیش کیا جائے گا حالانکہ آپ ﷺ کا جسمِ اطہر تو بوسیدہ ہو چکا ہوگا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "رب تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیائے کرام کے اجسام طیبہ کو کھائے۔ اگر آپ ﷺ اپنی قبر انور میں تر و تازہ نہ ہوتے تو آپ ﷺ اس طرح جواب نہ دیتے۔ آپ ﷺ سے یہ صحیح روایت منقول ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کی قبر انور پر ملائکہ مقرر کیے ہیں جو آپ ﷺ تک آپ ﷺ کی امت کا درود و سلام پہنچاتے ہیں۔ یہ بھی آپ ﷺ سے صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ حضرات ابوبکر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ہمراہ باہر نکلے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ہمیں اسی طرح اٹھایا جائے گا۔"

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ کی روح مبارک رفیق اعلیٰ میں اعلیٰ علیین میں ارواح انبیاء علیہم السلام کے ہمراہ ہے۔ یہ بھی صحیح روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو دیکھا وہ اپنی قبر انور میں نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں چھٹے یا ساتویں آسمان پر بھی دیکھا۔ روح مبارک تو اعلیٰ علیین میں تھی لیکن اس کا اتصال ان کی قبر انور میں جسم اطہر کے ساتھ بھی تھا۔ روحِ مبارک جسمِ اطہر کے ساتھ اس طرح تھی کہ وہ اپنی قبر انور میں نماز ادا کر رہے تھے اور سلام کرنے والے کو سلام کا جواب بھی مرحمت فرما رہے تھے۔ ان دونوں امور میں کوئی منافات نہیں۔ کیونکہ ارواح کی کیفیت اجسام کی کیفیت سے جداگانہ ہے۔ تم پاؤ گے کہ دو ارواح باہم ملی ہوتی ہیں۔ ان میں بہت زیادہ قرب ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کے اجسام کے مابین بہت بعد ہوتا ہے۔ اسی طرح تم دو ارواح کو دیکھو گے وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہیں اگرچہ ان کے اجسام باہم ملے ہوتے ہیں۔ روح کا اترنا اور چڑھنا، اور اس کا قرب و بعد کا تعلق اس امر سے نہیں جس کا تعلق بدن کے امور سے ہو۔ یہ ساتوں آسمانوں کے اوپر جاتی ہے پھر زمین پر آجاتی ہے۔ حالانکہ صرف روح کو قبض کرنے اور میت کو قبر میں رکھنے کے مابین تھوڑا سا وقت ہوتا ہے۔ اتنے مختصر

وقت میں جسم نہ اوپر جا سکتا ہے نہ نیچے اتر سکتا ہے۔ اسی طرح یہ نیند اور بیداری میں جسم سے اوپر جاتی ہے پھر واپس آجاتی ہے۔ بعض علماء نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ یہ سورج کی طرح ہے جو آسمان پر ہے اور اس کی شعاعیں زمین پر ہیں۔ لیکن ہمارے شیخ ابوالعباس حرانی نے لکھا ہے کہ یہ مثال مطابقت نہیں رکھتی۔ سورج آسمان پر ہی رہتا ہے۔ اس کی شعاع زمین پر ہی ہوتی ہے۔ وہ نہ تو سورج اور نہ ہی اس کی صفت ہے۔ بلکہ عرض ہے جو سورج اور جسم کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے جو اس کے بالمقابل ہوتا ہے۔ جبکہ روح بذات خود اوپر چڑھتی ہے۔ نیچے آتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل باب "حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" میں آئے گی۔

۵۲ بیت المعمور کی تفصیل

ابوعبیدہ نے لکھا ہے کہ معمور کا معنی بہت چھا جانے والا ہے۔ اسے ضراح بھی کہا جاتا ہے۔ ملائکہ اسے ضراح کہتے ہیں کیونکہ یہ زمین سے دور ہے۔ مجاہد نے معمور کا معنی ضریح یعنی بعید بھی کیا ہے۔ اکثر روایات کے مطابق یہ ساتویں آسمان پر ہے۔ ابن جریر، ابن منذر اور حاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یہ ساتویں آسمان پر ہے۔ اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ پھر تا قیام قیامت دوبارہ اس جگہ لوٹ کر آنے کی باری نہیں آئی۔" ابن راھویہ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے بیت المعمور کے بارے روایت کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا: "یہ ساتویں آسمان پر خانہ کعبہ کے بالکل اوپر اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ اس کی حرمت خانہ کعبہ کی طرح ہے۔ ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ جن کی تا قیام قیامت دوبارہ اس میں لوٹ کر آنے کی باری نہیں آتی۔"

ابن مردویہ، عقیلی اور ابن ابی حاتم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ساتویں آسمان پر ایک بیت اللہ ہے جسے بیت المعمور کہا جاتا ہے۔ چوتھے آسمان پر ایک نہر ہے جسے الحیوان کہا جاتا ہے۔ حضرت جبرائیل ہر روز اس میں داخل

ہوتے ہیں۔اس میں ایک غوطہ لگاتے ہیں پھر لینے پر جھاڑتے ہیں جن سے ستر ہزار قطرات گرتے ہیں۔رب تعالیٰ ہر قطرہ سے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے۔انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بیت المعمور میں جائیں۔اس میں نماز ادا کریں۔وہ یوں کرتے ہیں پھر تاقیام قیامت ان کی باری نہیں آتی۔

ایک فرشتے کو ان کا امیر بنا دیا جاتا ہے۔اسے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان فرشتوں کو آسمان پر ٹھہرائے۔وہ وہاں تاقیام قیامت رب تعالیٰ کی تسبیح بیان کریں۔"اس روایت کی سند ضعیف ہے۔صحیح مؤقف یہ ہے کہ یہ موضوع نہیں ہے۔جیسے کہ میں نے "الفوائد المجموعۃ فی بیان الاحادیث الموضوعۃ" میں صراحت کی ہے۔

ابوالشیخ نے خالد بن سعید سے روایت کیا ہے۔انہوں نے کہا: "مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ اسرافیل اہلِ آسمان کے مؤذن ہیں۔ان کی اذان جن وانس کے علاوہ آسمان اور زمین کے سارے مکین سنتے ہیں۔وہ ایک عظیم فرشتے کو آگے کرتے ہیں۔وہ انہیں نماز پڑھاتا ہے۔" مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت میکائیل انہیں بیت المعمور میں نماز پڑھاتے ہیں۔اس حدیث پاک سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کی تعداد ساری مخلوق سے زیادہ ہے۔کیونکہ سارے عوالم میں کسی کے بارے یہ معلوم نہیں کہ اس کی جنس میں سے ہر روز ستر ہزار افراد پیدا ہوتے ہیں۔

◆ فَرُفِعَ اِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ۔ رُفع کا معنی اُرِیَ لَہٗ ہے یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے رفع اور رؤیت دونوں مراد ہوں۔کیونکہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ کے اور بیت المعمور کے مابین اتنے عالم ہوں جن پر ادراک کسی کو حاصل نہ ہو سکتا ہو۔اسے اٹھا کر آپ ﷺ کے سامنے لایا گیا ہو۔آپ ﷺ نے اسے اپنی بصارت اور بصیرت سے دیکھ لیا ہو۔یہ بھی احتمال ہے کہ وہ سارے عالم جو آپ ﷺ کے اور بیت المعمور کے مابین ہوں انہیں زائل کر دیا گیا ہو حتیٰ کہ آپ ﷺ کی بصارت نے اس کا ادراک کر لیا ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ عالم اپنی حالت پر اور بیت المعمور اپنی حالت پر رہی ہو۔آپ ﷺ کی بصارت اور بصیرت میں اضافہ کر دیا گیا ہو حتیٰ کہ آپ ﷺ نے اس کا ادراک سے اس کا معائنہ کر لیا ہو۔قدرت کو ہر چیز پر دسترس حاصل ہے۔

اکثر روایات میں "رُفِعَتْ" کا صیغہ ہے۔ لیکن بعض میں رُفِعَتْ بھی ہے۔ ان دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کرنا ممکن ہے کہ رفع سے مراد یہ ہے کہ اسے اٹھا کر آپ ﷺ کے قریب کر دیا گیا کیونکہ اس لفظ کا اطلاق قریب پر بھی ہوتا ہے۔

- آٹھویں معراج سدرۃ المنتہیٰ تک ہوئی۔ اس میں مناسبت یہ ہے کہ ہجرت کے آٹھویں سال میں مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ مکہ ام القریٰ ہے۔ یہی مبتداء اور منتہیٰ ہے۔ کیونکہ روایت ہے کہ ساری زمین مکہ مکرمہ سے بچھائی گئی۔ اسی لیے اس کا نام ام القریٰ رکھا گیا۔ یا اس لیے کہ ساری بستیوں والے دین و دنیا کے لیے اسی کی طرف آتے ہیں۔ وہ حج اور عمرہ، تجارت اور روزگار کے لیے آتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ (المائدۃ:۹۷)

ترجمہ: "بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو عزت والا گھر ہے بقاء کا باعث لوگوں کے لیے۔"

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ (الحج:۲۸)

ترجمہ: "تاکہ وہ حاضر ہوں اپنے (دینی دنیوی) فائدوں کے لیے۔"

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اجر اور تجارت ہے۔ اس سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ اور ام القریٰ میں وہ مناسبت ہے جو کسی سے مخفی نہیں ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ تک مخلوق کا علم ختم ہو جاتا ہے۔ جبکہ مکہ مکرمہ تک شرق و غرب کے اہل آفاق کی انتہاء ہوتی ہے۔ اس میں اجتماع ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کا سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنا اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ ﷺ آٹھویں سال مکہ مکرمہ کو فتح فرمالیں گے۔ سدرۃ المنتہیٰ پر ٹڈیاں اور بستر چھائے ہوئے تھے۔ یہ رب تعالیٰ کے لشکریں سے ایک لشکر ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کے روز وہاں اللہ تعالیٰ کا لشکر چھا رہا تھا۔ اسی طرح وہاں لوگوں کی مختلف جنسیں موجود ہوتی ہیں۔ وہاں سیاہ و سفید لوگ آتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ حدیث پاک میں موجود ہیں۔ جیسے کہ سدرۃ المنتہیٰ پر ایسے رنگ چھائے تھے جنہیں صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ان کی حسن و زیبائی سے صرف رب تعالیٰ ہی آگاہ ہے۔ زیادہ جمال کی وجہ سے

کوئی ان کی تعریف نہیں کرسکتا۔ جیسے کہ ان صحابہ کرام کے رنگ بڑے حسین تھے جنہوں نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا۔ وہ ایمان اور قرآن سے مزین تھے۔ ان کی عظمت شان کا عالم یہ تھا کہ کوئی ان کی تعریف نہیں کرسکتا تھا۔

پھر چار نہروں کا ظہور ہوا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عنقریب یہ امت ان تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی سچ ثابت ہوگیا "میرے لیے زمین کے مشارق و مغارب کو لپیٹ دیا گیا۔ جہاں تک میرے لیے لپیٹا گیا میری امت عنقریب وہاں تک پہنچ جائے گی۔"

۵۵ حضرت ابن مسعود کی روایت میں ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان پر ہے جبکہ حضرت انس کی روایت میں ہے کہ یہ ساتویں آسمان پر ہے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے "یہ تعارض ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ علماء کا موقف وہی ہے جس کا تذکرہ حضرت انس کی روایت میں ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ایسے وصف سے متصف ہو کہ اس جگہ ہر نبی مرسل اور ملک مقرب کا علم ختم ہو جاتا ہو۔ نیز حضرت انس کی روایت مرفوع جبکہ حضرت ابن مسعود کی روایت موقوف ہے۔ حافظ لکھتے ہیں: "سدرۃ المنتہیٰ کا چھٹے آسمان پر ہونا تعارض پیدا نہیں کرتا۔ جیسے کہ بقیہ روایات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساتویں آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد اس تک پہنچے۔ اسے اس امر پر محمول کیا جائے گا کہ اس کی اصل چھٹے آسمان پر ہے۔ اس کی شاخیں اور فروع ساتویں آسمان پر ہیں۔ چھٹے آسمان میں اس کے تنے کی اصل ہے۔"

۵۶ ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے کہ ظاہر بات یہی ہے کہ جنت شجرۃ المنتہیٰ کے نیچے زمین بچھائی گئی ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "وہاں دو باطنی نہریں تھیں۔ اس لفظ کا اطلاق اسی چیز پر ہوسکتا ہے جسے سمجھا جاسکتا ہو۔ باطن کے لیے لازم ہے کہ اس کی روانی کسی چیز کے نیچے ہو۔ اس وقت اس پر باطن کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

۵۷ قاضی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے "حدیث پاک اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کی اصل زمین میں ہو۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نیل اور فرات اس کے اصل سے

نکلتے ہیں۔" مشاہدہ سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ وہ زمین سے نکلتے ہیں۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کی اصل زمین میں ہو۔" امام نووی نے ان کی گرفت کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اس کی اصل سے رواں ہوتی ہے۔ لیکن وہ زمین سے پھوٹتی نہیں ہیں۔ لب لباب یہ ہے کہ ان کی اصل جنت سے ہے۔ وہ پہلے سدرہ کی اصل سے رواں ہوتی ہیں۔ پھر زمین پر قرار پذیر ہوتی ہیں۔ پھر وہاں سے پھوٹتی ہیں۔

- آپ ﷺ کا یہ فرمان "اس کی اصل سے چار نہریں نکلتی ہیں" "دو باطنی نہریں اور دو ظاہری نہریں" ان الفاظ کا احتمال ہے کہ انہیں حقیقت پر محمول کیا جائے گا۔ یا اسے اس باب پر محمول کیا جائے جس میں کسی چیز کے قرب کی وجہ سے اسے یہ نام دے دیا جاتا ہے۔ اگر اسے حقیقت پر محمول کیا جائے تو یہ نہریں درخت کی اصل سے رواں ہوتی ہوں گی۔ اس درخت کا ذائقہ بیر کی طرح ہوگا۔ اس کی جڑ سے پانی نکل رہا ہوگا۔ قدرت اس سے عاجز نہیں ہے۔ اگر اسے دوسرے امر پر محمول کیا جائے تو پھر نہروں کا منبع درخت کی اصل کے قریب ہوگا۔
- آپ ﷺ کا فرمان "دو باطنی نہریں جنت کی نہریں ہیں۔" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ باطن ظاہر سے اجل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں اصل میں باطن تھیں انہیں دارالبقاء میں رکھا گیا۔ جبکہ ظاہر کی مدت کم ہوتی ہے لہٰذا ظاہری نہروں کو دارالفناء میں رواں کیا گیا۔ اسی طرح اعتقاد اسی پر ہوتا ہے جو باطن میں ہوتا ہے۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: "رب تعالیٰ تمہاری سورتوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں کی طرف دیکھتا ہے۔"
- حضرت ابوسعید کی روایت میں ہے "ساتویں آسمان پر ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ جب سے دو نہریں رواں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کوثر ہے۔ جبکہ دوسری رحمت کی نہر ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی تشریح ان دو باطنی نہروں سے کی جائے۔ جن کا تذکرہ اس حدیث پاک میں ہے جیسے کہ مقاتل سے روایت ہے کہ دو باطنی نہریں سلسبیل اور کوثر ہیں۔"

◆ امام نووی لکھتے ہیں: ''نیل اور فرات کی اصل جنت سے ہے۔ یہ سدرۃ المنتہیٰ کی اصل سے نکلتی ہیں۔ پھر وہاں رواں ہوتی ہیں جہاں اللہ رب العزت چاہتا ہے۔ پھر زمین پر نازل ہوتی ہیں اس میں رواں ہوتی ہیں۔ پھر اس سے باہر آتی ہیں۔'' عقل اسے منع نہیں کرتی۔ روایت کا ظاہر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اسی پر اعتماد کیا جائے گا۔

◆ اس روایت سے نیل اور فرات کے پانی کی فضیلت پر استدلال کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا منبع جنت میں ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سیحان، جیحان، نیل اور فرات جنت کی نہریں ہیں۔'' علماء نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ زمین میں چار نہریں ایسی ہیں جن کی اصل جنت سے ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سیحان اور جیحان کا منبع بھی سدرۃ المنتہیٰ کے اصل سے ہے۔ نیل اور فرات ان سے ممتاز ہوں گی۔ مذکورہ روایت میں باطنی نہروں سے مراد سیحان اور جیحان کے علاوہ ہیں۔ امام قرطبی نے لکھا ہے: ''شب معراج میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔ شاید اصلاً سدرۃ المنتہیٰ سے رواں نہ ہوتی ہوں۔ شاید یہ فرات اور نیل سے نکلتی ہوں۔''

◆ ان نہروں کو شیرینی، حسن اور برکت کی وجہ سے جنت کی نہروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے بہتر مؤقف یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ جنت کی نہریں ہیں۔ دوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ شاید یہ اس طرح گرتی ہوں جس طرح بارش گرتی ہے۔ پھر یہ زمین سے ایک جگہ جمع ہو جاتی ہوں۔ حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مستقر تک پہنچ جاتی ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان انہار کے قرب و جوار میں زمین میں گرتی ہوں۔ حتیٰ کہ ان کی ابتداء سے آج تک کوئی آگاہ نہ ہو۔ ابوالشیخ نے العظمۃ میں لکھا ہے کہ لیث بن سعد کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ بنو عیص کا ایک شخص تھا جسے حائد بن شالوم بن عیص بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کہا جاتا تھا۔ وہ بادشاہوں کے خوف سے بھاگ نکلا۔ وہ سرزمین مصر میں داخل ہو گیا۔ وہیں ٹھہرا رہا۔ جب اس نے دریائے نیل کے عجیب امور دیکھے تو اس نے قسم اٹھائی کہ وہ نیل کا ساحل نہیں

چھوڑے گا حتیٰ کہ اس کے آخری سرے تک پہنچے گا کہ یہ کہاں سے نکلتا ہے۔ یا وہ مر جائے گا۔ وہ چلتا رہا۔ تیس سال لوگوں میں اور تیس سال لوگوں کے بغیر چلتا رہا۔ یا وہ پندرہ سال لوگوں میں اور پندرہ سال آبادی کے بغیر ہی چلتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ بحر اخضر تک پہنچ گیا۔ اس نے نیل کی طرف دیکھا جہاں سے وہ شق ہو کر نکلتا تھا۔ سیب کے درخت کے نیچے ایک شخص نماز ادا کر رہا تھا۔ جب اس نے اسے دیکھا تو اسے اس سے انس پیدا ہو گیا۔ اس نے اسے سلام کیا۔ پوچھا: "تم کون ہو؟" اس نے کہا: "میں حائد بن شالوم ہوں۔ تم کون ہو؟ اس نے کہا: "میں عمران بن فلان بن عیص ہوں۔" حائد: کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا: "میں اس نیل کی وجہ سے آیا ہوں۔ کیا کسی کتاب میں لکھا ہے کہ کوئی شخص اس دریا کے منبع تک پہنچا ہو۔ میرا گمان ہے کہ وہ شخص تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے منبع تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟ اس نے کہا: "اس سمندر کے کنارے رواں ہو جاؤ۔ عنقریب تم ایک سواری سے ملو گے جس کی ابتداء تو تمہیں نظر آئے گی لیکن اس کی انتہاء نظر نہیں آئے گی۔ اس کا آخر تمہیں خوفزدہ نہ کر دے۔ یہ سورج سے عداوت رکھتی ہے۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے یہ اس پر جھپٹتی ہے تا کہ اسے نگل لے۔ جب سورج غروب ہوتا ہے تو یہ اسی طرح اس پر جھپٹتی ہے۔ تم اس سواری پر سوار ہو جانا یہ تمہیں سمندر کے کنارے پر لے جائے گی۔ اس پر رواں رہنا یہ تمہیں عنقریب لوہے کی زمین تک لے جائے گی۔ اگر تم اس پر آگے رواں رہو گے تو تم سونے کی زمین تک پہنچ جاؤ گے۔ وہیں نیل کا علم ختم ہوتا ہے۔" وہ شخص عازم سفر ہوا حتیٰ کہ سونے کی سرزمین تک پہنچ گیا۔ پھر سونے کی دیوار آ گئی پھر سونے کی بالکونی آ گئی۔ پھر سونے کا گنبد آ گیا جس کے چار دروازے تھے۔ اس نے وہ چیز دیکھی جو اس دیوار کے اوپر سے گر رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ قبہ میں قرار پذیر ہو جاتی تھی۔ پھر وہ چاروں دروازوں کی طرف آتی تھی۔ تین نہریں زمین کے اندر چلی جاتی تھیں جبکہ چوتھی نہر سطح زمین پر رواں ہوتی تھی وہ نیل تھا۔ اس نے اس سے پانی پیا، وہاں آرام کیا دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ ایک فرشتہ اس کے پاس آیا اس نے کہا: "حائد! رک جا۔

تجھے اس دریا کا علم حاصل ہو چکا ہے یہ جنت ہے یہ جنت سے نازل ہوتا ہے۔"

◆ ابن ابی جمرۃ نے حضرت جبرائیل امین کے فرمان "دو نہریں جو باطنی ہیں وہ جنت میں ہیں اور دو ظاہری نہریں نیل اور فرات ہیں۔" میں لکھا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نیل اور فرات جنتی نہریں ہیں کیونکہ حضور ﷺ نے بتایا کہ حضرت جبرائیل نے آپ ﷺ کو عرض کی ہے کہ ان انہار کا منبع سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ وہ باطنی نہریں جنت کی طرف چلی جاتی ہیں۔ نیل اور فرات دنیا کی طرف نازل ہوتی ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ جنت میں نہیں کہ یہ کہا جائے کہ یہ پھوٹنے کے بعد جنت سے رواں ہوتی ہیں۔ یہ مؤقف اس روایت کے مخالف ہے جسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "سیحان، جیحان، نیل اور فرات جنتی نہریں ہیں۔" ان دونوں کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ نیل اور فرات کا منبع سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ جب یہ نیچے اترتی ہیں تو پہلے جنت کی طرف جاتی ہیں وہ جنت میں داخل ہوتی ہیں پھر زمین کی طرف اترتی ہیں۔

◆ ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے کہ روایت ہے کہ جس نے جنت کا پانی پی لیا وہ نہ مرے گا نہ فناء ہو گا۔ نہ ہی اس کا فضلہ اس طرح نکلے گا جس طرح دنیا میں نکلا کرتا تھا۔ بلکہ اس کے جسم سے مشک کے قطرات نکلیں گے۔ رب تعالیٰ نے اس پانی میں یہ عظیم خاصیت رکھی ہے۔ جب اس کی حکمت نے تقاضا کیا کہ یہ نہریں اس دنیا میں اتریں اس نے ان سے یہ خاصیت چھین لی۔ اس کے جوہر کو ان کے حال پر باقی رکھا۔ سارے خواص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے تو اس کی خاصیت کو باقی رکھتا ہے اور اگر چاہتا ہے تو اس کے جوہر کو باقی رکھ کر اس کی خاصیت کو سلب کر لیتا ہے۔ خواص کی ذاتوں کی تاثیر نہیں ہوتی۔ بلکہ خاصیت بھی اس کی مخلوق ہے۔ جوہر بھی اس کی مخلوق ہے۔ قدرت ان سب میں موثر ہے۔

◆ ابن کثیر لکھتے ہیں "اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نہریں اپنی صفائی، شیرینی، روانی اور دیگر صفات میں جنت کی نہروں کے مشابہ ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا: "عجوہ جنت کی کھجور ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ یہ جنتی پھل کے مشابہ ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ

اسے جنت سے چنا گیا ہے۔ حس اس کے خلاف کی گواہی دیتی ہے جس سے یہ تعین ہو گیا کہ مراد اس کا غیر ہوگا۔ اسی طرح ان انہار کے مصادر کو زمین میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اس موقف پر ان کی گرفت کی گئی ہے کہ ان نہروں کی یہ کیفیت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جنت سے نہ ہوں۔ کیونکہ نزول کی کیفیت کے بارے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ امام نووی وغیرہ نے یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ جنت سے ہیں اس میں کوئی مشکل نہیں۔ کیونکہ جنت کے پانی میں وہ خواص ہیں جو ان نہروں میں نہیں۔ ابن ابی جمرہ کا کلام پہلے گزر چکا ہے۔

◆ حضرت شریک کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے آسمان دنیا میں دو نہریں دیکھیں۔ حضرت جبرائیل امین نے عرض کی: ''یہ نیل اور فرات کا عنصر ہے۔'' دوسرے محدثین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان نہروں کو ساتویں آسمان پر دیکھا۔ ابن دحیہ نے لکھا ہے ''ان دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کرنا ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے یہ دو نہریں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیگر نہروں کے ہمراہ دیکھیں۔ پھر آسمان دنیا میں یہ دو نہریں دیکھیں عنصر سے مراد ان کا انتشار ہے۔

◆ ابو نعیم اور ضیاء نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم یہ گمان کرتے ہو کہ شاید جنت کی نہریں زمین کو چیر کر بنائی گئی ہیں۔ ہرگز نہیں! بلکہ یہ سطح زمین پر رواں ہیں۔''

◆ حارث نے اپنی سند میں اور امام بیہقی نے الشعب میں حضرت کعب الاحبار سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''شہد کی نہر دریائے نیل ہے۔ دودھ کی نہر دریائے دجلہ ہے۔ شراب کی نہر دریائے فرات ہے اور پانی کی نہر دریائے سیحان ہے۔''

◆ ''سدرہ پر سونے کی ٹڈیاں چھائی ہوئی تھیں۔'' امام بیضاوی نے لکھا ہے کہ ٹڈیوں اور بستروں کا تذکرہ از روئے تمثیل ہے۔ کیونکہ درخت کے اوپر کیڑے پتنگے گرتے رہتے ہیں۔ ان کی صفائی، پاکیزگی اور سفیدی کی وجہ سے انہیں سونے سے تشبیہ دی گئی ہے۔'' حافظ نے لکھا ہے ''شاید یہ حقیقت میں ہی سونے کی ہوں۔ رب تعالیٰ نے ان

میں پرواز کا وصف پیدا کر دیا ہو۔ قدرت اس امر پر قادر ہے۔"

۴۱ "غفر لی ما تقدم من ذنبی وما تاخر" امام بکی نے لکھا ہے:" مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو اس امر سے مشرف کر دیا ہے یعنی اگر آپ ﷺ کے گناہ ہوتے تو انہیں معاف کر دیا جاتا لیکن آپ کے گناہ تو بالکل تھے ہی نہیں۔" شیخ نے اپنی کتاب المحرر میں لکھا ہے کہ اس امر پر بارہ اقوال ہیں: امام بکی نے پانچ اور شیخ نے بقیہ کو فاسد قرار دیا ہے جو مقبول اقوال ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ علامہ قاضی نے الشفاء میں لکھا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ یوں کہیں:

وَمَآ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَلَا بِکُمۡ ؕ (الاحقاف:۹)

ترجمہ:" اور میں (از خود یہ) نہیں جان سکتا کہ کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا جائے گا تمہارے ساتھ۔"

اس وقت کفار خوش ہو گئے۔ اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی:

لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ ۔ (الفتح:۲)

ترجمہ:" تاکہ دور فرما دے آپ کے لیے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو (ہجرت کے) بعد لگائے گئے۔"

جبکہ اہلِ ایمان کے انجام کا تذکرہ دوسری کسی اور آیت طیبہ میں کیا۔ آیت طیبہ کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی بخشش کر دی گئی ہے۔ کسی گناہ کی وجہ سے آپ ﷺ کا مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ اس اثر کو ابن منذر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

قاضی نے لکھا ہے" اس جگہ المغفرۃ سے مراد عیوب سے پاکیزگی ہے۔" بعض محققین نے لکھا ہے کہ اس جگہ مغفرت، عصمت سے کنایہ ہے۔ یعنی آپ ﷺ کو گزشتہ اور آئندہ عمر مبارک میں معصوم بنا دیا گیا ہے۔ یہ قول بہت عمدہ ہے۔ بلغاء نے قرآن پاک کے بلاغت کے اسالیب میں سے ایک اسلوب یہ بھی شمار کیا ہے کہ اس نے مغفرت، عفو اور توبہ سے کنایۃ تخفیفات مراد لیں ہیں۔ جیسے رات کے قیام کے منسوخ کرتے وقت فرمایا:

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۔ (المزمل:۲۰)

ترجمہ: ''وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو اس نے تم پر مہربانی فرمائی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے قبل صدقہ دینے کو منسوخ کرتے وقت فرمایا:

فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ۔ (المجادلۃ:۱۳)

ترجمہ: ''پس جب تم ایسا نہیں کر سکے تو اللہ نے تم پر نظر کرم فرمائی۔''

رمضان المبارک کی رات کو جماع کی حرمت کو منسوخ کرتے ہوئے فرمایا:

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ ۔ (البقرہ:۱۸۷)

ترجمہ: ''پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ۔''

امام سبکی نے لکھا ہے: ''میں نے اس آیت طیبہ، اس کے ماقبل اور مابعد میں غور وفکر کیا ہے۔ میں نے پایا ہے کہ یہ صرف ایک احتمال رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے مراد صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشرف فرمانا ہے۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گناہوں سے معصوم ہیں۔ لیکن ارادہ کیا گیا ہے کہ آیت طیبہ میں ان تمام نعمتوں کا تذکرہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کی ہیں۔ تمام اخروی نعمتیں دو امور میں منقسم ہیں۔ (۱) سلبیہ۔ اس سے مراد گناہوں کی معافی ہے۔ (۲) ثبوتیہ۔ یہ ان گنت ہیں۔ رب تعالیٰ نے اپنے اس فرمان سے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

ویتم نعمته علیك۔ (البقرۃ:۱۸۷)

تمام دنیوی نعمتیں دو امور میں منقسم ہیں۔ (۱) دینیہ۔ ان کی طرف اپنے اس فرمان میں اشارہ کر دیا۔

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲ (الفتح:۲)

ترجمہ: ''اور چلائے آپ کو سیدھی راہ پر۔''

دنیویہ۔ اگر ان سے دین مقصود ہو تو وہ رب تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝۳ (الفتح:۳)

ترجمہ: ''اور تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ایسی مدد فرمائے جو زبردست ہے۔''

اخروی نعمتوں کو دنیویہ نعمتوں پر مقدم کیا۔ تاکہ اہم نعمتیں مقدم ہو سکیں۔ اس سے یہ انتظام فرمایا کہ حضور نبی پاک ﷺ پر ہر قسم کی نعمتوں کی تکمیل ہو سکے۔" اس معنی سے آگاہ ہو جانے کے بعد میں نے ابن عطیہ کا قول دیکھا۔ وہ بھی اسی کے ساتھ موافقت رکھتا ہے۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اس حکم سے مشرف فرمانا۔ آپ ﷺ کے گناہ تو بالکل تھے ہی نہیں۔" انہیں صحیح مؤقف کی توفیق دی گئی ہے۔

- "ثم اخذ علی الکوثر حتی دخل الجنة" شیخ عزالدین نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ حدیث پاک اس بات کی دلیل ہے کہ سدرۃ جنت میں داخل نہیں ہے۔ ابن ابی جمرہ نے اسی قول کو یقین کے ساتھ لکھا ہے۔ ابن دحیۃ نے لکھا ہے: "ثم اس جگہ ترتیب کے لیے نہیں ہے جیسے کہ اس فرمان میں ہے:

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (البلد:۱۷)

ترجمہ: "پھر وہ ایمان والوں سے ہو"

یہ واؤ کی طرح جمع اور اشتراک کے لیے ہے۔ یہ اپنی اصل سے خارج ہے۔ فتح الصفا کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ مؤقف ظاہر کے خلاف ہے۔

- بعض علماء نے قرض کے درہم کا اٹھارہ گنا اجر ہونے کی توجیہ میں لکھا ہے۔ قرض کا ایک درہم صدقہ کے دو دراہم کے برابر ہے۔ جبکہ صدقہ کے درہم کا اجر دس گنا ہے۔ قرضہ کا درہم قرض دینے والے کی طرف لوٹتا ہے۔ وہ دو درہم ہے۔ اگر بیس دراہم سے دو دراہم نکال لیں تو باقی اٹھارہ دراہم بچ جاتے ہیں۔ میں نے علامہ نورالدین المحلی کو پڑھا۔ انہوں نے اصول میں اسی طرح لکھا تھا۔ پھر میں نے حکیم ترمذی کی نوادرالاصول پڑھی۔ انہوں نے لکھا تھا: "اس حدیث پاک کا معنی یہ ہے کہ صدقہ دینے والے کو ایک درہم کا دس گنا اجر ملتا ہے۔ ایک درہم صدقہ کا دیا گیا اور بقیہ نو دراہم۔ یہ کل دس دراہم بنتے ہیں۔ قرض کے دراہم کو گنا گیا تو یہ اٹھارہ دراہم بن گئے۔ قرض کا ایک درہم شمار نہیں کیا گیا۔ کیونکہ وہ قرض خواہ کی طرف واپس آجاتا ہے۔ اس طرح دگنا کرنے سے اٹھارہ درہم رہ جاتے ہیں۔ جبکہ صدقہ میں درہم واپس

نہیں ہوتا تو دس ہوتے ہیں۔

◆ ابن دحیۃ نے لکھا ہے" آپ ﷺ کو جنت کی سیر کرائی گئی اس میں بہت زیادہ عزت و کرامت ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ اپنی امت کو جنت خریدنے کے لیے کہتے تھے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۱ (التوبۃ:۱۱۱)

ترجمہ: "یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے۔ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں۔ پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ وعدہ کیا ہے اللہ نے اس پر پختہ وعدہ تورات اور انجیل اور قرآن (تینوں کتابوں) میں۔ اور کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے وعدہ کو اللہ تعالیٰ سے (اے ایمان والو!) خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو کیا ہے تم نے اللہ سے۔ اور یہی تو سب سے بڑی فیروزمندی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو وہ جنت دکھا دی جو آپ ﷺ اپنی امت کو خریدنے کے لیے کہتے تھے۔ تاکہ آپ ﷺ اس کا مشاہدہ کر سکیں۔ کیونکہ آپ ﷺ لوگوں کو جنت کی طرف بلاتے تھے۔ یہ وہ گھر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی ضیافت کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث کیا تاکہ آپ ﷺ اس کی طرف دعوت دیں۔ رب تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ آپ ﷺ کو یہ دار دکھا دے۔ کثیر نعمتیں دکھا دے۔ تاکہ آپ ﷺ پوری دلجمعی کے ساتھ دعوت دیں۔ تاکہ آپ ﷺ جان سکیں کہ ساری مخلوق اس میں سما سکتی ہے۔ یہ پھر بھی نہیں بھرتی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے مخلوق کو پیدا فرما دے۔ جیسے روایت سے ثابت

ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ کو جنت اس لیے دکھائی ہوتا کہ اس کے مقابلہ میں آپ ﷺ کو دنیا کی حقارت کا علم ہو سکے۔ تاکہ آپ ﷺ دنیا میں زیادہ زہد اختیار فرمائیں۔ مصائب پر زیادہ صبر کریں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آزمائش کتنی عمدہ ہوتی ہے جو اپنے صاحب کو آسائش کی طرف لے جائے اور وہ نعمت کتنی بری ہوتی ہے جو اپنے صاحب کو آزمائش کی طرف لے جائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ رب تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہو جو بھی نعمت اور کرامت کسی اور کے لیے ہو وہ حضور ﷺ کے لیے بھی ضرور ہو۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے لیے یہ نعمت تھی کہ انہیں روزِ قیامت سے قبل جنت میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ یہ نعمت اپنے حبیب اور نبی حضور اکرم ﷺ کے لیے بھی ہو۔

25. ابن دحیہ نے لکھا ہے "آپ ﷺ کو آگ اس لیے دکھائی گئی تاکہ آپ ﷺ روزِ حشر امن میں رہیں۔ جب سارے انبیاء نفسی نفسی کہہ رہے ہوں گے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ امتی امتی کہہ رہے ہوں گے۔ یہ اس وقت ہے جب جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اس سے امن عطا فرما دیا۔ فرمایا:

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ۔ (التحریم:۸)

ترجمہ: "اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو۔"

اس میں یہ حکمت کارفرما ہے تاکہ آپ اپنی امت کی شفاعت کے لیے فارغ ہو سکیں۔ اگر وہ آپ کو امن عطا نہ فرماتا تو آپ ﷺ بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنے نفس میں مشغول ہوتے۔ کیونکہ انہوں نے روزِ قیامت سے قبل اس میں سے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ اسے دیکھیں گے تو گھبرا جائیں گے۔ اس کی وجہ سے ان کی زبانیں شفاعت سے رک جائیں گی۔ ان کے نفوس اپنی امت سے مشغول ہو جائیں گے۔ جبکہ آپ ﷺ نے اس سے قبل آگ کو دیکھا ہوگا۔ آپ اس طرح نہیں گھبرائیں گے جس طرح دیگر انبیاء گھبرا جائیں گے۔ آپ ﷺ خطبہ پر قادر رہوں گے۔ اس سے مراد مقامِ محمود ہے۔ کیونکہ کفار آپ ﷺ کی تکذیب کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے تھے۔ آپ ﷺ کو بہت زیادہ ستاتے تھے۔ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وہ

آگ دکھادی جو اس نے کفار کے لیے تیار کر رکھی تھی۔تا کہ آپ ﷺ کے قلب انور کو تسلی ہو سکے۔یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جس کے دشمن رسوا ہوں اور ان سے انتقام لینے سے اس کے دل کو سکون ملے۔وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ دوستوں کی شفاعت قبول کر کے اس کے دل کو خوش کیا جائے۔نیز یہ اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ پر احسان ہو کہ وہ آپ ﷺ کی برکت اور شفاعت سے اہلِ ایمان کو آتش دوزخ سے بچا لے۔

- آپ ﷺ نے کسی فرشتے کو اس شکل میں نہیں دیکھا جس میں وہ لوگ آخرت میں اسے دیکھیں گے جنہیں عذاب دیا جائے گا۔اگر آپ ﷺ اسے اس شکل میں دیکھ لیتے تو آپ ﷺ اسے نہ دیکھ سکتے۔
- طیبی نے لکھا ہے:''مالک نے حضور اکرم ﷺ کو پہلے سلام کیا تا کہ آپ ﷺ کا خوف زائل ہو سکے۔حالانکہ دیگر انبیاء کو پہلے آپ ﷺ نے سلام کیا تھا۔''
- روایت ہے کہ آپ ﷺ آگ کے خازن کے علاوہ جس فرشتے سے بھی ملے وہ آپ ﷺ سے مسکراتا ہوا ملا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ تو آپ ﷺ سے قبل اور نہ ہی آپ ﷺ کے بعد کسی سے مسکراتے ہوئے ملے گا۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَلَیۡهَا مَلٰٓئِکَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ۔ (التحریم:٦)

ترجمہ:''اس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بڑے تند خوسخت مزاج ہیں۔''

یہ فرشتے رب تعالیٰ کے غضب پر مؤکل ہے۔یہ غضب ان سے کبھی بھی زائل نہیں ہوتا۔یہ روایت اس روایت کے معارض ہے جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:''میں نے کبھی بھی میکائیل کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔''حضرت جبرائیل نے عرض کی:''جب سے آگ کو تخلیق کیا گیا ہے۔یہ مسکرائے نہیں۔''یہ روایت اس روایت کے معارض ہے جسے دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نماز میں مسکرائے۔اس کے بارے آپ ﷺ سے پوچھا گیا۔آپ ﷺ نے فرمایا:''میں نے حضرت میکائیل کو قوم کی جستجو میں دیکھا۔ان کے پروں پر غبار تھا۔وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔میں انہیں دیکھ کر

مسکرایا۔" امام سہیلی نے لکھا ہے "جب دونوں روایات صحیح ہیں تو انہیں اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے کہ حضرت میکائیل اس وقت سے نہ مسکرائے جب سے آگ کو پیدا کیا گیا۔ مگر اس وقت وہ حضور اکرم ﷺ کے لیے مسکرائے۔ یہ روایت عام ہو گی جس سے خصوص مراد لیا گیا ہے۔ یا حضور اکرم ﷺ نے پہلی حدیث دوسری حدیث سے پہلے بیان کی ہو۔ پھر ان کے مسکرانے کی بات کی۔"

۷۹ ساتویں معراج جس میں آپ ﷺ نے اقلام کے چلنے کی آواز سنی تھی اس میں مناسبت یہ ہے کہ ہجرت کے نویں سال غزوۂ تبوک ہوا تھا۔ اس میں حضور اکرم ﷺ مدینہ طیبہ سے شام کی طرف تشریف لے گئے۔ اس میں تیس ہزار صحابہ کرام نے شرکت کی۔ آپ ﷺ نے اس غزوہ کو مخفی نہ رکھا۔ بلکہ اعلان فرمایا تاکہ صحابہ کرام اس کے لیے تیاری کر لیں۔ آپ ﷺ نے تیاری میں مکمل کوشش کی۔ نہ تو جنگ کی نوبت آئی نہ ہی آپ ﷺ نے کوئی شہر فتح کیا کیونکہ ابھی تک شام کی فتح کا وقت نہیں آیا تھا۔ عزم تقدیر کی وجہ سے منسوخ ہو گیا۔ قلم خشک ہو گیا۔ آپ ﷺ مدینہ طیبہ لوٹ آئے۔ مسلمانوں پر وقار تھا۔ سکون تھا۔ ان پر اضطراب نہ تھا۔

۸۰ خریف الاقلام سے مراد اقلام کی حرکت ہے۔ ملائکہ ان اقلام کو حرکت دے کر رب تعالیٰ کے فیصلے اور اس کی وحی لکھتے ہیں۔ یا وہ چیز لکھتے ہیں جسے لوح محفوظ سے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ یا جسے رب تعالیٰ چاہتا ہے کہ اسے لکھا جائے اور جس امر کو وہ چاہتا ہے کہ اسے اٹھا دیا جائے۔ اس میں اہل السنۃ کے لیے دلیل ہے کہ یہ صحیح مؤقف ہے کہ وحی اور مقادیر کو ان اقلام سے لوح محفوظ پر لکھ دیا جاتا ہے جن کی کیفیت سے صرف اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح آیاتِ طیبہ اور احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے۔ جو کچھ اس ضمن میں ہے اسے اس کے ظاہر پر رکھا جائے گا لیکن اس کی کیفیت اور جنس سے صرف اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔ یا وہ آگاہ ہے جسے وہ آگاہ کرتا ہے مثلاً اس کے ملائکہ اور رسلانِ عظام۔ جو صرف کمزور ایمان والا ہے وہ اس کی تاویل کرتا ہے اور حیلہ جوئی کرتا ہے۔ کیونکہ شریعت مطہرۃ میں اس کا تذکرہ ہے۔ عقل کی دلیل اس کے مابین

حائل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے جو چاہتا ہے وہ حکم کرتا ہے۔ اسمیں اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت کو عیاں کرنا مقصود ہوتا ہے۔ وہ جس کے لیے چاہتا ہے اپنے غیب کا اظہار کر دیتا ہے ورنہ وہ کتابت اور یاد کرانے سے مستغنی ہے۔

۸۱ ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ یہ بات مشہور ہے کہ اقلام تقادیر لکھتی ہیں۔ تقدیر پہلے سے لکھی جا چکی ہے کتابت حادث ہے۔ روایت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لوح محفوظ کو اس کی کتابت سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے قبل قلم خشک ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ملائکہ کے صحیفوں تک محدود ہے۔ جیسے وہ فروع جنہیں اصل سے منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس میں وہ محو اور اثبات بھی ہے جس کا ذکر اثر میں ہے۔ وہ اصل لوح محفوظ جس سے لوح پر لکھا جاتا ہے وہ قدیمی علم غیب ہے جو ازل سے قدیم ہے۔ اس میں محو و اثبات نہیں ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ نہ لوح ہے نہ قلم۔ آپ ﷺ نے اقلام چلنے کی آواز سنی۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ آپ ﷺ کو قلموں کے خشک ہو جانے پر اطمینان ہو جائے حتیٰ کہ آپ ﷺ امور کو تقدیر کے سپرد کر دیں سبب کے سپرد نہ کریں۔ حتیٰ کہ سبب پر تعبد کی رو سے بحث کی جاتی ہے نہ کہ تعوذ کی رو سے۔ اسی سے توکل مکمل ہوتا ہے۔ اسباب کے اختلاف کے وقت اسی سے اضطراب میں سکون آتا ہے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے: ''جن اقلام کی اس جگہ توصیف کی گئی ہے ان کی اصل وہ قلم ہے جس کی قسم رب تعالیٰ نے اس فرمان میں کھائی ہے:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ (القلم:۱)

ترجمہ: ''قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔''

یہ القلم جنس کے لیے ہوگا۔

۸۲ دسویں معراج جو رفرف ہے۔ جب آپ ﷺ نے رب تعالیٰ سے ملاقات کی۔ حریم ناز میں حاضر ہوئے۔ مقام انس پر فائز ہوئے۔ حجابات اٹھا دیئے گئے۔ آپ ﷺ نے خطاب سنا۔ آپ ﷺ قاب قوسین او ادنیٰ کے مقام پر فائز ہوئے۔ یہ صورت کے اعتبار سے نہیں بلکہ معنی کے اعتبار سے ہے۔ اس میں مناسبت یہ ہے کہ ہجرت کے

دسویں سال دو ملاقاتیں جمع ہوئیں۔ (۱) بیت اللہ سے ملاقات، بیت اللہ کا حج، وقوفِ عرفہ، تکمیل دین اور مسلمانوں پر نعمتوں کی تکمیل۔ (۲) اس میں آپ ﷺ کا وصال ہوا۔ رب تعالیٰ سے ملاقات ہوئی۔ آپ ﷺ دارِ فناء سے دارِ بقاء کی طرف تشریف لے گئے۔ اپنی روح کریمہ کے ساتھ مقعد صدق کی طرف تشریف لے گئے۔ حق کے وعدہ اور وسیلہ کی طرف تشریف لے گئے۔ یہ ایک بلند منصب ہے جو صرف ایک عبد کریم کے لیے مختص ہے۔ وہ عبد کریم حضور اکرم ﷺ کی ذات ہے۔ صحیح روایت میں ہے کہ آپ ﷺ سے وسیلہ کے بارے پوچھا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جنت میں ایک منصب ہے جس پر رب تعالیٰ کا ایک بندۂ خاص فائز ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ وہ عبد خاص میں ہی ہوں گا۔'' آپ ﷺ کی امید پوری ہوگی۔ آپ ﷺ کے دل اقدس کو یہ توفیق ملے گی۔

◆ ابن دحیہ نے لکھا ہے حضور کریم ﷺ کو دیدار اور کلام الٰہی کے لیے مختص کیا گیا کیونکہ آپ ﷺ روزِ حشر کے شفیع ہیں۔ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پہلے ہی اس مقام پر فائز کر دیا تاکہ اس روز آپ ﷺ پر اس طرح خوف طاری نہ ہو جس طرح دیگر انبیاء پر طاری ہوگا۔ رب تعالیٰ نے چاہا کہ آپ ﷺ سے انقباض دور ہو جائے تاکہ آپ ﷺ مقامِ محمود پر فائز ہو سکیں۔ رب تعالیٰ نے اس سے قبل ہی آپ ﷺ کو اپنا دیدار کرا دیا اور کلامِ الٰہی سے بلند منصب پر فائز کر دیا۔

◆ رب تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے آپ ﷺ کو سورۃ البقرۃ کا آخر اپنے عرش کے نیچے خزانہ سے عطا کیا ہے..... تورپشتی نے لکھا ہے: ''اعطی کا معنی یہ نہیں ہے کہ آپ پر نازل ہوا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ التجاء قبول کرلی گئی:

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا

طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ (البقرہ:۲۸۶)

ترجمہ: ''ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔ اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا۔ اور اس پر وبال ہو گا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھول لیں یا خطا کر بیٹھیں۔ اے ہمارے رب! نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں۔ اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر۔ تُو ہی ہمارا دوست (اور مددگار) ہے تو مدد فرما ہماری قوم کفار پر۔''

طیبی نے لکھا ہے ''اس کلام میں یہ اشارہ ہے کہ اعطاء، انزال کے بعد ہو۔ اس سے مراد دعا کا قبول ہونا ہے یہ طلب سے مسبوق ہے۔ کیونکہ یہ سورت طیبہ مکہ میں نازل ہوئی اور معراج بھی مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس کا تعلق اس آیت طیبہ سے ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ (النجم:۳)

ترجمہ: ''اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔''

اسے اعطاء اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس کو کنز تحت العرش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام احمد نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے سورۃ البقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے خزانہ سے عطا کی گئی ہیں۔ یہ مجھ سے قبل کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں۔''

﴿۸۵﴾ شبِ معراج میں نماز فرض کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج پر لے جایا گیا تو اس رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملائکہ کی عبادات ملاحظہ فرمائی۔ ان میں بعض کھڑے تھے۔ وہ بیٹھتے نہیں تھے۔ بعض رکوع میں تھے وہ سجدہ نہیں کرتے تھے۔ بعض

سجدہ میں تھے وہ قعدہ نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ کریم ﷺ کی امت کی ایک رکعت میں یہ ساری عبادات جمع کر دیں، جسے ایک بندہ پورے خلوص اور اطمینان سے اس کی شرائط سے پڑھتا ہے۔

⁨۸۱⁩ نیز اس رات میں یہ عبادت فرض کرنے میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ یہ ایک عظیم الشان عبادت ہے۔ اس لیے اسے بلاواسطہ فرض کیا گیا۔ امام سہیلی لکھتے ہیں: ''نمازوں کو آپ پر حریمِ ناز میں فرض کیا گیا تا کہ ان کی فضیلت آشکارا ہو سکے۔ کیونکہ یہ بارگاہِ قدسیہ میں فرض ہوئیں۔ لہٰذا ان کے لیے پاکیزگی ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے لیے یہ شرط ہے۔ ان میں رب تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے۔ رب تعالیٰ بندے سے ہمکلام ہوتا ہے۔ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری حمد بیان کی ہے۔ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی ہے۔ حریمِ ناز میں ان کے فرض ہونے میں یہی مشابہت ہے۔ کیونکہ وہاں آپ ﷺ نے اپنے رب کا کلام سنا۔ اس سے مناجات کیں۔ آپ ﷺ کے ظاہر اور باطن کو آبِ زمزم سے دھو کر آپ ﷺ کو سیر کرائی گئی۔ اسی طرح نمازی بھی طہارت حاصل کرتا ہے۔ حضور سیاحِ لامکان ﷺ اپنے جسدِ اطہر کے ساتھ اس دنیا سے نکل گئے۔ اس وقت نمازی پر بھی رب تعالیٰ سے مناجات کرنے اور قبلہ رو ہو جانے کے علاوہ ہر چیز حرام ہو جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ آسمان کی طرف تشریف لے گئے۔ اسی طرح نمازی بھی اپنے ہاتھ آسمانوں کی طرف اٹھاتا ہے۔ اس میں بیت المعمور کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں معبودِ برحق کی طرف اشارہ ہے جس سے نمازی سرگوشی کر رہا ہوتا ہے۔ جس کے لیے وہ نماز ادا کر رہا ہوتا ہے۔

⁨۸۲⁩ ''میں نے آپ ﷺ سے پانچ نمازیں کم کر دی ہیں۔'' حضرت ثابت نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت میں دس نمازوں کا ذکر ہے۔ حضرت شریک کی روایت میں "شطرھا" کا تذکرہ ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں: ''اس سے مراد ہے کہ بعض نمازیں کم کر دی گئیں۔ بار بار حریمِ ناز میں جانے پر نمازیں کم ہوتی گئیں۔ یہ روایت حضرت ثابت کی روایت کے مخالف

نہیں ہے۔" حافظ لکھتے ہیں: "اسی طرح دس نمازوں کا ذکر ہے گویا کہ دو بار حریم ناز میں جانے سے دس نمازیں کم ہو گئیں۔ اور پانچ بار جانے سے شطر نمازیں کم ہو گئیں۔ شطر سے مراد بعض ہے۔ حضرت ثابت کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ پانچ پانچ نمازوں کی تخفیف ہوئی تھی۔ یہ زیادتی معتمد ہے۔ باقی روایات کو اسی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ امام بیہقی اور امام ابن خزیمہ نے حضرت ابن صعصعۃ سے جو روایت نقل کی ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھ سے پانچ نمازیں کم کر دی گئیں۔ میں حضرت کلیم اللہ اور رب تعالیٰ کے مابین آتا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ مجھ سے پانچ پانچ نمازیں کم ہوتی گئیں۔" ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ شطر کا لفظ اعم ہے۔ تاکہ یہ شعور نہ ملے کہ یہ نمازیں ایک ہی بار کم کر دیں گئیں۔

- ابو طالب جمحی نے اپنی کتاب "التحیات" میں لکھا ہے "ہر قوم کا سلام کرنے کا اپنا انداز تھا۔ اہلِ عرب کا سلام "السلام" تھا۔ کسریٰ کا سلام اس کے سامنے سجدہ کرنا تھا۔ زمین چومنا تھا۔ اہلِ فارس کا سلام بادشاہ کے سامنے ہاتھوں کو زمین پر پھینکنا تھا۔ حبشیوں کا سلام بادشاہوں کے سامنے ہاتھ سینے پر رکھنا تھا۔ اہلِ روم کا سلام سر جھکا کر سر ننگا کرنا تھا۔ اہلِ نوبہ کا سلام ہاتھوں سے دعا کا اشارہ کرنا تھا۔ اہلِ بجا کا سلام یہ تھا کہ آنے والا بادشاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ اگر وہ خدمت تک پہنچ جاتا تو ہاتھ اٹھا کر بار بار ہاتھ رکھتا۔ یہ سارے انداز اس نماز میں شامل ہیں جو مالک الملوک کے سامنے ادا کی جاتی ہے۔ اس لیے نماز کے آخر میں کہا جاتا ہے "التحیات لِلّٰہ" یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ سارے التحیات کی مستحق وہی ذات ہے۔

- حضرت انس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "رب تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں۔" حضرت ثابت نے حضرت انس سے روایت لکھی ہے "ہر شب و روز میں مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔" کہا جا سکتا ہے کہ دوسری روایت اختصار کے لیے ہے کیونکہ ایک روایت

میں ہے: اللہ نے فرمایا: "میں نے آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی امت پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ آپ ﷺ پر فرض کا ذکر آپ ﷺ کی امت پر فرض کو مستلزم ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس بھی ہے الایہ کہ وہ آپ کی خصوصیت ہو۔

◆ ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے "حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ سے نماز کی تخفیف کے بارے گفتگو نہ کی۔ کیونکہ مقامِ خلت رضا اور تسلیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس طرح کلام کرنا اس منصب کے منافی ہے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے۔ کلیم کو ادلال اور انبساط عطا کیا جاتا ہے۔" امام قرطبی نے لکھا ہے: "اس مقصد کے لیے حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو اس لیے مختص کیا گیا کیونکہ ان کی امت کو نماز کا اس طرح مکلف بنایا گیا کہ اس طرح کسی اور امت کو مکلف نہیں بنایا گیا۔ انہیں یہ بوجھ گراں لگا۔ حضرت کلیم اللہ نے امت محمدیہ پر شفقت فرمائی۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا یہ قول بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے "میں آپ ﷺ سے قبل لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں۔" بعض علماء نے فرمایا ہے کہ شاید اس میں حکمت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے علاوہ کوئی اور نبی نہیں جس کے پیروکار حضرت موسیٰ سے زیادہ ہوں۔ نہ ہی کسی کو اتنی بڑی کتاب دی گئی، نہ ہی کسی کی کتاب میں اتنے جامع احکام تھے۔ اس اعتبار سے یہ حضور اکرم ﷺ کے مشابہ تھے۔ مناسب تھا کہ وہ تمنا کرتے کہ آپ ﷺ پر بھی وہی انعام ہو جو ان پر ہوا تھا۔ وہ اس کے زوال کا ارادہ نہ کرتے۔ یہ بھی مناسب تھا کہ وہ آپ ﷺ کو اس امر سے آگاہ کرتے جو ان کے لیے واقع ہوا تھا۔ اور اس کے بارے خلوص کا اظہار کرتے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جب ابتداء میں حضرت موسیٰ نے جو خواہش کی، اس کا تدارک انہوں نے خلوص اور شفقت کا اظہار کر کے کیا ہو۔ تاکہ ابتداء میں جو کچھ ہوا تھا اس کے غلط وہم پیدا نہ ہو سکے۔ صحیح علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔"

امام قرطبی لکھتے ہیں: "جس شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آپ ﷺ نے نیچے آتے وقت سب سے پہلے حضرت موسیٰ سے ملاقات کی۔ یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن

صعصعۃ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں چھٹے آسمان پر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ساتویں آسمان پر دیکھا۔"

یہ روایت حضرت شریک کی اس روایت سے قوی ہے جس میں ہے کہ آپ نے حضرت موسیٰ کو ساتویں آسمان پر دیکھا۔ حافظ لکھتے ہیں: "اگر ہم یوں کہیں کہ آپ ﷺ نے جاتی دفعہ حضرت موسیٰ کو چھٹے اور واپسی پر ساتویں آسمان پر دیکھا تو یہ اشکال دور ہو سکتا ہے۔"

امام سہیلی نے لکھا ہے "حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے اس امت پر خصوصی شفقت کی تھی۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ اس امت کے لیے شفاعت فرمائیں تخفیف کے لیے التجاء کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انہیں وادیٔ سینا کے مغربی کنارے پر الواح عنایت ہوئیں تو انہوں نے ان میں امت مرحومہ کی صفات پڑھیں۔ انہوں نے کہا: "میں نے الواح میں ایسی امت کا تذکرہ پڑھا ہے جو ان ان صفات کی حامل ہے۔ مولا! اسے میری امت بنادے۔" آپ ﷺ سے فرمایا گیا: "وہ احمد مجتبیٰ ﷺ کی امت ہے۔" اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: "مولا! پھر مجھے ان کی امت میں سے بنادے۔" ان کی اس امت پر یہ خصوصی شفقت اسی لیے تھی۔

◆ ۹۱ حضرت موسیٰ نے آپ ﷺ سے عرض کی: "میں آپ ﷺ سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں۔" یہ اس امر کی دلیل ہے کہ تجربہ کا علم علوم پر زائد ہوتا ہے۔ یہ علوم کی کثرت سے حاصل نہیں ہوتا، یہ صرف تجربہ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا علم سارے لوگوں سے زیادہ ہے۔ سارے لوگوں سے افضل ہیں۔ آپ ﷺ اسی وقت ہی حریم ناز میں اس سے ملاقات کر کے آئے۔ اس جگہ جلوہ افروز ہوئے جہاں نہ کوئی مقرب فرشتہ اور نہ ہی نبی مرسل فائز ہو سکا۔ اس فضل و کرم کے باوجود حضرت موسیٰ نے آپ ﷺ سے عرض کی: "میں لوگوں کے بارے آپ ﷺ سے زیادہ جانتا ہوں۔" اس کا سبب بھی ذکر کر دیا کہ انہوں نے بنو اسرائیل کو خوب آزمایا تھا۔ انہوں نے بتا دیا کہ اس علم کا دارومدار تجربہ پر ہے۔ وہ ان کے پاس زیادہ ہے۔"

۹۲ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ کسی امر کا جو معمول بنایا ہوا ہو اسے کسی دوسری چیز پر لاگو کرنے کی بھی اس میں دلیل ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس امت کے بارے یہ فیصلہ دیا تھا کہ یہ اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکے گی۔ اس کے ثبوت کے لیے انہوں نے بنی اسرائیل کے ساتھ اپنے تجربہ کا تذکرہ کیا۔ وہ قوم بعد میں آنے والی قوم سے زیادہ قوی اور مضبوط تھی۔ ارشادِ ربانی ہے:

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا۔ (الروم:۹)

ترجمہ: ''وہ زیادہ تھے ان سے زور میں اور انہوں نے خوب ہل چلائے زمین میں اور انہوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے اسے آباد کیا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ جو بوجھ قوی نہ اٹھا سکا اسے کمزور بدرجہ اولیٰ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ بات معمول کے رواں کرنے میں حکمت کے اثر سے محکم ہے۔ جبکہ قدرت اس پر قادر ہے کہ کمزور سے وہ بوجھ اٹھوا دے جو قوی نہ اٹھا سکے۔ روایت ہے کہ بنو اسرائیل پر دو رکعتیں صبح اور دو رکعتیں شام کو فرض تھیں مگر وہ یہ بوجھ نہ اٹھا سکے تھے۔

۹۳ اس امت کے لیے تخفیف کرانا اس امر کی دلیل ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوپر تشریف لے گئے تھے تو حضرت کلیم اللہ کا رونا اسی وجہ سے تھا جس کا ہم نے تذکرہ کر دیا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور سبب ہوتا تو وہ اس وقت بھی روتے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لائے تھے یا خاموش رہتے۔ بلکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اور خلوص کے اظہار کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ان عطیات میں سے ایک عطیہ تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مختص تھے۔ انہوں نے اس امت پر تخفیف کرنے پر تعرض کیا تھا۔ یہ عطیہ بالکل اپنی درست جگہ پر عیاں ہوا۔ کیونکہ اس امت کی خصوصیت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارے گفتگو کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت کو پورا کر دیا گیا۔ رب تعالیٰ نے التجاء قبول کر لی۔ نمازیں پچاس سے کم ہو کر پانچ رہ گئیں۔ فضل و کرم کا اضافہ ہو گیا۔ ایک نیکی

کا اجر دس گنا ہو گیا۔ رب تعالیٰ نے اس امت سے ان نمازوں کے فرض کو زائل کر دیا لیکن فضل و احسان کرتے ہوئے ان کا ثواب باقی رکھا۔

(۹۴) ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے کہ اس روایت میں صوفیائے کرام کے اس فرمان کی دلیل ہے کہ ابرار کی نیکیاں مقربین کی برائیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ کیونکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے اس ضمن میں کوئی گفتگو نہ کی کیونکہ ان کا مقام بلند تھا۔ اگر وہ یہ بات کرتے تو یہ ان کے بلند مقام کے زیبا نہ ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ گفتگو کی جو ان کے مقام کے ساتھ مختص تھی۔ ہر ایک کا خاص مقام تھا جس سے اس نے تجاوز نہ کیا۔

(۹۵) ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی بار بار ملاقات میں کئی فوائد ہیں۔ (۱) ایک ہی داستان میں شفاعت کا تکرار تاکہ شافع کا مقصود پورا ہو سکے۔ (۲) جب معاملہ اصرار کی حد تک پہنچ جائے تو اس کو ترک کرنا بہتر ہوتا ہے (۳) اس امر کی تعظیم جس پر قدرت نہ ہو (۴) ناصح مشیر کی طرف رجوع کرنا۔ (۵) شافع، مشفوع لہ کی طلب پر توقف نہ کرے (۵) اگر عذر ہو تو شافع مشفوع لہ کے سامنے بیان کر دے (۶) شفاعت سے نہ روکا جائے اگرچہ وہ شخص اس میں شامل بھی ہو۔

(۹۶) جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے دسویں بار جانے کے لیے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ گئے۔ اس کے دو اسباب ہیں: (۱) جب معاملہ اصرار کی حد تک پہنچ جائے تو اسے ترک کرنا اولیٰ ہوتا ہے۔ (۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نورِ فراست سے سمجھ لیا تھا کہ نمازیں اس سے کم نہ ہوں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حیاء کی اور التجاء نہ کی۔ فراست کی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے پانچ پانچ کی تخفیف کی۔ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ اگر وہ آخری پانچ بھی تخفیف کر دیتا تو ساری نمازیں ختم ہو جاتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ جانتے تھے کہ کسی نہ کسی وظیفہ کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا سوال کو ترک کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے غیب منکشف ہوا کہ علم قدیم ان پانچ نمازوں کی بقاء کے ساتھ ہے۔ لہٰذا وہ باقی رہیں۔ فراست نے سچ کہا۔ غور و فکر صحیح نتیجہ تک پہنچا۔ روایت ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دسویں بار حریم ناز میں جانے

سے رک گئے تو منادی نے ندا دی: ''میں نے اپنا فریضہ لاگو کر دیا ہے۔ اپنے بندوں سے تخفیف کر دی ہے۔''

(۹۷) ابن دحیہ نے لکھا ہے ''آپ ﷺ بار بار حریمِ ناز میں جاتے رہے کیونکہ آپ ﷺ کو علم تھا کہ ہر بار امر علی سبیل الالزام نہیں ہے۔ صرف آخری بار حکم الزام کے اعتبار سے تھا۔ جیسے کہ ارشادِ ربانی ہے:

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ (ق:۲۹)

ترجمہ: ''میرے ہاں حکم بدلا نہیں جاتا اور نہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرتا ہوں۔''

(۹۸) ابن ابی جمرۃ نے لکھا ہے ''حضور اکرم ﷺ دسویں بار تخفیف کے لیے نہ گئے۔ اس میں یہ دلیل ہے جب رب تعالیٰ کسی بندے کی سعادت مندی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا اختیار رب تعالیٰ کی رضا میں رکھ دیتا ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے اپنا اختیار اور ترجیح رب تعالیٰ کی رضا میں رکھ دی تھی۔ وہ پانچ نمازوں کی فرضیت ہے۔ یہ آپ ﷺ کی تکریم اور رفعتِ شان کے لیے ہے۔ اگر آپ ﷺ تخفیف کے لیے واپس جاتے لیکن تخفیف نہ کی جاتی تو آپ ﷺ کا اختیار تقدیر کے مخالف ہوتا۔ جب آپ ﷺ کو اختیار دیا گیا۔ اختیار میں آپ ﷺ کی منشاء پوری کر دی گئی تو یہ وہی دلیل ہے جس سے ہم نے استدلال کیا ہے۔ یہ آپ ﷺ کی رفعتِ شان ہے۔ آپ ﷺ نے جب تخفیف کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ کی رضا پوری کر دی گئی۔ ہر دو حالات، طلب یا عدم طلب میں آپ ﷺ کا اختیار تقدیر کے موافق تھا۔ اس میں صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے لیے یہ دلیل بھی ہے کہ حال حامل ہوتا ہے محمول نہیں ہوتا۔'' جب آپ ﷺ پر اپنی امت پر شفقت کرنے کا حال وارد ہوا تو آپ ﷺ نے تخفیف کے لیے جلدی کی۔ کسی طرف نہ دیکھا۔ جب رب تعالیٰ سے حیاء کا حال وارد ہوا تو امت کے لیے توجہ نہ کی نہ ہی کسی چیز کی التجاء کی۔

(۹۹) اس حدیث پاک میں اس امر کی دلیل ہے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں جیسے کہ ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے (۱) وہ تقدیر جس کے بارے میں یہ مقدر ہے کہ وہ کسی واسطہ یا دعاء کی وجہ

سے نافذ نہ ہو سکے گی۔ جیسے کہ اس جگہ پچاس نمازیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے پہلے پچاس نمازوں کا حکم دیا۔ اس کا ارادہ سبقت لے گیا کہ ان کا نفاذ نہ ہو۔ رب تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو سبب بنا دیا۔ (۲) وہ تقدیر جن کا نفاذ مقدر ہو چکا ہے۔ کوئی لوٹانے والا اسے نہیں لوٹا سکتا۔ وہ پانچ نمازوں کا فرض ہونا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے جب ان کا حکم دیا تو اس کا ارادہ سبقت لے گیا یہ نافذ ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام نفع نہ دے سکا۔

(۱۰۰) ابن دحیہ نے لکھا ہے کہ اگر تم کہو کہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا معنی ہے:

مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ۔ (ق:۲۹)

ترجمہ: ''میرے ہاں حکم بدلا نہیں جاتا۔''

اگر اس سے مراد یہ ہو کہ خبر تبدیل نہیں ہوتی تو پھر بات کو مطلق کیسے رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ احکام کی بات ہو رہی ہے۔ اسی لیے پچاس نمازوں کو پانچ میں تبدیل کیا۔ نسخ کا تبدیل ہونا باقی نہیں رہتا۔ اگر مراد یہ ہو کہ حکم تبدیل نہیں ہوتا تو یہ بات طے ہے کہ احکام میں نسخ جائز ہے۔ جیسے کہ نمازیں پانچ رہ گئیں تھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب رب تعالیٰ کسی حکم کے بارے بتا دے کہ وہ ابدی ہے تو اس کی تبدیلی اور نسخ محال ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے یہ خبر دی ہے کہ یہ ابدی ہے۔ خبر تبدیل نہیں ہوتی نہ ہی اس کے بعد نسخ کی توقع ہو سکتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ملائکہ کی زبانوں سے یا ان کے صحیفے میں اس امت کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ انہیں ہر روز پچاس نمازوں کا اجر و ثواب ملے گا۔ جب نمازیں پانچ کر دیں تو ان کی تعداد کم ہو گئی لیکن اجر میں کمی نہ ہوئی۔ کیونکہ ایک نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ تعداد کے اعتبار سے پانچ نمازیں اور اجر کے اعتبار سے پچاس ہیں۔ یہ اللہ رب العزت کا فضل ہے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی طرح ہے: ''جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھے، پھر شوال کے چھ روزے رکھے، اس نے گویا کہ پورے سال کے روزے رکھے۔''

اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ ایک نیکی کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ چھتیس روزوں کو دس سے ضرب دیں تو یہ تین سو ساٹھ بنتے ہیں۔ ایک سال میں اتنے ہی دن ہوتے ہیں۔

نیز اس چیز کا اعتبار بھی کیا گیا کہ نماز میں جس کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً وضو وغیرہ۔ اس کے لیے وہ کچھ پایا گیا جو دو ساعتوں اور ایک ساعت کے بعض حصہ میں جو کچھ آتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر امت مرحومہ پر پچاس نمازیں برقرار رکھی جاتیں تو سارا دن اور ساری رات نماز کی ضروریات میں گزر جاتا۔ کیونکہ ابتداء میں ہر نماز کے لیے وضوء ضروری تھا۔ پھر اسے مستحب قرار دیا گیا۔ گویا کہ اس امت کا ایک شخص ان پانچ نمازوں کی وجہ سے ہمہ وقت نماز میں رہتا ہے جیسے کہ رمضان المبارک کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے والا پورا سال روزہ سے رہتا ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ پچاس نمازوں سے پانچ نمازوں کی طرف کمی کا تعلق تبدیل القول سے نہیں بلکہ تبدیل تکلیف ہے۔ البتہ پانچ نمازوں کے بعد پچاس کی خبر دینا تبدیل اخبار ہے۔

(۱۰۱) ابوخطاب اور ابن منیر نے لکھا ہے کہ اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ دخولِ وقت سے قبل، فعل کے تمکن سے قبل نسخ جائز ہے۔ اس میں معتزلہ کا اختلاف ہے۔ ہر گروہ نے اپنے قاعدے اور عقیدہ کے مطابق گفتگو کی ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک خلاف استطاعت مکلف بنانا جائز ہے۔ بلکہ یہ واقع ہوتا ہے کیونکہ سارے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہیں۔ بندہ کسی فعل کی تخلیق پر قدرت نہیں رکھتا۔ نہ ہی اس کی حفاظت کے لیے اس میں تاثیر پیدا کرنا ممکن ہوتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ (الصافات:۹۶)

ترجمہ: ''حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور جو کچھ تم کرتے ہو۔''

اس آیت طیبہ میں ''ما'' مصدریہ ہے لیکن اس ''ما'' کو موصولہ کہتے ہیں۔ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق کہتے ہیں ''انسان اپنے فعل کی تخلیق خود کرتا ہے۔ وہ اپنے اختیار اور استطاعت کے مطابق اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے۔ ان کے نزدیک خلافِ

استطاعت پر تکلیف ساقط نہیں ہوتی۔ان کے نزدیک تمکن سے قبل نسخ کا تصور بھی نہیں ہے۔جیسے کہ اس کے قاعدہ کا تصور ہو سکتا ہے۔لیکن اہلِ سنت کے نزدیک تمکن سے قبل نسخ جائز ہے۔کیونکہ یہ واقع ہوا ہے۔وقوع سے بڑھ کر اور اس کے جواز کی دلیل کیا ہو سکتی ہے؟

انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح ہونے کے واقعہ کو بطور دلیل پیش کیا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں۔پھر اس میں تخفیف کر دی۔اسے فدیہ سے منسوخ کر دیا حالانکہ وہ وقت نہیں گزرا تھا جس میں انہیں ذبح کیا جا سکتا تھا۔

اس دلیل سے معتزلہ مختلف مشکلات میں گر پڑے حتیٰ کہ انہوں نے حقائق کو خلط ملط کر دیا۔اس کے مختلف جوابات دیے۔بعض نے کہا: ''انہیں ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔کیونکہ یہ خواب تھا۔عالم بیداری میں نہ تھا۔اس شخص کی عقل سے زیادہ کسی کی عقل زیادہ گمراہ نہیں جو یہ کہتا ہے کہ ایک واقعہ میں کسی نبی کو مغلوب کر لیا گیا۔حالانکہ اس واقعہ کا ظہور اس نبی سے ہوا تھا۔اس نے ہی وہ فیصلہ کیا تھا۔اس سے ہی اس کا صدور ہوا تھا۔حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام نے کہا تھا۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ (الصافات:۱۰۲)

ترجمہ: ''میرے پدر بزرگوار! کر ڈالیے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے۔''

ہم کہتے ہیں کہ حدیث پاک کا راوی اس کی تاویل اور تشریح کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔حتیٰ کہ اگر دو تاویلوں میں اختلاف ہو جائے تو ہم صاحب واقعہ کی تاویل کو معلوم کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کے بارے سب سے زیادہ جانتا ہے۔حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام جو ایک پاکباز اور راست گو نبی تھے ان کی اس تاویل کو جسے رب تعالیٰ نے درست اور صحیح قرار دیا اس شخص کی تاویل سے کیسے مقدم نہیں کیا جائے گا جو بدعتی، گمراہ اور مبہوت ہے؟

بعض معتزلہ نے کہا ہے ''یہ حکم ہے لیکن ابتدائی امور جیسے پکڑنا، باندھنا، لٹانا اور چھری

پکڑنے کے بارے حکم ہے۔لیکن یہ دلیل بھی سابقہ دلیل کی طرح بے سروپا ہے۔
جیسے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُكَ۔ (الصافات:۱۰۲)

ترجمہ:''میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔''

انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں لٹا رہا ہوں۔نیز یہ کہ یہ مقدمات ''لا'' کے ساتھ نہیں ہیں۔خصوصاً حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے حق میں۔کیونکہ انہیں علم تھا کہ مقصد صرف اس طرح حاصل نہ ہوگا جیسا کہ اس طرح لٹانا جیسے ذبح کے لیے نہیں لٹایا جاتا ہے۔یہ صحیح راستہ سے پہلوتہی ہے۔اور سرکشی اور عناد کی طرف رجحان ہے۔

بعض معتزلہ کہتے ہیں:''انہیں ذبح کا حکم دیا گیا تھا۔انہوں نے یوں کر بھی دکھایا تھا۔ لیکن چھری الٹی ہوگئی اور اس نے نہ کاٹا۔یا حضرت ذبیح اللہ کی گردن لوہے کی بن گئی۔یہ بھی بے تکی دلیل ہے۔اس کا لب لباب یہ ہے کہ اندازے سے نقل کرنا بھی کذب ہے۔
بعض نے لکھا ہے کہ وہ ذبح ہو گئے تھے۔پھر زخم بھر گیا تھا۔یہ مؤقف بھی عقل اور نقل کے خلاف ہے۔اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو آیت طیبہ میں یوں کہنے پر اقتصار نہ کیا جاتا:

وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِیۡنِ۝۱۰۳ (الصافات:۱۰۳)

ترجمہ:''اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔''

نیز ذبح کے ذکر میں زیادہ آزمائش ہے۔اور فدیہ کا فائدہ ساقط ہو جاتا ہے۔مذکورہ بالا تمام دلائل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمکن سے قبل نسخ جائز ہے۔شبِ معراج کی داستان سے اس کی تردید کرنا ممکن نہیں ہے۔کیونکہ اس میں کوئی خفاء نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پچاس نمازیں پڑھیں۔پھر نماز کا وقت ہونے سے قبل اسے منسوخ کر دیا گیا جسے منسوخ کر دیا گیا۔

امام سہیلی لکھتے ہیں''اللہ تعالیٰ نے پہلے پچاس نمازیں فرض کیں۔پھر دس دس کی کمی کر کے صرف پانچ کو باقی رکھا۔دوسری روایت میں ہے کہ پانچ پانچ کی کمی کی گئی۔ان

دونوں روایات کو جمع کرنا ممکن ہے کیونکہ پانچ بھی دس میں شامل ہیں۔اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اسے نسخ کہیں گے یا نہیں۔ایک طبقہ کہتا ہے کہ اس کا تعلق عمل سے قبل عبادت کے نسخ سے ہے۔لیکن ابوجعفر النحاس نے اس کا رد کیا ہے۔انہوں نے اس رد کی بنیاد دو ستونوں پر رکھی ہے۔ان کا اصول اور نقطۂ نظر یہ ہے کہ عبادات ان پر عمل پیرا ہونے سے قبل منسوخ نہیں ہوتیں۔کیونکہ ان کے نزدیک یہ البداء ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی ذات پر محال ہے۔(۲) اگر بعض کے نزدیک عبادت کا اس پر عمل پیرا ہونے سے قبل نسخ جائز بھی ہو۔پھر بھی کسی کے نزدیک اس کا نسخ زمین پر پہنچنے سے قبل اور مخاطبین سے پہنچنے سے پہلے جائز نہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ نسخ کا یہ دعویٰ علامہ قاشانی اور ان کے ہم نوا علماء نے کیا ہے۔تاکہ ان کا موقف درست ثابت ہو جائے کہ بیان مؤخر نہیں ہوتا۔لیکن یہ تو ایک شفاعت تھی جو حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کے لیے کی تھی۔یہ اپنے پروردگار سے ایک التجا تھی کہ وہ اس امت مرحومہ سے تخفیف کرے۔اس لیے اسے نسخ نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن علامہ ابوجعفر النحاس کا یہ موقف درست نہیں ہے کہ عبادات کا نسخ ان پر عمل پیرا ہونے سے قبل نہیں ہو سکتا۔ان کا اسے البداء کہنا بھی درست نہیں۔کیونکہ بداء کی حقیقت یہ ہے کہ کسی آمر کے لیے ایک حقیقت ظاہر ہو جو اسے درست معلوم ہو۔حالانکہ اسے پہلے اس میں کوئی صحت نظر نہ آتی تھی۔یہ اس ذات پاک کے لیے محال ہے جو اشیاء کو علم قدیمی اور علم ازلی سے جانتی ہے۔اس میں نسخ نامی کوئی چیز نہیں ہے۔کیونکہ نسخ تو ایک حکم کو دوسرے حکم سے تبدیل کرنا ہوتا ہے۔یہ سب کچھ ذاتِ باری تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے۔اس کی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہوتا ہے۔جس طرح کہ مرض کو صحت اور صحت کو مرض میں تبدیل کرنا۔دوسری وجہ یہ ہے کہ عبد مامور پر جب کوئی حکم لاگو ہوتا ہے تو اس کے لیے تین امور کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔(۱) وہ فعل کا علم جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔(۲) حکم سنتے وقت اس پر عمل پیرا ہونے کا عزم۔

(۳) اگر وہ حکم واجب ہو تو اس کے وجوب کا عقیدہ رکھنا۔ اگر فعل سے قبل ہی منسوخ کر دیا جائے تو اس طرح صرف دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ عزم اور وجوب کا اعتقاد۔ اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ ہے کہ بندہ اپنی آزمائش اور امتحان میں پورا اترتا ہے۔ اسے اس کی نیت کے مطابق اجر و ثواب دیا جاتا ہے بلاشبہ امر کا نسخ اس کے نزول سے پہلے جائز نہیں نہ ہی مخاطب کے علم سے پہلے جائز ہے۔ جس نسخ کا ذکر علامہ نحاس نے کیا ہے وہ نسخ کی حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عبادت جس کا اسے حکم دیا گیا تھا وہ منسوخ ہو چکی ہے۔ ہمارے نزدیک حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی امت مرحومہ سے پینتالیس نمازوں کا ختم ہو جانا دو اعتبار میں سے ایک لحاظ سے ہے۔ (۱) یا تو حضور ﷺ سے ان کی ادائیگی منسوخ ہوگی۔ اس طرح آپ ﷺ سے عزم اور وجوب کا اعتقاد رکھنا بھی ختم ہو جائے گا۔ یہی حقیقت میں نسخ ہے۔ اس سے اس کی تبلیغ بھی آپ ﷺ سے منسوخ ہو جائے گی۔ کیونکہ آپ ہر اس چیز کی تبلیغ پر حریص تھے جس کا آپ ﷺ کو حکم دیا جاتا۔ ابو جعفر نحاس کا یہ قول کہ یہ ایک سفارش اور شفاعت تھی اس سے نسخ کی نفی ہو جاتی ہے۔ درست نہیں۔ کیونکہ نسخ کبھی کبھی ایک مشہور سبب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی شفاعت ہی آپ کے لیے نسخ کا سبب بنی۔ یہ حقیقت میں نسخ کو باطل کرنے والی نہیں۔ صرف اس تبلیغ کا حکم آپ ﷺ سے منسوخ ہوا ہے۔ جو نسخ سے قبل آپ ﷺ پر واجب تھی۔ پانچ نمازوں کا حکم دینا آپ ﷺ کے خواص میں سے ہے۔ جہاں تک آپ ﷺ کی امت کا تعلق ہے تو اس سے کوئی حکم منسوخ ہی نہیں ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس سے صرف خبر دینا مقصود ہو عبارت مقصود نہ ہو۔ اگر یہ صرف خبر ہو تو اس میں نسخ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ خبر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کو خبر دی کہ آپ ﷺ کی امت پر پچاس نمازیں فرض ہیں۔ یعنی وہ لوح محفوظ پر پچاس نمازیں ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں فرمایا: ”یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن ان کا اجر پچاس جتنا ہے۔ ایک نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ حضور ﷺ نے

یہ تاویل کی کہ بالفعل پچاس نمازیں فرض ہیں۔ پھر آپ ﷺ بارگاہِ صمدیت میں جاتے رہے حتیٰ کہ رب تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ پچاس نمازیں ثواب کے اعتبار سے ہیں عمل کے اعتبار سے نہیں ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہ ازروئے خبر ہو، ازروئے عبادت نہ ہو۔ اگر یہ خبر ہو تو پھر اس میں نسخ کا عمل دخل نہیں ہے۔ خبر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بتایا ہو کہ آپ ﷺ کی امت پر پچاس نمازیں فرض ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ لوحِ محفوظ میں پچاس ہیں۔ جیسے کہ روایت کے آخر میں ہے۔ "یہ پانچ پچاس ہی ہیں۔ ایک نیکی کا اجر وثواب دس گنا ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی یہ تاویل فرمائی کہ یہ فضیلت کے اعتبار سے پچاس ہیں۔ آپ ﷺ حریمِ ناز میں تشریف لے گئے حتیٰ کہ آپ ﷺ کو بیان کردیا گیا کہ یہ ثواب کے اعتبار سے پچاس ہیں نہ کہ عمل کے اعتبار سے۔

(۱۰۲) اس تفصیل سے عیاں ہوگیا ہے کہ فعل کا نسخ اس کے تمکن سے قبل جائز ہے۔ یہ آپ کے حق میں تو صحیح ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی امت کے حق میں صحیح نہیں۔ کیونکہ ابلاغ سے قبل نسخ محال ہے۔ کیونکہ تکلیف کے لیے شرط ہے کہ مکلف کو علم کے ساتھ تمکین حاصل ہو۔ جب اس کے لیے علم شرط نہ ہو تو ابلاغ سے قبل تکلیف کا نسخ اس کے تناقض میں سے ہے۔ ابن دحیہ لکھتے ہیں: "آپ ﷺ کی امت کے حق میں بھی نسخ صحیح ہے۔ کیونکہ اسلام ہر مسلمان پر لازم قرار دیتا ہے کہ اسلام کی فروعات اور دین کی ساری شرائع میں ان کی تفصیل کے ساتھ داخل ہو جائے ہر وہ شخص جو اپنی زندگی میں ایمان لے آیا وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ حالانکہ ابھی تک ایسے احکام تھے جن کا ابھی تک نزول نہیں ہوا تھا اور جو نہ ہی پوری طرح بیان کیے گئے تھے۔ ان میں سے بعض ایک اعتبار سے مجمل اور دوسرے اعتبار سے مبیّن نازل ہوئے تھے۔ بعض ابھی تک نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا نزول بعد میں ہوا تھا۔ ایمان اور التزام تو سب کو شامل ہے جس طرح ابلاغ کے بعد نسخ جائز ہے اسی طرح ابلاغ سے قبل بھی نسخ جائز ہے۔ اکثر احکام پہلے مجمل واجب ہوئے۔ بعض میں ضرورت کے وقت ان کی تفصیلات

بیان کی گئیں۔ جیسے نماز اور زکوٰۃ۔ وجوب کی ابتداء میں ان کی تعداد اور تیاری کے متعلق نہ بتایا گیا۔ نہ ان کے اوقات نہ ہیئت اور نہ ہی شرائط کے بارے بتایا۔ ان اجمالات کے باوجود تکلیف برقرار تھی۔ کیونکہ التزام اول کے ساتھ ہی مکلف ان کے التزام میں داخل ہو گیا تھا خواہ وہ امر جیسا بھی تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا جس نے آپ ﷺ سے اسلام کے بارے سوال کیا تھا "تو یہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ تم فرض نماز ادا کرو۔ فرض زکوٰۃ دو۔ رمضان المبارک کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج ادا کرو۔" ان مجمل اور غیر مبین قواعد کی وجہ سے اس پر تکلیف مکمل ہو گئی۔

(۱۰۳) ابن دحیہ نے لکھا ہے "جب تم علماء کو سنو کہ وہ فعل سے قبل نسخ پر گفتگو کر رہے ہوں تو جان لو کہ ان کا ارادہ ہے کہ یہ نسخ اس زمانہ کے گزرنے سے قبل وہ پہلے فعل کی وسعت رکھتا ہو۔ اسی میں اختلاف ہے۔ وہ ہر متفق علیہ نسخ کا فعل سے قبل کا ہی تصور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو ہو گیا وہ گزر گیا۔ اس کی تکلیف ختم اور اس کا نسخ بھی ختم۔ اگر تم انہیں یوں کہتے ہوئے سنو: "ابلاغ سے قبل تکلیف کا نسخ متعذر ہوتا ہے کیونکہ ابلاغ تکلیف کے لیے شرط ہے۔ تو جان لو کہ ان کا ارادہ یہ ہے کہ تکلیف کی تکمیل ہو۔ ابلاغ کے ساتھ یہی مشروط ہے۔ ہمارے نزدیک اصل تکلیف اس پر موقوف نہیں ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ امر قدیمی ہے۔ وہ مامور کے وجود سے بھی پہلے محقق ہے چہ جائیکہ اس کا ابلاغ ہو۔

(۱۰۴) بعض عارفین نے لکھا ہے: "جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں محبت متمکن ہو گئی ان کے لیے طور کے انوار روشن ہو گئے تاکہ وہ انہیں حاصل کر سکیں لیکن روک دیا گیا۔ جب انہیں ندا دی گئی انہیں منادی کا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ بنو اسرائیل میں یہ کہتے ہوئے گھوما کرتے تھے "کون میرا بوجھ اٹھائے گا حتیٰ کہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا دوں۔" ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اپنے حبیب کے ساتھ مناجات کو طول دے سکیں۔ جب شب معراج حضور اکرم ﷺ کا گزر ان کے پاس سے ہوا تو انہوں نے آپ ﷺ کو حریم ناز میں بھیجا تاکہ وہ بار بار حبیب کے حبیب کی زیارت سے شاد کام ہو سکیں۔" ایک

عارف نے لکھا ہے "جب حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے دیدار کا سوال کیا تو ان کی یہ التجاء پوری نہ ہوئی۔ یہ شوق انہیں مضطرب رکھتا تھا۔ یہ امید ان کی آتش شوق کو بھڑکاتی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیدارِ الٰہی نصیب ہوا ہے اور ان کے لیے فضیلت کا دروازہ کھلا ہے تو انہوں نے کثرت سے سوال کیا تاکہ اس ہستی کی زیارت کر لیں جس نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا ہے۔

واستفشق الارواح من نحو ارضکم
لعلّی اراکم او اری من یراکم
و انشد من لاقیت عنکم عساکم
تجوودون لی بالعطف منکم عساکم
فانتم حیاتی ان حییت و ان امُتْ
فیا حبذا ان متُّ عبد هواکم

ترجمہ: "تمہاری سرزمین سے آنے والی ارواح کا میں مشتاق رہتا ہوں کہ شاید میں تمہیں دیکھ لوں یا انہیں دیکھوں جنہوں نے تمہاری زیارت کی ہو۔ میں جس سے ملاقات کرتا ہوں اسے تمہارے بارے پوچھتا ہوں کہ شاید تم مجھ پر بھی کرم نوازی کر دو۔ پس! تم میری زندگی ہو۔ اگر میں زندہ رہوں۔ اگر میں مر جاؤں تو اگر میں تمہاری محبت کی غلامی میں مروں تو پھر یہ کتنی اچھی موت ہے۔"

ایک اور شاعر نے لکھا ہے:

و انمّا السِرُّ فی موسی یردّدہٗ
لیجتلی حسن لیلی حین یشھدہٗ
یبدہ سناھا علی وجہ الرسول
فیا للہ درّ رسول حین اشھد

ترجمہ: "حضرت موسیٰ نے آپ کو بار بار لوٹایا تاکہ وہ اپنے حبیب کا حسن پوری طرح دیکھ لیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر اس کا حسن عیاں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

کیا ہی شان تھی جب میں نے آپ کی زیارت کی۔"

ایک عارف نے لکھا ہے: "جب حبیب لبیب ﷺ مقامِ قرب پر تشریف فرما ہوئے۔ محبت کے جام گردش میں آئے۔ جب واپس آئے تو "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾" (النجم: ۱۱) کا چاند چشمانِ مقدس کے مابین عیاں تھا۔ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴿۱۰﴾ (النجم: ۱۰) کی بشارت نے آپ ﷺ کے قلبِ انور اور مبارک کانوں کو بھر دیا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا گذر آپ ﷺ کے پاس سے ہوا تو انہوں نے زبانِ حال سے آپ ﷺ سے عرض کی:

يا واردًا من اهيل الحيِّ يخبرني
عن جيرتي شَنِّفْ الاسماع بالخبر
ناشدتك الله يا راوي حديثهم
حدّث فقد ناب سمعي اليوم عن بصري

ترجمہ: "اے قبیلے کے ٹیلے پر اترنے والے مجھے میرے پڑوسیوں کے بارے بتاؤ ان کی خبر دے کر میرے کانوں کو محظوظ کرو۔ اے ان کی داستان بیان کرنے والے! ان کی حکایت شوق سناؤ۔ آج میرے کان میری بصارت کے نائب بن چکے ہیں۔"

حضور اکرم ﷺ نے انہیں زبانِ حال سے فرمایا:

و لقد خلوت مع الحبيب و بيننا
سرّ ارق من النسيم اذا سرٰى
و اباح طرفي نظرة املتها
فغدوت معروفا و كنت منكّراً

ترجمہ: "میں نے اپنے یار کے ساتھ تنہائی میں ملاقات کی۔ ہمارے مابین ایک ایسا راز بھی ہے جو بادِ نسیم سے بھی زیادہ نرم اور رقیق ہے۔ جب وہ چلے۔ اس نے میری طرف نظرِ کرم کی۔ جس کی مجھے امید تھی۔ میں معروف ہو گیا حالانکہ پہلے مجھے کوئی جانتا ہی نہ تھا۔"

(۱۰۵) آپ ﷺ نے فرمایا: "جب میں واپس لوٹا تو یہ صدا دی گئی: "میں نے اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے۔ میں نے اپنے بندوں سے تخفیف کر دی ہے۔" اس سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے شبِ معراج بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے شرفِ ہمکلامی حاصل کیا تھا۔

(۱۰۶) حضرت شریک کی روایت کا ظاہر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے آپ ﷺ سے عرض کی تھی: "آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر نیچے تشریف لے جائیں۔" کیونکہ انہوں نے اس کے بعد آپ ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے "میں نمازوں کی تخفیف کے لیے حریمِ ناز میں اتنی بار گیا ہوں کہ اب مجھے حیاء آتی ہے۔" لیکن صحیح موقف یہ ہے کہ یہ گذارش حضرت جبرائیل امین نے کی تھی۔ داؤدی نے اسی کو یقین کے ساتھ لکھا ہے۔

(۱۰۷) امام سہیلی نے لکھا ہے "اگر یہ کہا جائے کہ اس پیالے سے پانی پینا کیسے مباح تھا جو کسی اور کی ملکیت میں تھا۔ اس وقت تک نہ کفار کی املاک اور نہ ہی ان کے خون بہانے مباح ہوئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہلِ عرب کی عادت یہ تھی کہ وہ مسافروں کے لیے صرف پانی ہی نہیں بلکہ دودھ بھی مباح قرار دیتے تھے۔ وہ اپنے چرواہوں کو مقرر کرتے وقت یہ شرط عائد کرتے تھے کہ مسافر کو دودھ سے بھی منع نہ کریں۔ یہ تو پانی ہے۔ عرف کا حکم شریعت میں اصول ہوتا ہے۔ امام بخاری نے کتاب البیوع میں روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ہند بنت عتبہ سے کہا تھا:

"بھلائی کے ساتھ اتنا لے لیا کرو جو تمہارے لیے اور تمہاری اولاد کے لیے کافی ہو۔"

ہمارے آئمہ نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے لیے کسی دوسرے کا کھانا اور پانی لینا حلال ہے۔ مالک کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پانی آپ ﷺ پر قربان کر دے۔ جیسے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (الاحزاب:٦)

ترجمہ: "نبی (کریم) مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔"

(۱۰۸) سورج کے روک لینے کے معجزہ کا تذکرہ معجزات میں آئے گا۔

(۱۰۹) آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد اقصیٰ میرے سامنے آ گئی۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔"
امام احمد، امام نسائی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے اسی طرح روایت کیا ہے۔
امام مسلم نے حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "قریش نے اس وقت مجھے کچھ اشیاء کے بارے پوچھا جو میرے پاس محفوظ نہ تھیں۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوا۔ اتنا غمزدہ میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رب تعالیٰ نے مسجد کو اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ قریش مجھ سے جس چیز کے بارے بھی سوال کرتے میں اس کی طرف دیکھ کر انہیں بتا دیتا۔" حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "رب تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے لیے عیاں کر دیا۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر لوگوں کو بتا رہا تھا:" یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اور مسجد اقصیٰ کے مابین سے حجابات اٹھا دیے تھے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے اسے دیکھ لیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مسجد اقصیٰ کو اٹھا کر آپ ﷺ کے سامنے رکھ دیا گیا ہو حتیٰ کہ آپ ﷺ اسے دیکھ رہے ہوں۔ حضرت ابن عباس کی سابقہ روایت سے یہی عیاں ہوتا ہے۔ یہ زیادہ بلیغ معجزہ ہے۔ یہ محال نہیں ہے۔ بلقیس کا عرش آنکھ جھپکنے سے قبل حاضر کر دیا گیا تھا۔
حضرت ام ہانی سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "بیت المقدس میرے تصور میں آ گیا۔ میں قریش کو اس کی علامات بتانے لگا۔" اس میں یہ احتمال ہے کہ شاید اس کی مثالی شکل آپ ﷺ کے قریب کر دی گئی ہو جیسے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے جنت اور آگ کو دیکھا۔" روایت بھی ہے کہ اس کی مثال سامنے لائی گئی۔

(۱۱۰) حضرت شریک کی روایت دیگر روایات سے بارہ امور میں مخالف ہے:

① معراج بعثت سے قبل تھی۔ اس کا تفصیلی جواب گزر چکا ہے۔

② یہ معراج عالم نیند میں تھی۔ اس کا جواب بھی گزر چکا ہے۔

③ انبیائے کرام کے مقامات آسمانوں پر تھے۔ یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ انہیں مقامات یاد ہی نہ رہے تھے۔ لیکن امام زہری نے بعض جگہوں میں ان کی موافقت

کی ہے۔

④ سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ ساتویں یا چھٹے آسمان پر ہے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔

⑤ انہوں نے دو نہروں میں بھی مخالفت کی۔ ان سے مراد دریائے نیل اور فرات ہیں۔ ان کا عنصر آسمان دنیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ نہریں ساتویں آسمان میں ہیں۔ یہ سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے ہیں۔

⑥ معراج کے وقت آپ ﷺ کا سینۂ اقدس چاک کیا گیا۔ دوسرے راوی کی روایت بھی ان کی موافقت کرتی ہے۔ اس کی تفصیل بھی گزر چکی ہے۔

⑦ انہوں نے روایت کیا ہے کہ نہر کوثر آسمانِ دنیا پر ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ یہ جنت میں ہے۔

⑧ انہوں نے الدنو المتدلی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ حضرت جبرائیل تھے۔ خطابی نے لکھا ہے کہ اس کتاب (بخاری) میں اس سے عجیب تر اور کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ قریب ہوا۔ پھر وہ اور قریب ہوا حتیٰ کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ان دونوں کے مابین مسافت کی حد بندی کی جائے۔ ہر ایک مکان کی تمیز کی جائے۔ پھر تدلی میں اس چیز کے ساتھ تشبیہ اور تمثیل ہے جسکا تعلق اوپر سے نیچے کی طرف ہو۔ جس تک روایت کا صرف یہ حصہ پہنچا ہے تو اس نے اس قصہ کے نہ تو اول کا اور نہ ہی آخر کا اعتبار کیا ہے۔ اس پر اس کی وجہ سے اور معانی مشتبہ ہو گئے ہیں۔ یا تو اس نے حدیث پاک کا رد کر دیا ہے یا تشبیہ میں گر پڑا ہے۔ یہ دونوں غلطیاں ہیں لیکن جس نے از اول تا آخر حدیث پاک کا اعتبار کیا ہے اس سے یہ اشکال دور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں تصریح ہے کہ یہ خواب تھا کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: "وھو نائم... استیقظ" بعض روایات میں ضرب المثل بیان کی گئی ہے تا کہ انسان اس اعتبار سے حاصل کر سکے جس پر تعبیر کا معنی پھیرنا

لازم ہو۔ بعض خواب تعبیر کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ کی طرح ہوتے ہیں۔
حافظ نے لکھا ہے: ''صحیح مؤقف وہی ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔ اس شخص کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی جس نے یہ کہہ کر ان کی گرفت کی ہے۔ ''صحیح روایت میں ہے کہ انبیائے کرام کے خواب وحی ہوتے ہیں۔ وہ تعبیر کے محتاج نہیں ہوتے۔'' کیونکہ اس نظریہ میں باریک نظری سے کام نہیں لیا گیا۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعض خواب تعبیر قبول کرتے ہیں۔ قمیص کی تعبیر کے بارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی کیا تعبیر فرمائی ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دین۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دودھ کی تعبیر علم سے کی۔ خطابی نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی۔ لیکن ہم دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ معراج عالم بیداری میں تھی۔

خطابی نے اس روایت کے بارے لکھا ہے: ''اس ساری حکایت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے اسے نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے نہ اسے آپ سے نقل کیا ہے۔ نہ ہی آپ کی طرف اضافت کی ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ ساری روایت حضرت انس کی طرف سے ہے۔ جہاں تک شریک کی روایت کا تعلق ہے تو ان کی روایت میں بہت زیادہ تفرد پایا جاتا ہے۔ ان میں ایسے منکر الفاظ ہیں جو دیگر راویوں نے بیان نہیں کیے ہیں۔'' حافظ نے لکھا ہے کہ خطابی نے جو یہ نفی کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا۔ اس کا کوئی اثر نہیں۔ اس میں کم سے کم معاملہ یہ ہے کہ یہ صحابی کی مرسل روایت ہے۔ یا انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہوگی۔ یا اس صحابی سے سنی ہوگی جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہوگی۔ کیونکہ یہ ایسے امور پر مشتمل ہے جسے اپنی طرف سے نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا اس روایت کا حکم مرفوع روایت کی طرح ہوگا۔ اگر اس میں وہ تاثیر ہوتی جس کا تذکرہ خطابی نے کیا ہے تو اس کو مرفوع روایت کا درجہ کوئی نہ دیتا۔ لیکن محدثین کا عمل اس کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ تفصیل مردود ہے۔ خطابی لکھتے ہیں: ''اس روایت

تدلّٰی کی جو نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے وہ تمام سلف، علماء اور اہلِ تفسیر کے موقف کے خلاف ہے۔ اس کے بارے تین اقوال ہیں: (۱) حضرت جبرائیل حضور اکرم ﷺ کے قریب ہوئے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی تدلّٰی فدنا کیونکہ تدلّٰی دنو کا سبب تھا۔ (۲) آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل کو آتے جاتے دیکھا۔ یہ رب تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھا۔ کیونکہ وہ کسی سہارے کے بغیر ہوا میں آجا رہے تھے۔ کسی چیز کو پکڑے ہوئے بھی نہ تھے۔ (۳) حضرت جبرائیل قریب ہوئے تو حضور اکرم ﷺ اس نعمت قرب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ الفاظ حضرت انس سے شریک کی سند کے علاوہ دوسری سند میں تحریر کیے گئے ہیں۔ انہوں نے ان الفاظ کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ یہ الفاظ شریک کے ہیں۔"

حافظ نے لکھا ہے "امام بیہقی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رب تعالیٰ کے فرمان وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ (النجم:۱۳) سے مراد ہے کہ آپ ﷺ کا رب تعالیٰ آپ ﷺ کے قریب ہوا۔ اس روایت کی سند حسن ہے۔ یہ شاہد ہے جس سے شریک کی روایت کو تقویت نصیب ہوتی ہے۔" خطابی نے لکھا ہے: "اس روایت میں ایک اور لفظ بھی ہے جس میں شریک متفرد ہیں کسی اور نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ "علا بِہٖ" ہے۔ یعنی حضرت جبرائیل رب تعالیٰ کے پاس گئے۔ آپ ﷺ نے اپنی جگہ سے ہی عرض کی: "رب خفف عنا" مکان کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حضور اکرم ﷺ کا مقام ہے جس میں آپ ﷺ حضرت جبرائیل امین کے نزول سے قبل جلوہ افروز تھے۔" حافظ نے لکھا ہے کہ یہ اخیر متعین ہے۔ سیاق میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ جگہ کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جو انہوں نے یہ لکھا ہے کہ سلف اور خلف نے اس موقف کی مخالفت کی ہے۔ ہم نے ان کا بھی تذکرہ کر دیا ہے جنہوں نے اس کی موافقت کی ہے۔ امام قرطبی نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا: "اللہ تعالیٰ قریب ہوا۔" امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس کا

امر اور حکم قریب ہوا۔ تدلّی کا اصل معنی ہے کسی چیز کی طرف نزول حتیٰ کہ وہ اس کے قریب ہو جائے۔" ایک قول یہ بھی ہے کہ رفرف حضور اکرم ﷺ کے قریب ہوا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ اس پر جلوہ افروز ہو گئے۔ پھر حضور اکرم ﷺ اپنے رب تعالیٰ کے قریب ہو گئے۔ علماء نے یہ اشکال کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ قاضی نے لکھا ہے: "اللہ کی طرف اور یا اس کی طرف سے یہ دنو یا قرب سے مراد قرب مکانی نہیں جو کسی حد پر ختم ہوتا ہو۔ حضور ﷺ کا اپنے رب تعالیٰ کے قریب ہونے سے مراد آپ ﷺ کی عظیم منزلت کی تعظیم آپ ﷺ کی شانِ والا کی تکریم اور اس نعمتِ کبریٰ کا اظہار ہے جو آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو عطا نہ کی گئی۔ اس سے مراد معرفت کے انوار کا چمکنا اور غیب اور قدرت کے اسرار کا مشاہدہ کرنا تھا۔ جیسے کہ حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہما نے لکھا ہے: "رب تعالیٰ کی طرف سے دنو کی کوئی حد نہیں۔ فہم یا وہم جس تک پہنچ سکے۔ اس دنو کے بارے کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حضرت جبرائیل کو دنو سے کیسے روک دیا گیا۔ حضور اکرم ﷺ اس معرفت اور ایمان کے قریب ہوئے جو آپ ﷺ کے قلب انور میں ڈالا گیا تھا۔ آپ ﷺ اپنے سکون قلب کے ساتھ حریمِ ناز کے قریب ہوئے۔ سارا شک و شبہ ختم ہو گیا۔ یہ قرب حریمِ ناز سے بخشا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی بارگاہ سے انعام، اکرام اور شرف و قدر کے عطیات حاصل کیے۔ رب تعالیٰ نے آپ ﷺ کی امیدوں کو کامیاب فرمایا۔ آپ معرفت اور ایمان کے اعتبار سے سارے لوگوں سے زیادہ ثابت تھے۔ آپ ﷺ کا قلب انور سب سے زیادہ پرسکون تھا۔ رب تعالیٰ کا قرب یا اس کی طرف سے قرب سے مراد یہ ہے کہ اس نے آپ ﷺ پر بہت زیادہ انعامات و اکرام کیے۔ آپ ﷺ سے آوازوں کو روک کر آپ ﷺ کی وحشت کو دور کیا۔ آپ ﷺ پر عظیم نعمتیں فرما کر آپ ﷺ کو اکرام سے نوازا۔ رب تعالیٰ کے دنو کی تاویل وہی کی جا سکتی ہے جو آپ ﷺ کے اس فرمان کی تاویل ہے "ہمارا رب ہر رات آسمان دنیا پر تشریف فرما ہوتا ہے۔ جب کہ رات کا آخری ثلث باقی رہ جاتا ہے۔" اس کی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا یہ

نزول فضل وکرم، قبول توبہ اور احسان ومعرفت کے ساتھ ہوتا ہے۔" واسطی لکھتے ہیں:
"جس نے یہ گمان کیا ہے کہ وہ بذاتِ خود قریب ہوا اس نے وہاں مسافت بنادی۔ لیکن وہاں مسافت محال ہے کیونکہ جب انسان اس کے قریب ہوتا ہے تو وہ اس سے اتنا ہی دور چلا جاتا ہے۔ یعنی وہ جس قدر اس کے قریب ہوتا ہے وہ دوری میں ہو جاتا ہے۔
یا تو یہ قرب و بعد کی نفی سے کنایہ ہے یا اس کی حقیقت کے ادراک کی نفی سے کنایہ ہے۔ یا اس حقیقت کے ادراک کے لیے ہے کہ کوئی اس کا ادراک نہیں کرسکتا۔ حق کے لیے کوئی قرب و بعد نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دونوں اس ذات کے لیے محال ہیں۔ جہاں تک رب تعالیٰ کے اس فرمان "فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ" کا تعلق ہے تو یہ اس کے کمال علم کی تمثیل ہے۔ وہ قرب سے بلند و برتر ہے۔ دنو کے بارے وہی تاویل کی جاسکتی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان میں کی جاتی ہے جسے امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے:"جو ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے میں ایک ذراع اس کے قریب ہو جاتا ہوں۔" یہ ایک تمثیل ہے جو معنی کے افہام کے قریب کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ یعنی جو میری اطاعت کے قریب ہوتا ہے تو اس کو اس کا کئی گنا اجر دیتا ہے۔"جو چل کر میرے پاس آتا ہے میں بھاگ کر اس کی طرف آتا ہوں۔" یعنی اسے جزاء دینے میں پہل کرتا ہوں۔" وہ اجابت اور قبول کے لحاظ سے سب سے قریب ہے۔ وہ احسان کرنے اور امید پورا کرنے اور دگنا ثواب عطا کرنے کے لحاظ سے قریب ہے۔ اسے از روئے مشاکلہ قریب کہا گیا ہے۔

⑨ یہ صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ پانچویں بار تخفیف کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور نہ گئے جبکہ حضرت ثابت کی روایت کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ ساتویں بار کے بعد تخفیف کے لیے حریمِ ناز میں نہ گئے۔

⑩ فعلا بہ الجبار۔ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

⑪ پانچویں بار رجوع کے بعد مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے آپ ﷺ کو واپس جانے کے لیے کہا تاکہ مزید تخفیف ہو جائے مگر آپ ﷺ واپس نہ گئے۔

۱۲ بعض روایات میں طشت میں ''تور'' کا اضافہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس سونے کا ایک طشت لایا گیا۔ جس میں سونے کا ''تور'' تھا۔ شاید اس سے مراد چھوٹا ٹرے ہو جو بڑے ٹرے میں شامل ہو۔ تاکہ اس سے کچھ بکھرنے نہ پائے۔ جو گرے وہ بڑے ٹرے میں گرے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور حضرت شریک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ فرشتوں نے آپ ﷺ کے قلب انور کو آبِ زمزم سے دھویا۔ یہ احتمال ہے کہ ایک طشت میں آبِ زمزم اور دوسرا ایمان سے بھرا ہوا ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ تور پانی اور ایمان کے لیے برتن ہو۔ اور ٹرے اس لیے ہو تاکہ غسل کے وقت اس میں موجود چیزیں نیچے نہ گریں۔ وہ ٹرے پر ہی رہیں۔ الحمد للہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین صاحب البراق والمعراج و قاب قوسین او ادنٰی و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

نماز کیسے فرض ہوئی

امام شافعی، امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، طحاوی، بیہقی، امام نسائی، دارقطنی اور حاکم نے حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت انس، حضرت ابن عمر، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''حضرت جبرائیل امین نے بیت اللہ کے پاس مجھے امامت کرائی۔ دوسری روایت میں ہے: ''بیت اللہ کے دروازے کے پاس انہوں نے مجھے دو بار امامت کرائی۔ مجھے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سورج زائل ہو چکا تھا۔ وہ تسمہ کی مقدار کے برابر ڈھل چکا تھا۔ مجھے عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہو چکا تھا۔ مجھے نمازِ مغرب اس وقت پڑھائی جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے۔ مجھے عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب شفق غائب ہو گیا مجھے فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے روز مجھے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کسی چیز کا سایہ اس کی مثل ہو چکا تھا۔ دوسری روایت میں ہے ''جیسے کہ کل عصر کا وقت تھا۔'' پھر مجھے نمازِ عصر اس وقت پڑھائی۔ جب چیز کا سایہ اس کے دو مثل تھا۔

مجھے مغرب اس وقت پڑھائی جب روزہ افطار کرتا ہے اور مجھے عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب رات کا پہلا ثلث گزر چکا تھا۔ مجھے نمازِ فجر اس وقت پڑھائی جب صبح خوب روشن ہو چکی تھی۔ پھر انہوں نے میری طرف توجہ کر کے کہا: ''اے محمد عربی (جانِ عالم) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ آپ سے پہلے انبیاء (کی نمازوں) کا وقت تھا۔ ان دو اوقات کے مابین نمازوں کا وقت ہے۔'' میں اسی طرح آگاہ ہوا ہوں کہ حضرت جبرائیل امین نے آپ کو پانچ نمازیں اسی طرح پڑھائی تھیں۔ نمازوں کی رکعتوں کے بارے بعض علماء کا خیال ہے کہ پہلے دو دو رکعتیں فرض کی گئیں تھیں۔ پھر حضر کی نماز میں دو دو کا اضافہ کر کے انہیں چار چار رکعتیں بنا دیا گیا سوائے نماز مغرب کے۔ جبکہ سفر کی نماز میں دو رکعتیں برقرار رکھی گئیں۔ امام شعبی، ابن اسحاق اور میمون بن مہران نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ جبکہ دیگر علماء کرام کا خیال ہے کہ مغرب کی نماز کے علاوہ دیگر نمازوں میں پہلے ہی چار چار رکعتیں فرض کی گئیں تھیں۔ جبکہ صبح کی دو رکعتیں فرض ہوئیں تھیں۔ یہ حسن، نافع، جبیر بن مطعم اور ابن جریر کا موقف ہے۔ بعض علماء کا نظریہ یہ ہے کہ حضر میں چار چار اور سفر میں دو دو رکعتیں فرض کی گئیں یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ان سارے اقوال کے دلائل مطولات میں مذکور ہیں۔

امام بخاری، امام مسلم، ابن اسحاق نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلے دو دو رکعتیں فرض ہوئیں پھر حضر میں انہیں چار چار کر دیا گیا اور سفر میں پہلی دو رکعتوں کو برقرار رکھا گیا۔

تنبیہات

1. نماز کے اوقات کے بارے بعض علماء نے عند البیت اور بعض نے عند بیت الباب کا ذکر کیا ہے یہ امام شافعی، طحاوی اور امام بیہقی کی روایت ہے۔
2. سابقہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتداء ظہر کی نماز سے ہوئی تھی لیکن امام مسلم وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز فرض کی گئی تو حضرت جبرائیل امین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو نماز صبح اس وقت پڑھائی جب فجر طلوع ہو چکی تھی...... اسی طرح امام نسائی نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ حضرت جبرائیل ہیں جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ صبح اس وقت پڑھی جب فجر طلوع ہو چکی تھی۔

◆ ابوعمر نے لکھا ہے ''حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کی یہ گذارش کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل انبیاء کرام علیہم السلام کی نمازوں کے اوقات ہیں۔'' یہ صرف اس روایت میں ہے جسے حضرت ابن عباس نے روایت کیا ہے۔ قاضی ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: ''اس کے ظاہر سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ نمازیں انہی اوقات میں سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام پر فرض تھیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے: ''یہ آپ کے لیے مشروع وقت ہے۔ یعنی وہ وقت جو ان دونوں حدود کے مابین ہے یہ اول و آخر وقت ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے انبیاء کرام علیہ السلام کا وقت ہے۔ ان کی نماز بھی اسی طرح دو اوقات کے مابین تھی۔ ورنہ یہ نمازیں ان اوقات میں فرض ہونا صرف اس امت کی خصوصیت ہے دیگر امم پر بعض نمازیں فرض تھیں۔ ابوداؤد نے عشاء کی روایت میں لکھا ہے: ''اس نماز کا اہتمام کیا کرو۔ اس نماز کے ذریعے تمہیں دیگر ساری اقوام پر فضیلت دی گئی ہے۔ تم میں سے پہلے کسی امت نے یہ نماز نہیں پڑھی۔'' ابوالفتح نے لکھا ہے: ''اس سے ان کے لیے وقت کی وسعت سے مراد ہے کہ یہ اس وقت کا اول اور آخر ہے۔ ورنہ اوقات بعینہا وہی ہیں۔

◆ بعض علماء نے ''عند البیت'' سے ایک اشکال ظاہر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت سے قبل بیت المقدس کی طرف منہ کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ کو اپنے اور بیت المقدس کے مابین رکھتے ہوں۔ اسی طرح ''عند الباب'' میں بھی کوئی اشکال نہیں کیونکہ بیت اللہ کے دروازے کے پاس نماز پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز اس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہو۔

◆ ابن منیر نے لکھا ہے ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ حضور انور

ﷺ کو نماز سکھائیں تو یہ نماز ان پر فرض تھی۔ کیونکہ انہیں اس کا حکم دیا گیا تھا۔ حضور پاک ﷺ کی یہ نماز مفترض کے پیچھے مفترض کی نماز تھی۔

◆ حربی نے لکھا ہے: ''جو پہلے آپ ﷺ پر نماز فرض کی گئی وہ دن کے وقت دو رکعتیں اور رات کے وقت دو رکعتیں تھیں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''آپ ﷺ پر دو دو رکعتیں نماز فرض ہوئی۔ پھر حضر میں اضافہ کر دیا گیا۔''

ابو عمر نے لکھا ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی روایت میں حربی کے موقف کی کوئی دلیل نہیں نہ ہی اس کے بارے کوئی صحیح اثر مروی ہے۔ بلکہ اس میں یہ دلیل ہے کہ دو دو رکعتیں جو نماز فرض ہوئی تھی وہ پانچ نمازیں تھیں کیونکہ ''الصلاۃ'' میں الف لام سے معہود کی طرف اشارہ ہے۔''

الحافظ نے لکھا ہے: ''جو بات ظاہر ہے اور جسے دلائل ظاہر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ شبِ معراج دو دو رکعتیں نماز فرض کی گئی سوائے مغرب کے۔ پھر ہجرت کے بعد ان میں اضافہ کر دیا گیا سوائے صبح کی نماز کے۔'' جیسے ابن خزیمہ، ابن حبان اور امام بیہقی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ سفر و حضر میں دو دو رکعتیں فرض کی گئیں۔ حضور اکرم ﷺ مدینہ طیبہ جلوہ افروز ہوئے اور پرسکون ہو گئے تو حضر کی نماز میں دو دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ فجر کی نماز کی طویل قرأت کی وجہ سے اس کی دو رکعتیں ہی رکھی گئیں اور نماز مغرب کی تین رکعتیں رکھی گئیں کیونکہ وہ وتر ہے۔

پھر سفر میں چار رکعتوں والی نماز میں تخفیف کر دی گئی اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی تھی:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿١٠١﴾ (النساء:١٠١)

ترجمہ: ''اور جب تم سفر کرو زمین میں تو نہیں تم پر کچھ حرج اگر تم قصر کرو نماز میں اگر ڈرو تم اس بات سے کہ تکلیف پہنچائیں گے تمہیں کافر بے شک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں۔''

جو کچھ ابن اثیر نے مسندِ شافعی کی شرح میں لکھا ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال ربیع الاول کے ماہ مبارک میں نماز قصر فرض کی گئی۔ کیونکہ آیۃ الخوف اسی میں اتری تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ہجرت کے پہلے سال ربیع الاول میں فرض ہوئی۔ امام دولابی اور امام سہیلی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ہجرت سے چالیس روز بعد نماز قصر فرض ہوئی۔ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کے فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ تخفیف کے اعتبار سے نماز سفر کو برقرار رکھا گیا کیونکہ وہ اس وقت سے برقرار رہے جب سے اسے فرض کیا گیا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قصر عزیمت ہے۔

◆ امام سہیلی نے لکھا ہے کہ نماز میں یہ اضافہ نسخ ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب دیا جائے گا کہ دو یا ایک رکعت کا اضافہ حتیٰ کہ وہ ایک مکمل نماز بن جائے یہ نسخ ہے۔ کیونکہ نسخ کا معنی ہے حکم اٹھا دینا۔ دو رکعتوں کے اجزاء کا حکم اٹھ گیا جس نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا وہ نماز کو فاسد کرنے والا ہوگا۔ اگر وہ سلام پھیرنے کے بعد نماز پڑھنا چاہے گا تو اس کے لیے جائز نہ ہوگا۔ الا یہ کہ وہ نماز کو ازسرِ نو شروع کرے۔ نسخ سے اجزاء کا حکم اٹھ گیا۔ نماز کی تعداد میں اضافہ کہ پہلے دو تھیں پھر پانچ ہوگئیں۔ امام ابوحنیفہ نے اسے بھی نسخ کہا ہے۔ یہ زیادتی ان کے نزدیک نسخ ہے۔ لیکن جمہور متکلمین نے اسے نسخ نہیں کہا۔ لیکن یہاں اس تفصیل کی جگہ نہیں ہے۔

❀❀❀❀

معراجِ مصطفیٰ

علیہ التحیۃ والثناء

مصنف

امام محمد بن یوسف الصالحی الشامی رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر ذوالفقار علی ساقی

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف

زاویہ پبلشرز

زاویہ پبلشرز

دربار مارکیٹ، لاہور